غالب کا سفرِ کلکتہ
اور
کلکتے کا ادبی معرکہ

خلیق انجم

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

ختم نبوت ﷺ زندہ باد　　　　　　　　　　　　　　　　عظمت صحابہ زندہ باد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

معزز ممبران: آپ کا وٹس ایپ گروپ ایڈمن "**اردو بکس**" آپ سے مخاطب ہے۔

آپ تمام ممبران سے گزارش ہے کہ:

- گروپ میں صرف PDF کتب پوسٹ کی جاتی ہیں لہذا کتب کے متعلق اپنے کمنٹس / ریویوز ضرور دیں۔ گروپ میں بغیر ایڈمن کی اجازت کے کسی بھی قسم کی (اسلامی وغیر اسلامی، اخلاقی، تحریری) پوسٹ کرنا سختی سے منع ہے۔
- گروپ میں معزز، پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے ممبرز موجود ہیں اخلاقیات کی پابندی کریں اور گروپ رولز کو فالو کریں بصورت دیگر معزز ممبرز کی بہتری کی خاطر ریموو کر دیا جائے گا۔
- کوئی بھی ممبر کسی بھی ممبر کو انباکس میں میسیج، مس کال، کال نہیں کرے گا۔ رپورٹ پر فوری ریموو کر کے کاروائی عمل میں لائی جائے گی۔
- ہمارے کسی بھی گروپ میں سیاسی و فرقہ واریت کی بحث کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔
- اگر کسی کو بھی گروپ کے متعلق کسی قسم کی شکایت یا تجویز کی صورت میں ایڈمن سے رابطہ کیجئے۔
- سب سے اہم بات:

گروپ میں کسی بھی قادیانی، مرزائی، احمدی، گستاخِ رسول، گستاخِ امہات المؤمنین، گستاخِ صحابہ و خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسنین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، گستاخ اہلبیت یا ایسے غیر مسلم جو اسلام اور پاکستان کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف ہیں یا ان کے روحانی وذہنی سپورٹرز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا ایسے اشخاص بالکل بھی گروپ جوائن کرنے کی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہونے پر فوراً ریموو کر دیا جائے گا۔

- تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش / ڈاؤنلوڈ کر کے **فری آف کاسٹ** وٹس ایپ گروپ میں شیئر کی جاتی ہیں۔ جو کتاب نہیں ملتی اس کے لئے معذرت کر لی جاتی ہے۔ جس میں محنت بھی صَرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔
- عمران سیریز کے شوقین کیلئے علیحدہ سے عمران سیریز گروپ موجود ہے۔
- **لیڈیز کے لئے الگ گروپ کی سہولت موجود ہے جس کے لئے ویریفکیشن ضروری ہے۔**
- اردو کتب / عمران سیریز یا سٹڈی گروپ میں ایڈ ہونے کے لئے ایڈمن سے وٹس ایپ پر بذریعہ میسیج رابطہ کریں اور جواب کا انتظار فرمائیں۔ برائے مہربانی اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے موبائل پر کال یا ایم ایس کرنے کی کوشش ہر گز نہ کریں۔ ورنہ گروپس سے تو ریموو کیا ہی جائے گا بلاک بھی کیا جائے گا۔

نوٹ: ہمارے کسی گروپ کی کوئی فیس نہیں ہے۔ سب فی سبیل اللہ ہے

0306-7163117　　0343-7008883　　0333-8033313

محمد سلمان سلیم　　پاکستان زندہ باد　　راؤ ایاز

پاکستان زندہ باد　　　　　　　　　　　　پاکستان پائندہ باد

اللہ تبارک تعالیٰ ہم سب کا حامی وناصر ہو

غالبؔ کا سفرِ کلکتہ

اور

کلکتے کا ادبی معرکہ

غالب کا سفرِ کلکتہ

اور

کلکتے کا ادبی معرکہ

خلیق انجم

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

(© جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ)

GHALIB KA SAFAR-E-KALKATTA

AUR

KALKATTEY KA ADABI MAREKA

BY :

KHALIQ ANJUM

اہتمام : شاہد ماہلی

کمپوزنگ : عارفہ خانم

اشاعت : ۲۰۰۵ء

قیمت : ۳۰۰/روپے

مطبوعہ : اصیلا آفسٹ پریس، دہلی

(۶)

غالب انسٹی ٹیوٹ،

ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی ـ ۲

www.ghalibinstitute.com-- email: ghalib@vsnl.net

ماہرینِ غالب

مولانا الطاف حسین حالیؔ

پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیبؔ

قاضی عبدالودود

مالک رام

مولانا امتیاز علی خاں عرشیؔ

مولانا غلام رسول مہرؔ

شیخ اکرام

اور

پروفیسر نذیر احمد کے نام

جن کی ادبی کاوشوں نے غالبیات کی راہوں میں چراغ روشن کیے اور جن کی وجہ سے میرے لیے یہ کتاب لکھنا ممکن ہو سکا۔

فہرست

تعلیقات

حرفِ آغاز

غالبؔ اُنیسویں صدی ہی کے نہیں آنے والے زمانوں کے بھی عظیم شاعر ہیں۔ یہی نہیں وہ ہندستان کی تمام زبانوں میں اپنے عہد کے سب سے عظیم شاعر بھی ہیں۔ اگرچہ غالب فارسی کے بھی بلند مرتبہ شاعر تھے لیکن ہندنژاد ہونے کی وجہ سے انھیں ایران اور ہندستان کے فارسی دانوں میں وہ مقام حاصل نہیں ہوسکا جس کے وہ یقیناً مستحق ہیں۔

اردو شاعری میں غالبؔ جیسی شہرت اور مقبولیت اُن کے بعد صرف علامہ اقبالؔ ہی کو نصیب ہوئی۔

غالبؔ کو اپنی زندگی میں تین ادبی معرکے پیش آئے۔ پہلا معرکہ کلکتے میں پنشن کے سلسلے میں حامیانِ قتیلؔ کے ساتھ ہوا، دوسرا ذوقؔ کے ساتھ دہلی میں اور تیسرا 'قاطعِ برہان' کا معرکہ۔ زیرِ نظر کتاب کا تعلق کلکتے میں ہونے والے ادبی معرکے سے ہے۔

غالبؔ اپنی پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں جب کلکتے پہنچے تو بادشاہِ دہلی اکبر شاہ ثانی کے وکیل مرزا افضل بیگ پہلے ہی سے وہاں موجود تھے۔ پنشن کے سلسلے میں یہ غالب کے مخالف تھے۔ مخالفت کی وجہ اس کتاب میں تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔ مرزا افضل بیگ نے کلکتے کے شاعروں اور ادیبوں میں یہ مشہور کردیا کہ غالبؔ قتیلؔ کے علمی مرتبے کو بالکل نہیں گردانتے اور ان پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور کلکتے کے شاعروں کو کسی شمار میں نہیں لاتے۔ اس سازش کا نتیجہ یہ ہوا کہ کلکتے کے بیشتر شاعر اور اہلِ علم غالبؔ کے مخالف ہوگئے۔

مرزا افضل بیگ کا ایسٹ انڈیا کمپنی میں بہت رسوخ تھا۔ اُنھوں نے کمپنی میں غالبؔ کے خلاف یہ شکایت کی کہ وہ اپنے دو نام رکھتے ہیں ایک اسد اور دوسرا غالب، اور موقع ومحل کے اعتبار سے ان ناموں کا ذاتی فائدے کے لیے الگ الگ استعمال کرتے ہیں۔ غالبؔ کے خلاف سنیوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی گئی کہ غالب کٹر رافضی ہیں۔ دوسری طرف شیعوں کو بتایا گیا کہ غالب صوفی یا ملحد ہیں۔ غالب نے جب ان حملوں کا کامیابی سے مقابلہ کیا تو اُن کے خلاف سازش کا ایک اور زبردست جال بچھایا گیا۔ ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا جس میں غالب نے اردو اور فارسی کی دو غزلیں پڑھیں جو بہت پسند کی گئیں۔ بقولِ

غالبؔ ''خدا نے اُن کے حال پر بڑا کرم کیا۔''اس مشاعرے میں آئندہ کے لیے ایک اور مشاعرہ طے کیا گیا جس میں اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے طرحی مصرعے دیے گئے۔ غالب نے اس مشاعرے میں دونوں مصرعوں پر غزلیں پڑھیں۔ اُنھوں نے فارسی کی جو غزل پڑھی، اُس کا ایک شعر تھا۔

جزوے از عالمم و از ہمہ عالم بیشم

ہمچو مُوے کہ بتاں را ز میاں برخیزد

غالبؔ کے مخالفین نے جو مرزا افضل بیگ کے ورغلانے پر پہلے ہی سے ہنگامہ آرائی کے درپے تھے۔ اس شعر پر چار اعتراضات کیے۔ پہلا اعتراض تھا کہ 'ہمہ عالم' کی ترکیب غلط ہے کیوں کہ 'عالَم' کلمۂ مفرد ہے اور 'ہمہ' جمع ہے، اس لیے ان الفاظ کو ملا کر ترکیب بنانا درست نہیں۔ مخالفین کا یہ بھی کہنا تھا کہ قتیلؔ نے اپنی تصنیفات 'چہار شربت' اور 'نہر الفصاحت' میں اس ترکیب کی نشان دہی نہیں کی ہے، اس لیے یہ ترکیب قابلِ قبول نہیں ہے۔ دوسرا اعتراض 'بیشم' پر یہ کیا گیا کہ 'بیش' کا استعمال 'تر' کے لاحقے کے بغیر خلافِ قاعدہ ہے۔ 'بیش' کے بجائے 'بیش تر' استعمال ہونا چاہیے۔ تیسرا اعتراض 'برخیزد' پر تھا کہ اس کی جگہ لفظِ 'رُوید' کا استعمال ہونا چاہیے اور چوتھا اعتراض تھا کہ فارسی شاعروں نے 'کمر' کے ساتھ 'مو' کو 'روستن' کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ 'میان' کے ساتھ نہیں۔

غالبؔ کی دوسری غزل کا ایک شعر تھا۔

شورِ اشکے بہ فشارِ بُنِ مژگاں دارم

طعنہ بر بے سروسامانیِ طوفاں زدۂ

اس شعر پر اعتراض کیا گیا کہ 'طوفاں زدۂ' میں کسرے کو مضاف کی ضرورت ہے۔ 'زدہ' کو حالتِ مفعولی کے علاوہ کبھی استعمال نہیں کیا جاتا۔ غالب نے اساتذہ کے کلام سے سندیں پیش کرتے ہوئے ان اعتراضات کے معقول جواب دیے لیکن شورش پر درپے مخالفین پر ان جوابات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

ادبی سطح پر مخالفین کے اعتراضات میں کوئی جان نہیں تھی۔ اُن کا اصل مقصد ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسران کی نظر میں غالبؔ کو ذلیل کرنا اور کم علم ثابت کرنا تھا تا کہ پینشن کے معاملے

میں غالبؔ پر منفی اثرات مرتب ہوسکیں۔اس لیے ان اعتراضات پر غالبؔ کا کوئی جواب نہیں سنا گیا۔تیسرے مشاعرے کے بعد جب بیشتر لوگ محفلِ مشاعرہ سے اُٹھ کر چلے گئے اور وہاں کچھ سامعین اور غالبؔ رہ گئے تو یہ سامعین شورہ پشتی پر اُتر آئے۔اُنھوں نے بقولِ غالبؔ:

''شور مچانا شروع کیا اور میرے خلاف ہنگامے پر اُتر آئے۔اسی میں ہی انھیں اپنی برتری نظر آئی۔''[1]

غنڈہ گردی اور شہد پن پر آمادہ ان لوگوں نے غالبؔ کی یہ حالت کردی کہ جب وہ بازار میں نکلتے تو لوگ ان پر آوازیں کستے۔اس ذلت و رسوائی کی وجہ سے اردو اور فارسی کا یہ عظیم شاعر نفسیاتی مرض میں مبتلا ہوگیا۔غالبؔ نے باندے کے اپنے ایک دوست اور بزرگ نواب محمد علی خاں کو کئی خطوط میں سفیرِ ہرات سے منسوب اپنے بارے میں ایسے تعریفی اور توصیفی کلمات لکھے جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا اور جو صرف غالبؔ کے دماغ کی اختراع تھے۔اس کی تفصیل زیرِ نظر کتاب میں ''سفیرِ ہرات' کے زیرِ عنوان ایک باب میں بیان کی گئی ہے۔

اس معرکے نے غالبؔ کے ذہن میں ایک نفسیاتی خلفشار یہ برپا کیا کہ اُنھوں نے اپنے اور امیر خسرو کے علاوہ ہندستان کے تمام فارسی شاعروں اور فرہنگ نویسوں کو غیر مستند قرار دے دیا اور اُن کا مضحکہ اُڑانا شروع کردیا۔یہی نہیں بلکہ بعض فارسی شاعروں اور فرہنگ نویسوں کی شان میں فحش کلمات بھی استعمال کرنے لگے۔غالبؔ نے اپنی فارسی دانی کے بارے میں ایسے دعوے کرنے شروع کیے،جو اُن سے پہلے غالباً کسی اور ہندستانی فارسی داں نے نہیں کیے تھے۔اُنھوں نے سفیرِ ہرات سے منسوب کرکے اپنے بارے میں لکھا کہ'' زبان کے معاملے میں ہندستان میں غالب کا مقابلہ کون کرسکتا ہے۔قطعِ نظر شعر و شاعری کے،غالب تو فارسی کے عالم ہیں۔'' یہی چھوٹا سا فقرہ ساری زندگی غالبؔ کے لیے ایک مسئلہ بنا رہا۔وہ اس معاملے میں امیر خسرو کا ذکر بھی بس مصلحتاً ہی کرتے تھے ورنہ انھیں یقین ہوگیا تھا کہ وہ ہندستان کے عظیم ترین فارسی داں ہیں۔

قاضی عبدالودود نے غالبؔ کی ذہنی پیچیدگی کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

''غالبؔ جب یہ کہتے ہیں کہ میں اپنا شمار اہلِ زبان میں نہیں کرتا تو اس سے اُن کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میری مادری زبان فارسی نہیں اور جب یہ فرماتے ہیں کہ میں پارسی زباں ہوں تو اُن کی مراد یہ ہوتی ہے کہ فارسی سے اپنی طبعی مناسبت اور تتبعِ کلامِ اساتذہ میں کسی ایرانی سے کم نہیں۔''[2]

غالبؔ کا دوسرا ادبی معرکہ دلّی میں شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ سے ہوا۔ غالبؔ نے نام لیے بغیر ذوقؔ کو مخاطب کرتے ہوئے اُنیس اشعار کا ایک فارسی قطعہ کہا تھا۔ قطعے کے اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذوقؔ نے بہادر شاہ ظفرؔ سے کہا تھا کہ پُرگوئی میں غالبؔ میرا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ غالب کو جب اس کی اطلاع ملی تو اُنھوں نے جو قطعہ کہا۔ اس میں یہ اشعار بھی تھے۔

اے کہ در بزمِ شہنشاہِ سخن رس گفتۂ
کے بہ پُرگوئی فلاں ، در شعر ہم سنگِ منست
راست گفتی، لیک میدانی کہ نبود جاے طعن
کمتراز بانگِ دہل گر نغمۂ چنگِ منست
فارسی بیں، تا بہ بینی نقشہاے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگِ منست

قطعے کا مقطع ہے:

مقطعِ ایں قطعہ زیں مصرع مصرع باد وبس
ہر چہ در گفتار فخر تست، آں ننگِ منست

یہ تو ممکن نہیں کہ بہادر شاہ ظفرؔ کی نظر سے یہ قطعہؔ نہ گزرا ہوا لیکن اُنھوں نے درگزر کر دیا۔ ۱۸۵۲ء میں جب زینت محل کی فرمائش پر غالبؔ نے جوان بخت کا سہرا لکھا تو غالب نے اس کے مقطعے میں کہا:

ہم سخن فہم ہیں ، غالبؔ کے طرف دار نہیں
دیکھیں، اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا

بقول محمد حسین آزادؔ چوں کہ مقطعے میں بادشاہِ کے استاد پر چوٹ کی گئ تھی، اس لیے بقول آزادؔ ظفر نے فرمائش کر کے ذوقؔ سے سہرا کہلوایا۔ ذوقؔ نے سہرا کہا، جس کا مقطع تھا:

جن کو دعویٰ ہے سخن کا ، یہ سنا دو اُن کو
دیکھو، اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

غالبؔ مقطع سن کر سمجھ گئے کہ مقطعے کے مخاطب غالب ہی ہیں۔ کہیں سے غالبؔ کو یہ علم بھی ہوگیا کہ مقطع ظفؔر کے اشارے پر کہا گیا ہے، جس کا مطلب ہے کہ ظفؔر کو غالب کے سہرے کا مقطع ناگوار گزرا، اُنھوں نے بارہ شعر کی ایک غزل کہہ کر ظفر سے معافی مانگی۔'' [۳]

تیسرا معرکہ' قاطع برہان' کا تھا جو ہندستانی فارسی شاعروں، ادیبوں اور محققوں کا سب سے بڑا ادبی معرکہ تھا۔ اس معرکے میں غالبؔ، ان کے حامیوں اور مخالفوں کی طرف سے کئی کتابیں شائع ہوئیں۔ ان ہی میں ایک کتاب' قاطعِ قاطع' تھی جس کے مصنف مولوی امین الدین تھے۔ امین الدین نے غالب کے لیے بہت فحش اور ناشائستہ الفاظ استعمال کیے تھے۔ اس لیے غالب نے ۲رد سمبر ۱۸۶۷ء کو عرضی دعوی داخلِ عدالت کردیا۔ اس مقدمے میں کامیابی کی اُمید نہیں رہی تو غالب ۲۳؍ مارچ ۱۸۶۸ء کو مقدمہ واپس لینے پر مجبور ہوگئے۔ دوسرے لفظوں میں یہ بھی ایک طرح سے غالبؔ کی شکست تھی۔ کسی بھی ادبی معرکے پر اتنا نہیں لکھا گیا جتنا کہ اس معرکے پر لکھا گیا۔ غالب کے عہد سے اب تک ہمارے محققین اس موضوع پر مسلسل مضامین اور کتابیں لکھتے آرہے ہیں۔

ایک زمانہ تھا جب میرے عزیز دوست پروفیسر نثار احمد فاروقی دلّی یونی ورسٹی کی لائبریری کے شعبۂ اردو، فارسی اور عربی کے ذخیرۂ کتب کے انچارج کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ میں ان دنوں پی ایچ ڈی کے لیے مرزا مظہر جانجاناں پر تحقیقی مقالہ لکھ رہا تھا اس لیے میرا بھی دن کا بیشتر حصّہ دلّی یونی ورسٹی کی لائبریری میں گزرتا تھا۔ نثار صاحب سے میری دوستی اس حد تک تھی کہ میں دن میں تین چار دفعہ اُن کی میز پر جاتا۔ لائبریری کے برابر ہی میں ایک ریستوراں تھا۔ دن میں دو ایک دفعہ ہم لوگ چائے پینے اس ریستوراں میں جاتے۔ ایک دفعہ میں نثار صاحب کے پاس گیا تو بڑے انہماک سے کوئی پرانا رسالہ پڑھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر اُنھوں نے وہ رسالہ مجھے دیتے ہوئے کہا کہ لو غالب کا ایک ایسا خط پڑھو جو تم نے پہلے کبھی نہیں پڑھا ہوگا۔ رسالہ دے کر وہ اپنے کام میں لگ گئے۔ میں ابھی پورا خط پڑھ بھی نہ پایا تھا کہ نثار صاحب کہنے لگے بڑی تعداد میں غالب کے خطوط رسالوں میں بکھرے ہوئے ہیں، انھیں مرتب کرکے کتابی صورت میں کیوں نہیں شائع کردیتے؟ نثار صاحب کا یہ فقرہ ہی غالب سے میری تحقیقی دل چسپی کا آغاز بنا۔ مجھے یہ تجویز بہت پسند آئی۔ اُسی دن سے میں نے کام شروع کردیا۔ غالب کے خطوط تلاش کرنے میں نثار صاحب نے میری بہت مدد کی۔ پانچ چھ مہینے میں کتابی شکل میں خطوط مرتب ہوگئے۔ یہ کتاب دہلی کے مکتبہ شاہراہ سے' غالب کی نادر تحریریں' کے نام سے شائع ہوئی۔ خطوط کی تلاش کے دوران غالب سے میری دل چسپی بڑھتی

گئی۔ ۱۹۷۴ء میں مکتبہ جامعہ دہلی سے غالب پر میری ایک اور کتاب 'غالب اور شاہانِ تیموریہ' شائع ہوئی۔ میں نے اس دوران غالب کے تمام اردو خطوط مرتب کرنے کا پروگرام بنالیا۔ غالب کے خطوط کی تلاش کے لیے بے شمار قدیم اور جدید رسالے کھنگال ڈالے اور 'غالب کے خطوط' کے نام سے پانچ جلدوں میں غالب کے تمام خطوط مرتب کر دیے جو 'غالب کے خطوط' کے نام سے غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی سے شائع ہوئے۔ اس اڈیشن میں وہ خطوط تو شامل تھے ہی جو غالب کے خطوط کے مختلف مجموعوں میں شامل تھے، ان کے علاوہ بڑی تعداد میں ایسے بھی خطوط تھے جو غیر مدوّن تھے یعنی وہ خطوط کسی مجموعے میں شامل نہیں تھے۔ 'غالب کے خطوط' کے کئی اڈیشن ہندوستان میں غالب انسٹی ٹیوٹ سے اور پاکستان میں انجمن ترقی اردو (پاکستان) سے شائع ہو چکے ہیں اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

اس کام میں مجھے میرے دوستوں سے بہت مدد ملی، جن کا شکریہ میں 'غالب کے خطوط' میں کر چکا ہوں۔

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی میں ہر سال غالب یا اُس سے متعلق کسی موضوع پر بین الاقوامی سمینار ہوتا ہے۔ تین چار سال پہلے سمینار کے ایک اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ہندستان کے فارسی شاعروں اور بعد میں ہندستان کے فارسی فرہنگ نویسوں سے غالب کی نفرت کی بنیاد وہ ادبی معرکہ تھا جو پنشن کے سلسلے میں غالب کے مخالفوں کی وجہ سے ہوا تھا، جس میں غالب جیسے عظیم شاعر کو بہت معمولی حیثیت کے شاعروں کے ہاتھوں، محض اپنے مخالفین کی سماجی حیثیت کی وجہ سے، ذلیل ورُسوا ہونا پڑا تھا۔ اجلاس کے بعد جب ہم چائے پینے باہر آئے تو پروفیسر نثار احمد فاروقی نے کہا کہ اپنی تقریر میں تم نے جو کچھ کہا ہے، وہ بات سرسری طور پر کہنے کی نہیں ہے۔ اس موضوع پر اگر تم باقاعدہ مطالعہ کرو تو اس سلسلے میں اتنی کام کی باتیں نکلیں گی کہ پوری کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ زیرِ نظر کتاب پروفیسر نثار احمد فاروقی کے اسی مشورے کا نتیجہ ہے۔

میں نے بعض عبارتوں، اقتباسوں اور بیانوں کو محض اس لیے دہرایا ہے کہ پڑھنے والے کسی اُلجھن میں گرفتار نہ ہوں۔ قاضی عبدالودود ہمارے سب سے بڑے محقق تھے لیکن اُن کی تحریروں کے بارے میں میرا ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ مرحوم ناشر کے کاغذ اور طباعت کے پیسے بچانے میں تحریر کو اتنا مختصر کر دیتے تھے کہ اُن کی بیشتر تحریروں کو صحیح پڑھنا اور سمجھنا بجائے خود تحقیقی کارنامہ ہے۔

غالبؔ نے خطوں میں اکثر تاریخِ تحریر غلط لکھی ہے۔ مدّت بھی وہ صحیح نہیں لکھتے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایک تو وہ خط لکھتے ہوئے واقعات، سنین اور تاریخیں بیان کرنے کے معاملے میں بہت محتاط نہیں رہتے اور دوسرے انھوں نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ ان کے خطوط کبھی چھپیں گے بھی۔ انھیں اس کا بھی علم نہیں تھا کہ تاریخوں کے معاملے میں محتاط نہ رہنے کی وجہ سے انھیں بیسویں اور اکیسویں صدی کے فارسی اور اردو کے محققین کی عدالت کے کٹہرے میں بھی کھڑا ہونا پڑے گا۔

ڈاکٹر حنیف نقوی نے غالبؔ کی 'مثنوی چراغِ دیر' کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ اصل سے قریب تر ہے، اس کے علاوہ اس ترجمے میں ایسی روانی اور سلاست ہے کہ ترجمے میں تخلیقی شان پیدا ہوگئی ہے، اس لیے میں نے نقوی صاحب کی اجازت سے 'چراغِ دیر' کا پورا ترجمہ کتاب میں شامل کرلیا ہے۔

میں نے 'بادِ مخالف' کے پندرہ بیس اشعار کا نثر میں ترجمہ کرکے ظ۔ انصاری مرحوم لطیف الزماں خاں صاحب اور پرتو روہیلہ صاحب کے ترجموں سے مقابلہ کیا تو دیکھا کہ اکثر مقامات پر میرے اور ان حضرات کے ترجموں میں بس ایک دو الفاظ ہی کا فرق ہے۔ میں نے ترجمہ دوبارہ شروع کیا اور ان حضرات کے ترجموں سے بچنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں مجھے نئے الفاظ تلاش کرکے استعمال کرنے پڑے، جس کی وجہ سے ترجمہ بہت بھدّا ہوگیا۔ مجھے شروع ہی سے ظ۔ انصاری صاحب کا ترجمہ پسند تھا، اس لیے میں نے غالب انسٹی ٹیوٹ کی اجازت حاصل کرکے ظ۔ انصاری صاحب کا ترجمہ بھی لے لیا ہے۔

ظ۔ انصاری مرحوم کا یہ ترجمہ اُن کی کتاب 'مثنویاتِ غالب' میں شامل ہے، جسے غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی نے ۱۹۸۳ء میں شائع کیا تھا۔

کچھ سال پہلے کلکتے کا نام بدل کر کولکتہ کردیا گیا ہے لیکن میں نے زمانی سیاق اور خلطِ مبحث کے خطرات کے تحت اپنی کتاب میں کولکتہ کو کلکتہ ہی لکھا ہے۔

'غالب کے خطوط' کی ترتیب کے دوران مجھے یہ احساس ہوچکا تھا کہ غالبؔ کے سوانح پر ابھی تک کوئی ایسا تحقیقی کام نہیں ہوا جس سے غالب کی پوری زندگی ہمارے سامنے آجائے۔ مالک رام کی 'ذکرِ غالب'، غلام رسول مہر کی 'غالب'، شیخ محمد اکرام کی 'غالب نامہ' غالبؔ کی قابلِ قدر سوانح عمریاں ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی مکمل سوانح عمری نہیں بن سکی۔ اسی لیے غالب کے سوانح کے بہت سے پہلو تشنہ رہے۔ یہ سوانح نگاروں کی ہرگز کوتاہی نہیں ہے۔ اس

کا سبب یہ ہے کہ ایسے ماخذ بہت کم تھے، جن سے غالب کی زندگی کے بارے میں مکمل معلومات فراہم ہوسکتیں۔ اس لیے غالب کے بیشتر سوانحی حالات کا علم ہمیں غالب کے خطوط اور محققین کے قیاسات سے ہوا ہے۔ اس کتاب میں بھی بہت سے مقامات پر مجھے قیاس ہی سے کام لینا پڑا ہے۔

میں نے اس کتاب میں جن کتابوں اور مضمونوں سے استفادہ کیا ہے ان کی تفصیل یہ ہے۔۔۔ مسعود حسن رضوی صاحب کے کتب خانے میں فارسی کی ایک بیاض تھی، جس میں غالب کی غیر مطبوعہ تحریریں شامل تھیں۔ ان میں غالب کے اڑتالیس فارسی خط، دو فارسی قطعے، ایک فارسی مثنوی (یہ مطبوعہ تھی) اور ایک اردو غزل شامل تھی۔ اس بیاض کو پروفیسر مسعود حسن رضوی نے 'متفرقاتِ غالب' کے نام سے مرتب کیا۔ یہ کتاب ۱۹۴۷ء میں رام پور سے شائع ہوئی۔

اس کتاب میں جو فارسی خطوط شامل ہیں وہ مولوی سراج الدین احمد، مرزا احمد بیگ خاں تپاں، مرزا ابوالقاسم خاں کے نام ہیں بہ یہ سب لوگ وہ ہیں جو غالب کے ادبی معرکے کے دوران کلکتے میں موجود تھے۔ اس کے علاوہ 'جامِ جہاں نما' کے ادارے کے نام غالب کا ایک خط، ایک خط شیخ ناسخ کے نام اور ایک اردو خط منشی ولایت علی صفی پوری کے نام ہے۔ شیخ ناسخ اور ولایت علی صفی پوری کے علاوہ تمام لوگوں کے نام خطوط کی اہمیت یہ ہے کہ ان سے غالب کے قیامِ کلکتہ کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ 'متفرقاتِ غالب' میں خطوط کے علاوہ مرزا ابوالقاسم خاں کا غالب کے نام ایک قطعہ، قاسم کے نام غالب کے دو قطعے، تپاں اور قاسم کی توصیف میں غالب کی ایک اردو غزل، مثنوی بادِ مخالف، ایک سلام اور ایک اور مثنوی ہے۔

اس کتاب سے غالب کے قیامِ کلکتہ کے حالات پر ایک دریچہ کھل گیا اور ایسی معلومات فراہم ہوئیں جن سے محققینِ غالب ابھی تک محروم تھے۔

ڈھاکے میں ایک مشہور طبیب تھے شفا الملک حکیم حبیب الرحمان خاں۔ ان کے کتب خانے میں ایک بیاض تھی جس میں غالب کے ۳۲ غیر مطبوعہ فارسی خطوط بھی شامل تھے۔ ان کے ابتدائی پچیس خط مرزا احمد بیگ تپاں کے نام ہیں۔ دو خط سراج الدین احمد کے نام، ایک خط خواجہ فیض الدین حیدر شائق جہانگیر نگری کے نام تین خط خواجہ محمد حسن کے نام اور ایک خواجہ فخر اللہ کے نام ہے۔ اس مجموعے کے اٹھائیس خط پہلی بار ہمارے سامنے آئے ہیں۔ چار خطوط 'متفرقاتِ غالب' مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب میں شامل ہیں۔ ان خطوط کے متن میں

قاضی صاحب کے مرتبہ خطوط کے متن سے بعض مقامات پر اختلاف کی صورت دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ سب خطوط بھی غالبؔ کے قیامِ کلکتہ کے سلسلے میں بہت اہم ہیں۔

کلکتے کے سلسلے کی آخری کتاب 'نامہ ہاے فارسی' ہے۔ اس کا مخطوطہ سید علی اکبر ترمذی کو نیشنل آرکائیوز آف انڈیا میں دستیاب ہوا تھا۔ بقول ترمذی صاحب نیشنل آرکائیوز نے یہ مخطوطہ ۱۹۶۰ء میں اتر پردیش کے ضلع الہ آباد کے قصبہ کڑا کے محمد رفیع نقوی سے حاصل کیا تھا۔ مخطوطے کے آخر میں انگریزی تحریر کے مطابق ان خطوط کو اصل مخطوطے سے منشی سید علی حسن خاں نے نقل کیا تھا۔ منشی صاحب باندے کے انتظامیہ میں کسی اعلا عہدے پر فائز تھے۔ بقول سید اکبر علی ترمذی:

> "مخطوطے کے اکثر خطوط باندے کے صدر امین (سول جج) مولوی محمد علی خاں کے نام ہیں۔ مخطوطے میں کل ۳۴ خطوط ہیں، جن میں سے ۳۲ غالب کے ہیں۔ دو خطوط ایسے ہیں جو منشی سید علی حسن خاں کو اُن کے دوستوں نے لکھے ہیں۔ مخطوطے میں دو نثر پارے بھی موجود ہیں، جن کا تعلق اُس ادبی محاذ آرائی سے ہے جو غالب کو کلکتے میں درپیش آئی تھی۔" ۳

۳۲ خطوط میں سے ایک خط ہگلی کے نواب علی اکبر خاں کے نام ہے جو قدرے اختلاف کے ساتھ غالبؔ کے فارسی خطوط کے مجموعے 'پنج آہنگ' میں بھی شامل ہے۔ اس مجموعے کے کچھ اور خطوط بھی 'پنج آہنگ' میں شامل ہیں۔

۳۱ خطوط میں سے ۲۷ خطوط باندے کے مولوی محمد علی خاں کے نام ہیں اور ایک خط سید علی اکبر خاں کے نام، دو خطوط کے مکتوب الیہم کے ناموں کا پتا نہیں چل سکا۔

غالبؔ کے قیامِ کلکتہ اور خاص طور سے حامیانِ قتیل سے غالبؔ کے ادبی معرکے کے سلسلے میں سب سے زیادہ معلومات اسی مجموعے سے ملتی ہیں۔

'نامہ ہاے فارسی'، مرتبہ سید علی اکبر ترمذی فروری ۱۹۶۹ء میں غالبؔ اکیڈمی، نئی دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ لطیف الزماں خاں نے اس کا اردو ترجمہ کیا جو دسمبر ۱۹۹۵ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ چوں کہ غالبؔ کے بارے میں یہ بہت اہم کتاب تھی اور ترجمہ بہت سلیس، شستہ اور رواں تھا۔ اس لیے بہت جلد اس کا پہلا اڈیشن ختم ہوگیا۔ فروری ۱۹۹۹ء میں کراچی سے اس کا

دوسرا اڈیشن شائع ہوا۔ 'پرتو روہیلہ' نے بھی ان خطوط کا ترجمہ کیا جو گورنمنٹ کالج، لاہور کے شعبہ اردو سے شائع ہونے والے 'تحقیق نامہ' (۹۸۔۱۹۹۷ء) میں شائع ہوا۔ ترجمہ اتنا پسند کیا گیا کہ ادارہ یادگارِ غالب، کراچی نے اسے ۱۹۹۹ء میں کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے 'نامہ ہائے فارسی غالب' کا اردو ترجمہ کیا، جو 'نقشِ نیم رخ' کے نام سے ۲۰۰۲ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی سے شائع ہوا۔ علوی صاحب نے بہت احتیاط اور بہت سلیقے سے یہ ترجمہ کیا ہے۔ میں نے 'نامہ ہائے فارسی غالب' کے فارسی متن اور کہیں کہیں اس کے ترجموں سے استفادہ کیا ہے۔ یوں تو اس کتاب کی تصنیف کے دوران میں نے غالب کے تمام محققین کی تحریروں سے رہنمائی حاصل کی لیکن پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، قاضی عبدالودود، مالک رام، غلام رسول مہر، شیخ محمد اکرام، پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر مختار الدین احمد، ڈاکٹر حنیف نقوی، ڈاکٹر ظ۔ انصاری، ابو محمد سحر اور پروفیسر محمود الٰہی کی تحقیق سے میں نے بطورِ خاص استفادہ کیا ہے۔ میں ان سب حضرات کا تہہِ دل سے شکر گزار ہوں۔

میں ڈاکٹر اسلم پرویز، پروفیسر نثار احمد فاروقی، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کا بھی ممنون ہوں، جنھوں نے یہ کتاب لکھنے میں میری بہت مدد کی۔

میں رضا لائبریری (رام پور) کے ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی، خدابخش لائبریری (پٹنہ) کے ڈاکٹر ضیاالدین انصاری، غالب انسٹی ٹیوٹ (نئی دلی) کے شاہد ماہلی صاحب کا بھی شکر گزار ہوں، جنھوں نے مواد کی فراہمی میں مجھ سے بھرپور تعاون کیا۔

عارفہ خانم صاحبہ نے اس کتاب کی کمپوزنگ کی اور جاوید رحمانی صاحب، محمد ساجد صاحب اختر زماں صاحب، عارف خاں صاحب اور محمد ہاشم رشیدی صاحب اور عبدالرشید صاحب نے کتاب کی طباعت میں میری بہت مدد کی۔ میں ان سب کا شکر گزار ہوں۔

میری بیوی پروفیسر موہنی انجم سوشیالوجی کی پروفیسر ہیں لیکن اس کتاب کے لکھنے کے دوران اُن کے مشوروں سے بڑی مدد ملی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ بیوی کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میں الفاظ کہاں سے لاؤں۔ صرف دعا کر سکتا ہوں کہ خدا انھیں ہمیشہ تندرست اور سلامت رکھے۔

خلیق انجم

پہلا باب

غالبؔ کے سفرِ کلکتہ کا آغاز

غالبؔ کی پوری زندگی اُن کی خاندانی پنشن کے گرد گھومتی رہی تھی۔ یہ پورا قضیہ تفصیل کے ساتھ ایک الگ باب میں بیان کیا گیا ہے۔ یہاں اختصار کے ساتھ یہ بتانا ضروری ہے کہ غالب کے چچا نصراللہ بیگ خاں برطانوی فوج میں چارسو سوار کے رسالدار تھے اور سترہ سو روپے ماہانہ اُن کی تنخواہ تھی۔ بھرت پور کے قریب دو پرگنے سونک اور سونسا مرہٹے سردار ہلکر کے قبضے میں تھے۔ نصراللہ بیگ خاں نے فوج کشی کر کے ان دونوں پرگنوں پر قبضہ کرلیا۔ یہ دونوں لاکھ سوا لاکھ روپے سالانہ آمدنی کے زرخیز اور سیر حاصل پرگنے تھے۔ لارڈ لیک نے نصراللہ بیگ خاں کی بہادری سے خوش ہو کر انھیں یہ دونوں پرگنے حینِ حیات مقرری جاگیر میں دے دیے۔ اتفاق سے نصراللہ بیگ خاں ہاتھی سے گر گئے۔ اتنی چوٹیں آئیں کہ جانبر نہ ہو سکے۔ لارڈ لیک نے دونوں پرگنے واپس لے کر پس ماندگان کے لیے پنشن مقرر کردی اور نواب احمد بخش سے برطانوی سرکار نے یہ طے کیا کہ فیروز پور جھرکا اُن کی جاگیر رہے گی اور وہ پچیس ہزار سالانہ حکومت کو ادا کرتے رہیں گے۔ ۴؍مئی ۱۸۰۶ء کو لارڈ لیک نے طے کیا کہ نواب احمد بخش خاں پچاس سواروں کا ایک دستہ رکھیں گے جس پر پندرہ ہزار روپے سالانہ خرچ کریں گے اور دس ہزار روپے سالانہ نصراللہ بیگ خاں کے پس ماندگان کو وظیفے کے طور پر دیں گے۔ بقول غالب نواب احمد بخش خاں نے پچاس سواروں کا دستہ تحلیل کردیا اور دس ہزار روپے سالانہ وظیفے کی رقم گھٹا کر پانچ ہزار روپے سالانہ کردی۔ مزید ستم یہ کیا کہ نصراللہ بیگ، کے پس ماندگان میں اپنے ایک ملازم خواجہ حاجی، کو بھی شامل کردیا۔ پنشن کی تقسیم اس طرح کی گئی:

۱۔ خواجہ حاجی دو ہزار روپے سالانہ

۲۔ مرزا نصراللہ بیگ خاں کی والدہ اور تین بہنیں ڈیڑھ ہزار روپے سالانہ

۳۔ غالبؔ اور اُن کے بھائی مرزا یوسف ڈیڑھ ہزار روپے سالانہ۔

(اس وقت غالبؔ کی عمر نو سال اور مرزا یوسف کی سات، سال تھی)۔ جب غالبؔ نے ہوش سنبھالا تو انھیں اس بے ایمانی کا علم ہوا۔ اُن کا کہنا تھا کہ وظیفے کی رقم پانچ ہزار روپے سالانہ

نہیں دس ہزار روپے سالانہ تھی نیز خواجہ حاجی کا اُن سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ خواجہ حاجی کے والد خواجہ مرزا، غالبؔ کے دادا کے بار بردار تھے اور خواجہ حاجی اُن کے خانہ زاد تھے۔

نواب احمد بخش خاں کی اس ناانصافی کی وجہ سے زندگی بھر غالبؔ کو جو ذہنی اور جسمانی تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں، اُن کا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔

غالبؔ نواب احمد بخش خاں کو خط لکھ کر انصاف کا مطالبہ کرتے تھے۔ نواب صاحب وعدے تو کرتے رہتے تھے لیکن عملی طور پر اُنھوں نے کبھی کچھ نہیں کیا۔

۲۸/اپریل ۱۸۲۸ء کو کلکتے میں غالبؔ نے گورنر جنرل کو جو عرض داشت پیش کی تھی، اس میں لکھا تھا:

> ''احمد بخش خاں مجھے خط کے ذریعے بھی جواب دیا کرتے تھے اور اپنے دعوے کے حق میں جھوٹی قسمیں کھا کر کہا کرتے تھے۔ میں کیا کرسکتا ہوں؟ میں عزت مآب جنرل صاحب بہادر کو بتا چکا ہوں کہ خواجہ حاجی، نصراللہ بیگ خاں کے عزیز و اقارب میں شامل نہیں اور میری غلطی سے ان کا نام سرکاری ریکارڈ میں بھی درج کیا جا چکا ہے۔ اب مجھے ذلیل و رُسوا نہ کرو اور چند روز صبر کرو، خواجہ حاجی کے انتقال کے بعد میں یہ دو ہزار روپے تم دونوں بھائیوں کو دیا کروں گا۔''[1]

غالبؔ نے اس عرض داشت میں لکھا تھا کہ:

> ''ایک زمانہ گزر جانے کے بعد خواجہ حاجی کا انتقال ہوگیا۔ وہ اپنے پیچھے دو بچے چھوڑ گیا۔''[2]

مالک رام صاحب نے انڈیا آفس لائبریری سے غالبؔ کی ۲۸/اپریل ۱۸۲۸ء کی جو انگریزی عرض داشت دریافت کی تھی۔ اس میں یہ عبارت اس طرح ہے:

> ''تین برس ہوئے خواجہ حاجی کا جذام کے مرض سے انتقال ہوگیا۔''[3]

غالبؔ کے کئی محققین مالک رام صاحب کی دریافت کردہ عرض داشت کی اس عبارت کی بنیاد پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ چوں کہ ۸/اپریل ۱۸۲۸ء کی عرض داشت میں کہا گیا ہے کہ خواجہ حاجی کا انتقال تین برس پہلے ہوا تھا، اس لیے اُن کا سنہِ وفات ۱۸۲۵ء قرار پاتا ہے۔

اگر اس کے برعکس ہم غالبؔ کا یہ بیان تسلیم کرلیں کہ:

"ایک زمانہ گزر جانے کے بعد خواجہ حاجی کا انتقال ہو گیا تو شواہد اس حق میں ہیں کہ خواجہ حاجی کا انتقال ۱۸۲۳ء میں ہوا۔" [۹]

نواب احمد بخش خاں نے غالبؔ سے کہا تھا کہ خواجہ حاجی کو جو دو ہزار روپے سال کا وظیفہ ملتا ہے۔ ان کے انتقال کے بعد یہ روپے تم کو ملا کریں گے۔ خواجہ حاجی کا انتقال ہونے کے بعد دو ہزار روپے سالانہ اُن کی اولاد کو ملنے شروع ہو گئے۔ غالبؔ غصّے میں نواب احمد بخش خاں کے پاس الور پہنچے۔ نواب صاحب فیروز پور گئے ہوئے تھے۔ چوں کہ الور کے معاملات (جن کی تفصیل آگے بیان کی گئی ہے) ۱۸۲۳ء میں ہوئے تھے، اس لیے خواجہ حاجی کا انتقال ۱۸۲۳ء کے آس پاس ہوا ہوگا۔ اگر ہم خواجہ حاجی کا سنہِ وفات ۱۸۲۳ء تسلیم کر لیں تو ہماری کئی مشکلات دور ہو جائیں گی۔

غالبؔ نے سوچا کہ خواجہ حاجی کو حکومت سے دو ہزار روپے سالانہ پنشن مل رہی تھی۔ اب وہ دو ہزار روپے بھی انھیں ملنے چاہئیں۔

غالبؔ دادرسی کے لیے فیروز پور گئے تو نواب احمد بخش الور گئے ہوئے تھے اور وہاں کے معاملات میں اُلجھے ہوئے تھے۔ ادھر فیروز پور میں غالبؔ اُن کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ فیروز پور میں غالبؔ کا قیام طولِ پکڑتا رہا، جس کی وجہ سے غالبؔ کو سخت ذہنی تکلیف تھی۔ فیروز پور کے اس قیام میں غالبؔ نے دلّی میں مقیم اپنے دوست رائے چھج مل کو خط لکھا۔ خط طویل ہے لیکن فیروز پور کے قیام کے دوران غالبؔ کے جس ذہنی کرب اور جسمانی اذیت سے گزر رہے تھے۔ اس کی بھرپور عکاسی اس خط سے ہوتی ہے۔ اس لیے پورا خط نقل کیا جا رہا ہے۔ اس خط سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ نواب احمد بخش خاں الور میں تھے اور وہاں کے سیاسی معاملات میں اُلجھے ہوئے تھے۔ ادھر غالبؔ فیروز پور میں اُن کا انتہائی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ خط میں غالبؔ نے لکھا ہے کہ خدا کسی کو عزمِ سفر اور پردیس کی مصیبتوں کا شکار نہ کرے۔ خط کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے 'عزمِ سفر' سے مراد فیروز پور سے دہلی کا سفر ہے۔ خط کے آخر میں غالبؔ نے لکھا ہے کہ زمانِ ورودِ سعادت کے بارے میں لکھیے'۔ یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ غالبؔ کس کے آنے اور کہاں سے آنے کی بات کر رہے تھے۔ بہرحال چھج مل کھتری کے نام خط ملاحظہ ہو۔ غالبؔ لکھتے ہیں:

"صاحب من۔ ہر چند جانتا ہوں کہ اپنی آہ و زاری سے احباب کے لیے پریشانی کا سبب نہ بنوں لیکن دردِ دل جوش مارتا ہے۔ جس قدر

آشفتہ سری بڑھتی ہے، اتنا ہی یہ تمنا بڑھتی جاتی ہے کہ میں بھاگ دوڑ ختم کروں اور ایک جگہ بیٹھ جاؤں۔ دستِ قدرت پتھر کے نیچے دب گیا ہے۔ خوفِ رسوائی سے بہت سے نالے زبان تک نہیں آتے اور کتنا خونِ دل ہے، جو بے کسی کے درد کی وجہ سے آنسو بن کر نہیں بہتا۔ اس بے دلی کی مصیبت کا کوئی علاج بھی تو نہیں۔ اس کا انجام نظر نہیں آتا۔ اُس پرندے کی حالت اور ہو بھی کیا سکتی ہے جو پنجرے سے نکل کر پھر جال میں پھنس گیا ہو۔ (اس کا غالباً مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے دہلی سے نکل کر مصیبتوں سے نجات پائی ہو، وہ پھر فیروز پور میں مصائب و آلام کا شکار ہو گیا ہے)۔ جس ہاتھ میں ناخن ہی نہ رہے ہوں، وہ کیا گرہ کھول سکتا ہے۔ خدا کسی کو جلاوطنی، عزمِ سفر اور پردیس کی مصیبتوں کا شکار نہ کرے۔ افسوس اُس شخص کی بدنصیبی پر جو جن چیزوں کا طلب گار ہو، انھیں حاصل نہ کر سکے۔ ہر چند میں وطن میں نہیں ہوں، لیکن قربِ وطن بھی قیامت ہے۔ ابھی تک تو گھر کے لوگوں کے ساتھ خط و کتابت ہے لیکن جو کچھ دیکھتا ہوں اس سے پریشانی ہوتی ہے اور جو کچھ سنتا ہوں، اُس سے تکلیف ہوتی ہے (اپنے وطن کے) مصائب و آلام سے نیم جانی کی حالت میں جو (دہلی سے) باہر آیا ہوں۔ شاید اس لیے کہ میری مٹی فیروز پور کی ہے۔ مجھے انتہائی مجبوری کی حالت میں یہاں قیام کرنا پڑا۔ مجھے اپنی موت کی بہت آرزو ہے اور شاید (قدرت نے) موت کے لیے یہی شہر مقرر کیا ہے۔ افلاس اور تنگ دستی کی وجہ سے اس شہر کا قیام بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ نواب (احمد بخش خاں) کی واپسی کے بارے میں جو خبریں مل رہی ہیں، اُس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوں گا۔ کیوں کہ اہلِ الور کی معاشی بدحالی، لڑائی کی تیاری اور دشمنوں کے منصوبوں کی شکست محض افسانہ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ سب نواب احمد بخش کے خیر خواہوں کی امید بر آری ہے اور کچھ نہیں۔ مختصر یہ ہے کہ کہیں سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ نواب صاحب کب فیروز پور آئیں گے۔ اس لیے دل کو سکون نہیں ملتا۔ نواب صاحب کے ساتھ جو دوست ہیں، اُن میں سے جو حضرات غالب نوازی اور غالب پروری میں ہمیشہ مستعد رہتے

ہیں۔ وہ خود پریشان ہیں۔ کبھی اس مصیبت کے مارے (غالبؔ) کو سلام بھی نہیں بھیجتے ۔نواب صاحب کی واپسی کی اطلاع تو کیا بھیجیں گے۔ مصیبتیں برداشت کرنے کی طاقت ختم ہوگئی ہے اور انتظار حد سے گزر گیا ہے، میں وہ شخص ہوں کہ میدانِ جنگ میں دشمن سے مقابلے کے دوران جس کا پیر اس بری طرح زخمی ہوگیا کہ وہ اگر بھاگنا چاہے تو بھاگ نہ سکے اور اگر ٹھہرنا چاہے تو کھڑا نہ رہ سکے۔ جیسا کہ عرفی کہتا ہے:

مرا زمانۂ طنّاز دست بستہ و تیغ
تبر بفرقم و گوید کہ ہاں سرے می خار

خدا کے لیے میرے حال پر کرم فرما کر زمانِ ورودِ سعادت کے بارے میں لکھیے ۔ کیوں کہ میں سخت پریشان ہوں۔ اپنے آپ سے بیزار ہوں اور پریشانی کی وجہ سے دل بے قرار ہے۔ ممکن ہے اس بہانے (نواب صاحب کی واپسی کی خبر ملے) سے دل کو کچھ سکون ملے اور مجھے مزید پریشانی نہ ہو۔ زیادہ ازیں زیادہ است۔'' (فارسی سے ترجمہ) [۵]

میرا خیال ہے کہ الور میں نواب احمد بخش خاں کا قیام اتنا طول پکڑ گیا کہ غالبؔ کو دہلی واپس آنا پڑا۔

الور کے معاملات میں نواب احمد بخش خاں کو بہت دخل تھا۔ الور کے راجا راؤ راجا بختاور سنگھ نے انھیں ریاست کا وکیل بنا دیا تھا۔ راجا کے انتقال کے بعد راجا کے بیٹے بلونت سنگھ اور بھتیجے بنے سنگھ میں جانشینی پر اختلاف ہوا۔ ریاست میں نواب صاحب کے اقتدار سے بنے سنگھ کے حامی نواب صاحب سے ناخوش تھے۔ ان حامیوں نے نواب صاحب پر حملہ کر کے اُنھیں زخمی کر دیا۔

جب نواب احمد بخش کچھ صحت یاب ہوئے تو غالبؔ پھر فیروز پور گئے اور اُنھوں نے نواب احمد بخش خاں سے کہا کہ خواجہ حاجی کا انتقال ہوگیا ہے۔ ابؔ ہمیں ہمارا حق ہمیں ملنا چاہیے، گورنر جنرل کے نام ۲۸ر اپریل ۱۸۲۸ء کی عرض داشت میں غالب نے لکھا ہے کہ:

'اس طرح سے ایک زمانہ گزر جانے کے بعد خواجہ حاجی کا انتقال ہوگیا اور وہ اپنے پیچھے دو بچے چھوڑ گیا۔ میں نے سوچا کہ اس سال کی آمدنی مجھے ملے گی لیکن جب تنخواہ کی تقسیم ہوئی تو احمد بخش خاں کی ریاست

سے دو ہزار روپیہ سالانہ کی رقم جس کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، فوراً خواجہ حاجی مرحوم کے بچوں کو ادا کر دی گئی۔

''مایوسی کے عالم میں، میں احمد بخش خاں کے پاس فیروز پور گیا اور ان سے کہا کہ آپ کو اپنا وعدہ پورا کرنا چاہیے اور جو لوگ قانونی طور پر مستحق ہیں ان کے حقوق بحال کر دینے چاہئیں یا پھر مجھے اجازت دیں کہ میں اپنا مقدمہ حکومت کے سامنے پیش کر دوں۔ میری اس بات پر وہ بستر سے اُٹھ بیٹھے، جس پر وہ زخمی ہو جانے کی وجہ سے لیٹے ہوئے تھے اور الور کی مختاری نکل جانے کے باعث بڑے دل شکستہ تھے۔ اُنھوں نے سسکیاں بھر بھر کر میرے سامنے رونا شروع کر دیا اور کہنے لگے۔ برخوردار تم میرے بچے اور میری آنکھوں کا نور ہو، تم دیکھ رہے ہو کہ میں زخمی ہوں اور بے در بھی ہو چکا ہوں اور فریب سے مجھے اپنے واجبات سے محروم کر دیا گیا ہے۔ مزید یہ کہ جنرل آکٹر لونی سے نہ میری دوستی رہی ہے اور نہ پہلے جیسے پر تپاک مراسم۔ کچھ دن اور انتظار کر لو تمھارے تمام کے تمام حقوق بالآخر بحال کر دیے جائیں گے۔''

(فارسی سے ترجمہ)[6]

غالبؔ پھر ناکام دلّی واپس آ گئے۔ بقول مالک رام:

''۱۵ر جولائی ۱۸۲۵ء کو دہلی کے ریذیڈنٹ آکٹر لونی کا میرٹھ میں انتقال ہو گیا اور ۲۶ر اگست ۱۸۲۵ء کو سر چارلس مٹکاف کا دہلی کے ریذیڈنٹ اور سول کمشنر اور گورنر جنرل کے ایجنٹ برائے راجپوتانہ کی حیثیت سے تقرر عمل میں آیا۔ ان ہی دنوں بھرت پور کا معاملہ پیش آ گیا۔

بھرت پور کا قضیہ یہ تھا کہ ۱۸۲۳ء میں آکٹر لونی نے بلدیو سنگھ کو بھرت پور کا راجا بنا دیا تھا۔ چوں کہ بلدیو سنگھ ابھی نابالغ تھے، اس لیے اُن کے چچازاد بھائی ارجن سنگھ نے اُن کی مخالفت کی۔ آکٹر لونی نے بلدیو سنگھ کی مدد کے لیے دہلی سے کچھ فوج بھیج دی۔ گورنر جنرل لارڈ ایمہرسٹ نے آکٹر لونی کا حکم منسوخ کرتے ہوئے بھرت پور بھیجی ہوئی فوج کو واپس بلا لیا۔ آکٹر لونی کو گورنر جنرل کا یہ اقدام ناگوار گزرا اور اُنھوں نے استعفیٰ

دے دیا۔ جب چارلس مٹکاف ریذیڈنٹ مقرر ہوئے تو اُنھوں نے بھرت پور پر فوج کشی کے لیے گورنر جنرل کو راضی کرلیا۔ ۲۱؍اکتوبر ۱۸۲۵ء کو مٹکاف کلکتے سے دہلی پہنچے۔ اوائل نومبر میں فصیل شہر کے باہر خیمے نصب کر کے بھرت پور پر فوج کشی کی تیاری شروع ہوئی۔ (Lord Comber Mere) کی کمان میں فوج لے کر مٹکاف مہم پر روانہ ہوئے۔ ۶؍دسمبر ۱۸۲۵ء مٹکاف متھرا پہنچے۔ ۱۰؍دسمبر کو بھرت پور کے قلعے کا محاصرہ کیا گیا اور ۱۸؍دسمبر کو یہ معرکہ سر کرلیا گیا۔'' ۷

اس مہم میں مٹکاف کے ساتھ نواب احمد بخش خاں بھی شامل تھے۔ نواب صاحب نے غالب سے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ بھائی کی بیماری، مالی دشواری اور دوسری پریشانیوں کے باوجود پنشن کے معاملے میں انصاف کی اُمید پر غالب ساتھ چلنے پر راضی ہوگئے۔ اُن کا خیال تھا کہ اس مہم کے دوران انھیں چارلس مٹکاف سے ملاقات کا موقع مل جائے گا۔ مہم کے دوران غالب نواب صاحب کے ساتھ رہے لیکن بھرت پور میں غالب کے اِصرار کے باوجود نواب احمد بخش خاں نے چارلس مٹکاف سے اُن کی ملاقات نہیں کرائی۔ مٹکاف بھرت پور سے فیروز پور آگئے، جہاں اُنھوں نے تین دن قیام کیا۔ غالب نے اس دوران بھی بارہا نواب احمد بخش خاں سے درخواست کی لیکن نواب صاحب نے مٹکاف سے غالب کی ملاقات نہیں کرائی۔

غالب ۲۸؍اپریل ۱۸۲۸ء کی عرض داشت میں اس واقعے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''موصوف (سر چارلس مٹکاف) کی آمد کے بعد چوں کہ بھرت پور کا معاملہ ان کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا اور وہ راجا کی امداد اور بھرت پور میں باغیوں کی گوشمالی کی جانب اپنی ساری توجہ مبذول کیے ہوئے تھے، اس لیے احمد بخش خاں نے کہا کہ مجھے اس سفر میں ان کے ساتھ جانا چاہیے باوجودیکہ میں اس زمانے میں اپنے بھائی کی علالت ۸ اور قرض خواہوں کے سخت تقاضوں کی وجہ سے اذیت ناک پریشانی میں مبتلا تھا اور بالکل اس سفر کے قابل نہیں تھا لیکن اس اُمید پر کہ موصوف (سر چارلس مٹکاف) کی طرف سے جو فرض منصبی مجھ پر عائد ہوتا ہے وہ ادا ہوجائے گا۔ میں نے اپنے بھائی کو بخار اور ہذیانی حالت میں چھوڑا، چار آدمی اس کی دیکھ بھال اور نگہداشت پر مقرر کیے، کچھ قرض خواہوں

> سے وعدے وعید کر کے انھیں راضی کیا، دوسروں سے چھپتا چھپاتا اور بھیس بدل کر کسی قسم کی سہولت کے بغیر بمشکل تمام احمد بخش خاں کے ساتھ بھرت پور روانہ ہو گیا۔''[9]

اس زمانے میں غالبؔ کے بھائی مرزا یوسف دماغی عارضے میں مبتلا تھا۔ ان کی دیکھ بھال پر غالبؔ کو چھ سو روپے سالانہ خرچ کرنے پڑتے تھے۔ پنشن میں سے غالب کے پاس صرف نو سو روپے بچ رہتے تھے، جس کا بیشتر حصّہ قرض خواہوں کو ادا کرنا پڑتا تھا۔

جب چارلس مٹکاف سے جلد ملاقات کی کوئی اُمید باقی نہیں رہی تو غالبؔ نے پنشن کے معاملے میں نواب احمد بخش خاں کے وسیلے اور اِعانت کا خیال ترک کر دیا اور فیصلہ کیا کہ وہ بغیر کسی ذریعے کے مٹکاف سے ملاقات کریں گے۔ اُس وقت مٹکاف دہلی میں تھے اور قرض خواہوں کے خوف سے غالبؔ دہلی نہیں جاسکتے تھے۔ اس لیے یہ موقع بھی غالب کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ان ہی دنوں خبر ملی کہ گورنر جنرل لارڈ ایمہرسٹ کان پور کے راستے دہلی آ رہے ہیں۔ چوں کہ اس کا پورا اِمکان تھا کہ سر چارلس مٹکاف، لارڈ ایمہرسٹ کے استقبال کے لیے کان پور پہنچیں گے اور وہاں سے دہلی تک گورنر جنرل کے ہم رکاب رہیں گے۔ اس لیے غالبؔ نے سوچا کہ وہ کان پور پہنچ جائیں اور گورنر کے جلوس کے ساتھ دہلی واپس آئیں۔ راستے میں انھیں چارلس مٹکاف سے اپنی پنشن کے حالات، اپنی عُسرت و تنگ دستی کی ذلّت بھری داستان اور قرض خواہوں کے احوال بیان کرنے کا موقع مل جائے گا۔

مالک رام صاحب نے غالبؔ کی ۲۸/ اپریل ۱۸۲۸ء کی عرض داشت کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس میں غالب کا بیان ہے کہ اُنھوں نے نواب احمد بخش خاں سے کہا کہ:

> ''آپ کو اپنا وعدہ پورا کرنا چاہیے اور جائز وارثوں کو اُن کا حق دینا چاہیے یا پھر مجھے اجازت دیجیے کہ میں جا کر اپنا مطالبہ حکومتِ عالیہ کے سامنے پیش کروں۔''[10]

اس انگریزی عبارت کا ترجمہ غالبؔ کی خاندانی پنشن میں 'حکومتِ عالیہ' کے بجائے 'حکومت' کیا گیا ہے[11] اور حکومت سے مراد دہلی کے ریذیڈنٹ ہیں۔ غالب کی پوری کوشش تھی کہ وہ اپنی شکایت ریذیڈنٹ چارلس مٹکاف تک پہنچائیں۔ جب گورنر جنرل لارڈ ایمہرسٹ کی کان پور پہنچنے کی خبر آئی تو غالب کو خیال ہوا کہ نواب احمد بخش خاں کو بیچ میں ڈالے بغیر چارلس مٹکاف سے براہِ راست گفتگو کریں۔ اُنھوں نے سوچا کہ جب وہ دہلی آئیں گے تو غالب بھی

اُن کے ساتھ واپس آجائیں گے اور راستے میں اُن سے اپنی شکایت کرنے کا موقع نکال لیں گے۔

اُنھوں نے ۲۸/اپریل ۱۸۲۸ء کی عرض داشت میں لکھا ہے کہ:

> ''بہتر یہ ہے کہ کسی اور کو بیچ میں ڈالے بغیر میں خود سر چارلس مٹکاف سے ملوں اور اپنا سارا احوال شروع سے آخر تک، بلا کم و کاست ان کی خدمت میں پیش کروں تاہم قرض خواہوں کے تقاضوں کے خوف نے میرے لیے یہ ناممکن بنا دیا کہ میں دہلی جاؤں۔ اس خیال سے کہ میری نیک نامی کو بٹہ نہ لگ جائے میں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ اس کے علاوہ ان ہی دنوں گورنر جنرل کی آمد کی خبر عام ہوئی اور امکان یہ تھا کہ سر چارلس مٹکاف، گورنر جنرل کی ہم رکابی کے لیے تشریف لائیں گے تو میرے دل میں کان پور جانے اور وہاں سے ان کے خدم و حشم کے جلوس کے ساتھ واپس آنے اور راستے میں خود کو سر چارلس مٹکاف سے متعارف کرانے، اپنی عسرت و تنگ دستی کی ذلت بھری داستان بے چارگی اور قرض کے احوال ان کے گوش گزار کرنے اور انصاف حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ مختصر یہ کہ اس ارادے کے ساتھ میں فیروز پور سے فرخ آباد اور کان پور کی جانب روانہ ہوا۔''[۱۲] (فارسی سے ترجمہ)

یہاں یہ بات خاص طور سے قابلِ ذکر ہے کہ غالبؔ 'حکومت' یعنی ریذیڈنٹ سے شکایت کرنا چاہتے تھے۔ 'حکومتِ عالیہ' یعنی جرنل سے نہیں۔ کان پور سے روانہ ہونے سے پہلے اُنھوں نے قطعی یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ کلکتے جا کر شکایت کریں۔

یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میرا خیال ہے کہ غالبؔ نے جب کان پور جا کر گورنر جنرل اور چارلس مٹکاف کے ساتھ دہلی واپس آنے کا ارادہ کیا ہے تو وہ سفرِ خرچ کے انتظام کے لیے دہلی گئے۔ اُنھوں نے ۲۸/اپریل ۱۸۲۸ء کی عرض داشت میں لکھا ہے کہ:

> ''بالآخر ضرورت سے مجبور ہو کر میں دہلی گیا جو میرے آبا و اجداد کا زاد بوم ہے، یہاں میں نے اپنے نانا اور والد کے تمام اثاثے جو میرے پاس بچ رہے تھے، بیچ ڈالے اور قرض خواہوں سے قرض چکانے کے لیے رابطہ قائم کیا اور اس آمدنی سے قرض چکانے کے باوجود اس وقت

بھی میں بیس ہزار روپے کا مقروض ہوں۔"[۱۳]

غالبؔ نے اپنے نانا اور والد کا اثاثہ فروخت کیا۔اس طرح جو رقم ملی، اس سے کچھ قرض چکایا اور کان پور تک کے سفر خرچ اور اس شہر میں قیام کے لیے کچھ رقم لے کر فیروز پور واپس آگئے اور پھر وہاں سے فرخ آباد ہوتے ہوئے کان پور پہنچ گئے۔

غالبؔ کے بعض محققین کا خیال ہے کہ غالبؔ دہلی ہی سے کلکتے کے سفر کا ارادہ کر کے چلے تھے۔غالب نے مولوی فضل حق خیر آبادی کے نام جو خط لکھا تھا اس کے تعارف کے طور پر اُنھوں نے چند سطریں نواب محمد علی خاں کو لکھی تھیں:

"سواد نخستین نامہ ایست شرحش ایں کہ در میاوی بسیج سفرِ مشرق، بہ فیروز پور کہ جا گیر عمو صاحب قبلہ فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ است، بخدمتِ عمِ ممدوح گزرانیدہ بودم۔"[۱۴]

پہلے خط کا مفہوم یہ ہے کہ مشرق (کلکتے) کے سفر سے پہلے میں اپنے چچا فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خاں بہادر رستم کی جاگیر (فیروز پور) میں مقیم تھا۔

خط کی تعارفی تحریر میں غالبؔ کے ان الفاظ سے کہ 'سفرِ مشرق (کلکتہ) کی تیاری کی ابتدا میں جب میں فیروز پور میں مقیم تھا' سے بعض محققین نے یہ مطلب نکالا ہے کہ غالب نے جب مولوی فضل حق خیر آبادی کو خط لکھا ہے اُس وقت وہ کلکتہ جانے کا ارادہ کر چکے تھے۔ مجھے محققین کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔کیوں کہ مولوی فضل حق کے خط میں غالب نے یہ بتایا ہے کہ نواب احمد بخش خاں الور کے معاملات میں اُلجھے ہوئے تھے۔ممکن ہے یہ معاملات اس زمانے کے ہوں جب بنے سنگھ اور بلونت سنگھ کے اختلافات دور کرنے میں نواب صاحب مصروف تھے۔ایک بات ضرور ہے کہ الور کے ایک شخص نے نواب احمد بخش پر ۲؍مئی ۱۸۲۳ء کو قاتلانہ حملہ کر کے انھیں زخمی کر دیا تھا۔غالب کا یہ خط اس واقعے سے پہلے کا ہے، ورنہ غالب قاتلانہ حملے کا ذکر ضرور کرتے۔اب رہا سوال غالب کی تحریر کے یہ الفاظ 'در مبادی بسیج سفرِ مشرق'۔ غالب نے یہ الفاظ مولوی فضلِ حق خیر آبادی کے خط کے تعارف میں ۱۸۲۸ء یا ۱۸۲۹ء میں لکھے تھے اور یہ الفاظ بعد میں لکھے گئے ہوں گے خط کے ساتھ نہیں۔ مولوی صاحب کے نام خط میں نہیں اس لیے غالب کے دہلی سے فیروز آباد کے دو یا تین سفروں کو کلکتے کے سفر کا آغاز ہی کہیں گے۔

غالبؔ کان پور اور لکھنؤ میں

چارلس مٹکاف سے ملاقات کے لیے غالبؔ کان پور پہنچ گئے۔ کان پور پہنچتے ہی بیمار پڑ گئے۔ بقول غالبؔ:

> ''اتفاق دیکھیے کہ کان پور پہنچتے ہی میں بیمار پڑ گیا۔ اچانک نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہلنے جلنے کی طاقت بھی جاتی رہی۔ چوں کہ مجھے اس شہر میں کوئی مناسب طبیب نہ مل سکا،[1] اس لیے مجبوراً دریائے گنگا کو عبور کر کے کرایے کی ایک فینس میں مجھے لکھنؤ کی راہ لینی پڑی۔ میں لکھنؤ میں پانچ مہینے اور چند روز صاحب فراش رہا۔''[2]

غالبؔ کے بیانات سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اُنھوں نے لکھنؤ میں پانچ مہینے قیام کیا تھا۔ ایک تو وہ بیان جو اُنھوں نے گورنر جنرل کے نام عرض داشت مورخہ ۲۸/اپریل ۱۸۲۸ء میں دیا تھا، جس کا اقتباس پہلے نقل کر دیا گیا ہے اور دوسرے ابن حسن خاں کے نام ایک فارسی خط میں غالبؔ نے لکھا ہے:

> ''کمابیش پنج ماہ دراں شہر آب خورد کردہ۔''[3]

رائے چھج مل کے نام غالبؔ نے ایک خط میں لکھا ہے:

> ''۲۶/ذیقعدہ بروز جمعہ اس ستم آباد (لکھنؤ) سے نکل کر ۲۹/تاریخ کو دارالسرور کان پور پہنچا۔ دو تین مقامات سے گزرتا ہوا آخر کار باندہ پہنچ جاؤں گا۔ اگر خدا نے چاہا اور موت نے امان دی تو کچھ دن آرام کر کے کلکتے کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔''[4] (فارسی سے ترجمہ)

غالبؔ خط کے متن میں جو تاریخیں لکھتے ہیں، اُن میں عام طور سے سنین نہیں لکھتے۔ اس خط میں بھی یہی ہوا ہے۔ اُنھوں نے تاریخ اور مہینہ تو لکھا ہے لیکن سن نہیں لکھا۔ مختار الدین احمد اور دوسرے محققین کا خیال ہے کہ یہ سنہ ۱۲۴۲ء یعنی ۱۸۲۷ء ہے۔ مجھے محققین کی اس رائے سے

اتفاق ہے کہ غالب ۲۶/ذیقعدہ ۱۲۴۲ھ مطابق ۲۲/جون ۱۸۲۷ء کو لکھنؤ سے روانہ ہوئے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ جب گورنر جنرل ایمہرسٹ کان پور پہنچے اور شاہِ اودھ غازی الدین حیدر اُن سے ملاقات کے لیے کانپور گئے تو غالب لکھنؤ میں تھے۔ اُنھوں نے لکھا ہے کہ 'میں نے گورنر جنرل کی آمد کی خوش کن خبر سنی اور آنجناب سے ملاقات کے لیے شاہِ اودھ کا حال سنا۔'' [۵]

یہ واقعہ ۲۰/نومبر ۱۸۲۶ء کا ہے۔

اگر ہم غالب کے اس بیان کو درست مان لیں کہ لکھنؤ میں اُن کا قیام پانچ مہینے یا پانچ مہینے سے دو چار دن سے زیادہ رہا تو غالب کو دسمبر ۱۸۲۶ء یا جنوری ۱۸۲۷ء میں لکھنؤ پہنچنا چاہیے مگر یہ تاریخیں تسلیم کرنے میں قباحت یہ ہے کہ ۲۰/نومبر ۱۸۲۶ء (شاہِ اودھ اور گورنر جنرل کی کان پور میں ملاقات کی تاریخ) کو غالب لکھنؤ میں تھے۔ اگر ہم یہ بھی تسلیم کرلیں کہ غالب نومبر کے مہینے میں لکھنؤ پہنچ چکے تھے تو لکھنؤ میں غالب کے قیام کو کم سے کم آٹھ مہینے ہوجاتے ہیں۔ اِمکان یہ ہے کہ وہ نومبر سے ایک دو مہینے پہلے پہنچے ہوں گے۔ اگر ہمارا قیاس درست ہے تو غالب پانچ مہینے سے آٹھ نو مہینے تک لکھنؤ میں رہے تھے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ اُن کا قیام اور بھی زیادہ مدت کے لیے رہا ہو۔

جب معتمد الدولہ سید محمد خاں بہادر عرف آغا میر کو لکھنؤ میں غالب کی آمد کی خبر ہوئی تو اُنھوں نے غالب سے ملاقات کا شوق ظاہر کیا۔ غالب نے بھی یہ موقع غنیمت جانا کیوں کہ انھیں روپوں کی سخت ضرورت تھی، اس لیے بخوشی راضی ہوگئے۔ لکھنؤ میں غالب کی سبحان علی خاں، میر نیاز حسین خاں اور بعض دوسرے حضرات سے دوستی ہوگئی۔ غالب نے انھیں 'دوستانِ جدید' کہا ہے۔ ان حضرات کی تجویز پر غالب نے معتمد الدولہ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے ایک عرض داشت لکھی۔ یہ تیاری تو ہوگئی لیکن ملاقات کے لیے غالب نے یہ شرط پیش کی جب وہ معتمد الدولہ کے دربار میں حاضر ہوں تو معتمد الدولہ کھڑے ہوکر ان کا استقبال کریں۔ اُن سے معانقہ کریں اور غالب کو نذر پیش کرنے سے معاف رکھیں۔ بقول غالب ''گدا طبع، سلطان صورت معتمد الدولہ کو یہ شرائط منظور نہیں تھیں۔ اس لیے غالب کی اُن سے ملاقات نہیں ہوسکی۔''

غالب نے معتمد الدولہ کے نام صنعتِ تعطیل میں ایک عرض داشت لکھی تھی۔ یہ عرض داشت اور اس کا تعارف 'نامہ ہائے فارسی غالب' میں شامل ہے۔ [۶] تعارف میں غالب نے

معتمد الدولہ سے ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''معانقے کے سلسلے میں ملاقات کے لیے اُن (معتمد الدولہ) کی طرف سے کچھ ایسی باتیں ہوئیں کہ ذہنی معاملے نے عملی صورت اختیار نہیں کی۔ چوں کہ اُن معاملات کی وجہ سے جن کا میں نے ذکر کیا ہے۔ میرا دل زخمی تھا، نیز طویل سفر اور دشوار مقصد در پیش تھے۔ میں نے پاسِ ناموسِ خاکساری کی وجہ سے استغنیٰ سے کام لیا تھا اور اُن نو دولتیوں کے اختلاط سے اپنا دامن بچا لیا۔ اگر چہ اُس خواہش کا نقش دل پر باقی نہیں، لیکن وہ تحریر کاغذ پر محفوظ ہے۔ چناں چہ ہزیاں نگار قلم سے وہ (عرض داشت) نقل کر رہا ہوں۔''[۷] (فارسی سے ترجمہ)

غالب نے معتمد الدولہ کی مدح میں ایک سو دس اشعار کا ایک قصیدہ بھی کہا تھا۔ قصیدے کا مطلع ہے:

> گر بہ سنبل کدۂ روضۂ رضواں رفتم
> ہوسِ زلفِ ترا سلسلہ جنباں رفتم

چوں کہ معتمد الدولہ نے ملاقات کے لیے غالب کی شرائط منظور نہیں کی تھیں، جس کی وجہ سے غالب اُن سے ناراض ہو گئے تھے، اس لیے غالب نے معتمد الدولہ کے لیے جو عرض داشت لکھی تھی، وہ انھیں پیش نہیں کی اس کی تعارفی تحریر میں غالب نے معتمد الدولہ کو 'نو دولتیہ' کہا۔ اسی طرح معتمد الدولہ کو یہ قصیدہ بھی پیش نہیں کیا۔

غالب جب باندے گئے تو اُنھوں نے نواب محمد علی خاں کو اس قصیدے کی نقل پیش کی۔ کلکتے پہنچ کر انھیں خیال آیا کہ اس قصیدے پر ممدوح کی حیثیت سے معتمد الدولہ کا نام ہے۔ چوں کہ غالب ممدوح کا نام بدلنا چاہتے تھے۔ انھیں خیال آیا کہ اگر نواب محمد علی خاں نے کسی کو دکھایا دیا تو یہ قصیدہ ضائع ہو جائے گا۔ اس لیے کلکتے پہنچ کر غالب نے نواب صاحب کے نام ایک خط میں لکھا:

> ''......خدا گواہ ہے وہ قصیدہ جو میں نے آغا میر کی مدح میں لکھا ہے، میرے خاندان کے لیے باعثِ رسوائی ہے۔ اب لطف یہ ہے کہ قصیدے کے ان اشعار کو کاغذ سے مٹا نہیں سکتا۔ نواب مرشد آباد بھی

سیدزادے ہیں۔اس قصیدے کو اُن کے نام سے مشہور کر رہا ہوں۔اگرچہ اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع نہیں ملا لیکن ہمایوں جاہ کی مدح مجھے ناگوار نہیں ہے۔ جب تک اس قصیدے کے ممدوح سے مختص اشعار شامل نہ کرلوں۔ یہ اشعار کسی کو نہ دکھائیں اور بزرگوں کی طرح چھوٹوں کے عیب پوشیدہ رکھیں۔"[8]

غالبؔ معتمدالدولہ آغا میر سے اتنے ناراض تھے کہ اس سے بھی انکار کردیا کہ اُنھوں نے معتمدالدولہ کی مدح میں قصیدہ کہا تھا۔قاضی عبدالودود نے لکھا ہے کہ:

"غالبؔ نے کہیں لکھا ہے کہ اُنھوں نے آغامیر کی مدح میں قصیدہ نہیں لکھا، صرف نثر لکھی تھی۔اس مجموعے کے ایک خط سے پتا چلتا ہے کہ ایک سو دس ابیات میں اُن کا نام بھی آیا تھا۔اُس کی ایک نقل محمد علی خاں کے پاس تھی۔غالب اُنھیں لکھتے ہیں کہ یہ قصیدہ میرے خاندان کے لیے باعثِ ننگ ہے لیکن اسے ضائع بھی نہیں کرسکتا۔ابھی تک ہمایوں جاہ نواب مرشدآباد سے ملاقات کا موقع نہیں ملا مگر چاہتا ہوں کہ اُن کے نام کردوں۔ جب تک وہ اشعار جن میں آغا میر کا نام آیا ہے یا اُن کی طرف اشارہ ہے بدل نہ دوں، یہ قصیدہ کسی کو نہ دکھائیں۔بعد کو اُس قصیدے کے ممدوح نصیرالدین حیدر قرار پائے۔اُس کی ردیف 'رفتم' ہے اور قوانی 'عنوان'، 'گریبان' وغیرہ ہیں۔"[9]

بعد میں غالبؔ نے اس قصیدے[10] کا ممدوح شاہِ اودھ نصیرالدین حیدر کو کردیا۔ایک سو دس اشعار کا یہ قصیدہ کلیاتِ غالب فارسی میں شامل ہے۔[11]

غالبؔ نے لکھنؤ میں گیارہ اشعار کی ایک غزل کہی تھی۔اس کے آخری تین شعر تھے:

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا، یعنی
ہوسِ سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو

مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے، یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

لائی ہے معتمد الدولہ بہادر کی امید
جادۂ رہ، کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

جب معتمد الدولہ سے بگڑ گئی تو آخری شعر کے پہلے مصرع سے معتمد الدولہ کا نام نکال کر اسے مقطع کر دیا۔ متداول دیوان میں اب یہ شعر اس طرح ملتا ہے:

لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

لکھنؤ کے حالات بہت زیادہ خراب تھے۔ غالبؔ کا خیال تھا کہ یہ خرابی معتمد الدولہ کی وجہ سے تھی، جنھوں نے بقول غالبؔ 'عوام پر ظلم و ستم کی حد کر رکھی تھی۔ غالبؔ نے اپنے دوست رائے چھج مل کو وہاں کے حالات تفصیل سے بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"آپ کے خط کے جواب میں جو تاخیر ہوئی، وہ تغافل کی وجہ سے نہیں ہے۔ جس زمانے میں آپ کا نوازش نامہ موصول ہوا، میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ قیام کروں یا سفر پر نکل جاؤں۔ سوچتا تھا کہ اگر میرا مقصد پورا ہو جائے اور مدعا حاصل ہو جائے تو بے تامل آپ کو خط لکھوں، جس میں تمام باتیں لکھوں لیکن بختِ رمیدہ نے ساتھ نہیں دیا اور بازیہای خیال درہم برہم ہو گئی۔ شروع میں معاملات بالکل ٹھیک تھے لیکن درمیان میں پہنچ کر حالات خراب ہو گئے۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے انجام نہیں دیکھنا پڑا ورنہ پتا نہیں کیا کیا دیکھنا پڑتا۔ مختصر گفتگو یہ ہے کہ اعیانِ سرکارِ لکھنؤ مجھ سے بڑی گرم جوشی سے ملے لیکن (معتمد الدولہ آغا میر) کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے جو شرط قرار پائی، وہ میری خودداری کے خلاف اور ننگِ شیوۂ خاکساری تھا...... سخن مختصر جو کچھ شہر میں اس گدا طبع اور سلطان صورت یعنی معتمد الدولہ آغا میر کی فیاضی اور کرم پیشگی کے بارے میں سنا ہے، خدا کی قسم حقیقت اس کے برعکس ہے۔

شروع میں جو بھی شخص اپنے حصولِ مدعا کے لیے آغا میر سے وابستہ ہوا۔ اُن میں سے بے شک ایک دو آدمیوں کو فائدہ پہنچا اور اب

چوں کہ حکومت میں اُس نے مضبوطی سے اپنے پیر جما لیے ہیں۔ دولت جمع کرنے میں لگ گیا ہے۔ لکھنؤ کے تمام قدیم خاندان اس بے رحم کے ظلم کی وجہ سے سیلابِ فنا کی نذر ہو گئے ہیں اور اس شہر کے نازپرورده ادھر اُدھر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ وہ خود اپنے اسرافِ بیجا اور فضول خرچی سے پشیمان اور برگشتہ ہے۔

مختصر یہ کہ ظلم و ستم کا بازار گرم ہے۔ مہاجن اور ساہوکار چوری چھپے اپنا زر و مال کان پور پہنچا رہے ہیں۔ چوں کہ خود کو لوگ یہاں محفوظ نہیں سمجھتے، اس لیے جو تھا بھاگ گیا اور جو ہے وہ بھاگنا چاہتا ہے۔'' (فارسی سے ترجمہ) [۱۲]

غالبؔ ۲۶ / ذیقعدہ ۱۲۴۲ھ مطابق ۲۱ / جون ۱۸۲۷ء بروز جمعہ لکھنؤ سے روانہ ہوئے۔ چوتھے دن کان پور پہنچے۔ کچھ دن آرام کر کے وہ کلکتے کے ارادے سے باندہ روانہ ہو گئے۔ غالبؔ نے کلکتے جانے کا ارادہ لکھنؤ میں اُس وقت کر لیا تھا جب وہ چارلس مٹکاف سے ملاقات میں ناکام ہو گئے تھے۔

غالبؔ کا باندہ، الہ آباد، بنارس اور مرشد آباد کا سفر

غالبؔ کے سفرِ باندہ اور قیام باندہ پر محمد مشتاق شارقؔ کا ایک مقالہ[1] اور صالحہ بیگم قریشی کی ایک کتاب[2] چھپی ہے۔ اس کتاب اور مضمون میں پہلی بار غالب اور باندے کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ میں نے یہاں اس مضمون اور کتاب سے استفادہ کیا ہے۔

میرا خیال ہے کہ لکھنؤ ہی میں غالبؔ نے کلکتے کے سفر کا ارادہ کرلیا تھا۔ انھیں خیال تھا کہ معتمد الدولہ اور شاہِ اودھ غازی الدین حیدر سے انعام و اکرام کی صورت میں اتنی رقم مل جائے گی کہ وہ لکھنؤ سے کلکتے کا سفر کرسکیں گے۔ جب معتمد الدولہ نے اُن کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تو اُنھوں نے سوچا کہ وہ لکھنؤ سے کان پور اور کان پور سے باندہ جائیں۔

غالبؔ نے نواب انورالدولہ سعد الدین خاں شفقؔ کے نام ایک خط مورخہ ۱۸۵۳ء میں لکھا ہے:

> ''میرا ایک بھائی، ماموں کا بیٹا کہ وہ نواب ذوالفقار بہادر کی حقیقی خالہ کا بیٹا ہوتا تھا اور مسندِ نشین حال (نواب ذوالفقار علی بہادر) کا چچا تھا اور میرا ہمشیر بھی تھا یعنی میں نے اپنی ممانی کا اور اس نے اپنی پھوپھی کا دودھ پیا تھا۔ وہ باعث ہوا تھا میرے باندہ بوندیل کھنڈ آنے کا۔''[3]

غالبؔ کو امید تھی کہ باندے میں نواب ذوالفقار علی بہادر اُن کا علاج کرادیں گے، نیز ان کے کلکتے کے سفر کے لیے اخراجات کا انتظام بھی ہوجائے گا۔

باندہ اتر پردیش کے جنوب میں بندیل کھنڈ میں واقع ہے۔ یہ شہر باندہ ضلع کا صدر مقام ہے۔ اس شہر کا جغرافیہ بتاتے ہوئے صالحہ بیگم قریشی نے لکھا ہے:

> '' (باندے) کے شمال میں دریائے جمنا۔ مشرق میں الہ آباد کا ضلع، جنوب میں بندھیاچل پہاڑوں کا ایک طویل سلسلہ و موجودہ مدھیہ پردیش کا علاقہ۔ اور مغرب میں دریائے کین اور ہمیر پور کا ضلع واقع

ہے۔ یہ شہر قدیم قومی شاہراہ گرانڈ ٹرنک روڈ سے کافی دور اور بندیل کھنڈ کے اندرونی حصّے میں ہے۔ اس لیے یہ ضلع تمام سمتوں سے کٹ کر گمنام سا ہوگیا تھا۔''[۴]

غالبؔ ۲۱ر جون ۱۸۲۷ء کو لکھنؤ سے روانہ ہوکر غالباً تیسرے دن کان پور پہنچے۔ یہاں سے اُنھوں نے فتح پور تک کا غالباً یکّے کے ذریعے سفر کیا۔[۵] کان پور سے چار پانچ دن کا سفر طے کرکے غالبؔ جون ۱۸۲۷ء کے اواخر یا جولائی کے شروع میں باندے پہنچ گئے۔

غالبؔ نے باندے جانے کے بارے میں گورنر جنرل کو پیش کی جانے والی عرض داشت میں لکھا ہے:

''چوں کہ میرے اور نواب ذوالفقار علی بہادر کے آباواجداد میں دوستانہ مراسم زمانۂ قدیم سے چلے آرہے تھے اور میرے دل میں بھی نواب بہادر کے لیے بڑی محبت اور لگاؤ تھا، اس لیے میں نے ایسی تدبیریں شروع کر دیں کہ جس طرح بھی بن پڑے میں بندیل کھنڈ میں باندے پہنچ جاؤں۔ میں وہاں نواب صاحب کے دولت کدے پر چھے مہینے تک مقیم رہا۔''[۶]

جب غالبؔ باندے پہنچے ہیں تو اُن کی طبیعت بہت خراب تھی۔ نواب ذوالفقار علی بہادر نے غالب کا علاج کرایا۔ غالب نے لکھا ہے:

''اللہ کے فضل اور نواب صاحب کی توجہ اور تیمارداری کی بدولت مجھے اس خطرناک بیماری سے شفا حاصل ہوئی۔''[۷]

غالبؔ کو کان پور میں جو بیماری ہوئی تھی، جس سے انھیں لکھنؤ میں اور پھر باندہ میں بھی نجات نہیں ملی۔ اس کے بارے میں بھی صالحہ بیگم قریشی نے باندہ میں کہی گئی غالبؔ کی غزل جس کا مطلع ہے:

آبرو کیا خاک اس گل کی کہ گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں

کا تجزیہ کرکے قیاس کیا ہے کہ غالبؔ 'بوالدم' کے مریض تھے۔ اس میں پیشاب کے ساتھ قطرہ قطرہ خون آتا ہے۔'' جب خون آتا ہے تو بے حد سوزش اور جلن کا احساس ہوتا ہے، جس

سے تکلیف بڑھتی ہے......... یہ مرض 'بوالدم' کثرتِ شراب نوشی یا کسی دیگر وجہ سے گردوں میں حدّت بڑھ جانے کی وجہ سے لاحق ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے گردوں میں پتھری پڑ گئی ہو۔''[8] صالحہ کا قیاس ہے کہ غالب کا علاج حکیم کرامت حسین نے کیا تھا۔

نواب ذوالفقار علی بہادر کے محلات کو انگریزوں نے اُس وقت ڈھا دیا تھا جب اُنھوں نے ۱۸۵۸ء میں شہر باندہ پر دوبارہ قبضہ کیا لیکن وہ عمارت محفوظ ہے۔ جو نواب صاحب کا مہمان خانہ تھا جو بقول صالحہ بیگم قریشی 'آج بھی شکستہ حالت میں موجود ہے اور جسے بارہ دری کہتے ہیں اور جس سے ملحق عمارت میں شہر کی نگر پالیکا کے دفاتر واقع ہیں۔'[9] اسی مہمان خانے میں غالب نے چھ مہینے قیام کیا ہوگا۔

باندے میں غالبؔ کے ایک رشتہ دار مرزا اوزبک خاں بھی تھے۔ یہ نواب باندہ اور غالبؔ دونوں کے ہمشیر تھے اور غالبؔ کی ممانی کے صاحب زادے تھے۔ مرزا اوزبک خاں کے بڑے بھائی مرزا مغل خاں بھی باندے میں تھے۔

باندے میں ایک صاحب نواب محمد علی خاں تھے جو اس زمانے میں باندے کے صدر امین (سول جج تھے) یہ فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ ان سے بھی غالب کے بہت گہرے دوستانہ مراسم ہو گئے۔ کلکتے میں جب غالب مالی مشکلات کا سامنا کر رہے تھے تو محمد علی خاں صاحب نے اُن کی مالی مدد کی، جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ غالبؔ نے کلکتے سے نواب محمد علی خاں کے نام جو خطوط لکھے ہیں اور جنھیں سید اکبر علی ترمذی نے 'نامہ ہائے فارسی غالب' کے نام سے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔ غالب کے سفرِ کلکتہ اور قیامِ کلکتہ کے حالات کے سلسلے میں اہم ترین ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ باندے سے کلکتے کے لیے خاصی بڑی رقم کی ضرورت تھی اور غالب کے پاس کچھ نہیں تھا۔ بقول غالب:

> ''جب باندہ پہنچا تو میں نے نواب صاحب سے دو ہزار روپے قرض مانگے..... میں نے دل میں سوچا کہ یہ بھی غنیمت ہے۔ یہ روپے لو اور یہاں سے چلو۔''[10]

نواب ذوالفقار علی خاں نے اپنے مہاجن سیٹھ امی کرن سے دو ہزار روپے قرض دلوا دیے۔ ان مہاجن کا نام کئی محققین نے سیٹھ امین چند بتایا ہے جو درست نہیں (اس کتاب کے آخر میں ان کے حالات دیے گئے ہیں) غالب کو باندے سے الہ آباد جانا تھا۔ اُن کے سامنے دو راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ وہ باندہ سے چلہ تارہ، وہاں سے فتح پور، پھر الہ آباد جائیں۔ یہ خشکی کا راستہ

تھا۔اس راستے پر سفر کے لیے گھوڑوں یا گاڑیوں کا استعمال کرنا پڑتا تھا دوسرا راستہ تھا۔ باندہ سے چلہ تارہ اور وہاں سے باقی سفر بذریعہ ناؤ۔

باندہ میں چھ مہینے گزار کر صحت یاب ہوکر اور نواب ذوالفقار علی خاں کے مہاجن امی کرن سے دو ہزار روپے لے کر اور زادِ سفر سے لیس غالبؔ کلکتے کے سفر پر روانہ ہوئے۔

غالب نے محمد علی خاں کو دو خطوط میں باندہ سے الہ آباد کے سفر کے حالات لکھے ہیں۔ باندہ سے نکل کر غالبؔ کی پہلی منزل مودھا تھی۔ غالبؔ لکھتے ہیں:۔

''جمعرات کے دن مودھا پہنچا۔ اتوار تک آرام کیا اور بروز پیر سفر پر روانہ ہوگیا۔ رات ایک گاؤں میں گزاری۔ منگل کو چلہ تارا پہنچا۔ للہ الحمد۔ بخار اتر گیا اور سر کا درد بھی باقی نہیں رہا۔ آج کی رات چلہ تارا میں گزاروں گا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب بخار اور دردِ سر نہیں رہا۔ اگر زندگی باقی ہے تو کل صبح فتح پور تک کا راستہ طے کروں گا۔''[11]

غالبؔ نے ایک اور خط میں نواب محمد علی خاں کو لکھا ہے:

''قبلۂ جان و دل سلامت، آداب کورنش کے بعد اپنا حال بیان کرتا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ دردِ سر اور بخار جو باندہ تک ساتھ تھا، اب اُس سے نجات مل گئی ہے۔ کچھ کمزوری باقی ہے، یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ جب دہلی سے روانہ ہوا تھا تو یہ دونوں مرض لاحق تھے۔ پورے سفر میں ان امراض سے نجات نہیں ملی ...... مختصر یہ کہ میں پیر کو مودھا سے روانہ ہوا۔ ایک چھکڑا، جسے اس علاقے میں لڑھیا کہتے ہیں، سامان لے جانے کے لیے کرائے پر لیا۔ یہ چھکڑا تو مجھ سے بھی زیادہ کمزور و ضعیف نکلا۔ آہستہ خرام بلکہ مخرام کی حالت تھی۔ بارہ کوس کا سفر بھی طے نہ کرسکا۔ (دن بھر میں) مودھا سے چلّہ تارہ تک نہ پہنچ سکا۔ مجبوراً راستے میں ایک گاؤں میں رات گزارنی پڑی۔ منگل کی آخرِ شب روانہ ہوا اور دوپہر کو چلّہ تارہ پہنچا۔ (اور یہ چھکڑہ) جس کی حالت ہیچ مخرام کی تھی، رات کا ایک پہر گزرنے ہی پر مجھ تک پہنچا۔ ملازموں نے ابھی چراغ روشن نہیں کیے تھے۔ میں نے رات کے اندھیرے میں خط لکھا۔ چوں کہ

باندے میں مرزا مغل نے فرمایا تھا کہ مولوی صاحب (نواب محمد علی) کے نام کا خط چلّہ تارا کے تھانے دار کو دے دوں، وہ پہنچا دیں گے۔ اتفاق سے میں چلّہ تارا کے کارواں سرائے میں آخر روز بلکہ اوّل شب لڑھیے اور اُس کے ساتھ آنے والے لوگوں کا انتظار کر رہا تھا کہ ناگاہ تھانے دار کارواں سرائے میں آگیا۔ اُس نے اِدھر اُدھر ٹہلنا شروع کیا۔ میں نے ارسالِ خط کے سلسلے میں اُس سے مدد مانگی۔ اگر چہ اُس نے (میری درخواست) قبول کر لی لیکن ایسے کمینے پن کے انداز کے ساتھ کہ اگر وہ (میری درخواست) قبول نہ کرتا تو بہتر ہوتا۔ چناں چہ دل نہ مانا اور میں نے اُسے خط دینا گوارا نہ کیا۔ جب ایک مسافر نے، جن کے حالات سے میں واقف نہیں، مجھ سے آپ کا نام سنا تو بڑی عاجزی وانکساری سے وہ خط مجھ سے مانگا۔ وہی چند سطریں جو میں نے جلدی میں اندھیرے میں لکھی تھیں، اُن کے سپرد کر دیں لیکن اگر اُس اطاعت نامے کے پہنچنے کی حالت بھی وہی ہے، جو اس چھکڑے کی ہے تو پھر یہ خط باندہ اُسی وقت پہنچے گا، جب میں (یہ عاصی) کلکتے پہنچوں گا۔ اس سے کم وقت میں اس خط کا چلّہ تارا سے باندہ پہنچنا ممکن نہیں۔ **واللہ علیٰ کُلِ شئ قدیر۔**

مختصر یہ کہ گردونِ دوں (گردوں چھکڑے اور آسمان دونوں کو کہتے ہیں) کے ظلم وستم سے تنگ آکر میں نے خود کو دریا میں ڈال دیا یعنی اس مقام سے میں نے کشتی کرائے پر لی۔ تمام سامان گھوڑے اور ساتھ چلنے والے لوگوں کو کشتی میں بھر کر بسم اللہ، مجریہا ومرسہا پڑھ کر دریائے جمنا میں سفر کر رہا ہوں۔ میں بنارس میں جو وقت گزارنا چاہتا تھا اب ارادہ ہے کہ وہ الہ آباد میں گزاروں۔ یہاں چند روز آرام کر کے ضروری سامان فراہم کرنے کے بعد آگے کا سفر شروع کر دوں اور پھر مرشد آباد اور بنگال کے سوا کہیں اور قیام نہ کروں۔ دریا کے سفر کا حال دو تین دن میں معلوم ہو جائے گا۔ کشتی بان کہتے ہیں کہ تین دن میں الہ آباد پہنچ جائیں گے، دیکھیے کیا ہوتا

ہے۔آج چہار شنبہ ہے، آدھا دن گزر چکا ہے۔ کشتی میں بیٹھا ہوا، ناخدا سے نہیں، خدا سے دل لگائے ہوئے ہوں۔ زیادہ حدِ ادب۔" [۱۲]

کشتی بانوں نے غالبؔ کو یقین دلایا تھا کہ تین دن میں الہ آباد پہنچ جائیں گے لیکن یہ کشتی ۲۷ رنومبر بروز منگل الہ آباد پہنچی۔

اوپر جو خط نقل کیا گیا ہے، اس میں غالبؔ نے لکھا ہے کہ وہ بنارس میں جو دن گزارنا چاہتے تھے، اب الہ آباد میں گزاریں گے۔ اس شہر سے ضروری سامان فراہم کرکے آگے کے سفر پر نکلیں گے۔ غرض یہ ہے کہ غالبؔ کشتی کے ذریعے چلّہ تارا سے روانہ ہوکر الہ آباد پہنچے لیکن اِلہ آباد میں نہ جانے کیا ہوا کہ غالبؔ نے چوبیس گھنٹے سے زیادہ یہاں قیام نہیں کیا۔

مالک رام صاحب نے غالبؔ کے اس سفر پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:-

"غالب کے ایک فارسی قصیدے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس سفر میں دو ہنگامے پیش آئے۔ پہلا الہ آباد میں دوسرا کلکتے میں۔ الہ آباد والے قضیے کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوسکا، ہاں کلکتے کے معرکے سے متعلق ان کی تحریروں میں کافی تفصیل موجود ہے۔" [۱۳]

مالک رام صاحب مرحوم نے جس فارسی قصیدے کا حوالہ دیا ہے۔ اُس کا ایک شعر ہے:-

نفس بلرزہ زِ بادِ نہیبِ کلکتہ
نگاہ خیرہ ز ہنگامۂ الہٰ آباد

اس شعر سے بظاہر یہی مطلب نکلتا ہے کہ کلکتے کی طرح الہ آباد میں بھی کوئی ادبی معرکہ ہوا تھا۔

مالک رام صاحب کی کتاب "ذکرِ غالبؔ" پر تبصرہ کرتے ہوئے قاضی عبدالودود نے لکھا ہے:-

" نفس بلرزہ زبادِ نہیب کلکتہ
نگاہ خیرہ ز ہنگامۂ الہٰ آباد

"غالبؔ کے اس شعر کی بنا پر (مالک رام نے) لکھا ہے کہ سفر کلکتہ میں غالب کے خلاف ایک ہنگامہ الہ آباد میں بھی ہوا تھا۔ مجھے شبہہ

ہے کہ اس کا تعلق کسی نہ کسی طرح غلام امام شہید سے تھا۔ میں اس وقت تک یہ کہنے سے قاصر ہوں کہ "ہنگامۂ الہ آباد" سے غالب کی کیا مراد ہے لیکن یہ شعر کلیاتِ فارسی طبع اول میں موجود ہے۔"[۱۴]

یہ حقیقت ہے کہ غالبؔ، غلام امام شہیدؔ سے خوش نہیں تھے۔ بقول قاضی عبدالودود شہیدؔ کی جو قدر حیدرآباد میں ہوئی۔ وہ غالب کو بہت ناگوار گزری۔ غالبؔ نے اپنے ایک شاگرد محمد حبیب اللہ ذکا کو ۲۶/اگست ۱۸۶۳ء کے ایک خط میں لکھا تھا:-

"اب سنتا ہوں کہ مولوی غلام امام شہید شاگردِ قتیل وہاں کوسِ انا و لاغیری بجا رہے ہیں اور سخن ناشناسوں کو اپنا زور دکھا رہے ہیں۔"[۱۵]

غلام امام شہیدؔ الہ آباد کے تھے۔ ممکن ہے کہ الہ آباد میں غالبؔ کا قیام شہیدؔ کے ہاں ہوا ہو اور ممکن ہے کہ پہلے ہی دن شہید سے غالبؔ کی کسی معاملے میں تلخ کلامی ہو گئی ہو۔ غالب نے محمد علی خاں کو جو خط لکھا تھا، جس کا متعلقہ اقتباس آگے نقل کیا جائے گا۔ اُس میں یہ فقرہ خاص طور سے قابلِ غور ہے۔ غالب نے لکھا ہے کہ الہ آباد میں "شائستۂ مردمِ بزم" بھی نہیں ہیں۔ ان الفاظ کا بظاہر یہ مطلب نکلتا ہے کہ الہ آباد میں ایسے لوگ نہیں ہیں جو محفل میں شریک ہونے کے قابل ہوں۔ یہ بات تو اسی وقت کہی جا سکتی ہے، جب الہ آباد کی کسی محفل میں غالب کے ساتھ کسی کا رویہ غیر شائستہ اور غیر مہذب رہا ہو۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب جس دن الہ آباد پہنچے تھے، ممکن ہے اسی دن کوئی ادبی محفل منعقد ہوئی ہو اور اس محفل میں غلام امام شہید شریک ہوئے ہوں۔ شہیدؔ قتیلؔ کے شاگرد تھے۔ ممکن ہے غالبؔ کی شہیدؔ یا کسی اور سے تلخ کلامی ہو گئی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس تلخ کلامی میں شہید نے قتیلؔ کی تعریف کی ہو یا اُن کے اشعار سند کے طور پر پیش کیے ہیں لیکن یہ سب میرا قیاس ہے۔ اس کے لیے شواہد موجود نہیں ہیں۔

غالبؔ کو اس شہر میں اپنی مطلوبہ دوائیں نہیں ملیں۔ یہاں کے لوگ غالبؔ کو غیر شائستہ اور غیر مہذب لگے۔ محمد علی خاں کے نام ایک خط میں غالب نے الہ آباد کے بارے میں اپنے تاثرات ان الفاظ میں بیان کیے ہیں:-

"ساتویں دن، میں اُس ویرانے (الہ آباد) میں پہنچا۔ آہ از الہٰ آباد۔ ایسے خرابے پر خدا کی لعنت۔ کہ جہاں بیمار کے لیے کوئی دوا نہ ملے، نہ کوئی اور چیز ملے۔ لوگ آدابِ محفل سے ناواقف ہیں۔

عورتوں اور مردوں میں محبت اور مرّ وت نہیں ۔ اس شہر کی آبادی روسیاہی کا سبب ہے۔ برباد شہر ہے ۔ اس ہولناک وادی کو شہر کہنا بے انصافی ہے (یہاں فارسی متن الجھا ہوا ہے ، جو بظاہر متن نقل کرنے والے کی کوتاہی کا نتیجہ ہے) غالبؔ کی مراد یہ ہے کہ اس شہر میں انسانوں کے ساتھ بھوت رہتے ہیں ۔ چوں کہ اس شہر کو صحن جہنم کا مقابل ٹھہراتے ہیں ۔ اس لیے وہ آگ سے بھر گیا ہے ۔ الہ آباد نے خود کو بنارس کے قریب پہنچا دیا ہے اور گنگا کو الہ آباد کی شفاعت کے لیے اُس کی طرف روانہ کیا ہے ۔

ہر چند اس روسیاہ (الہ آباد) کی طرف دیکھنا بنارس کی طبعِ نازک پر گراں ہے ۔ لیکن چوں کہ دونوں کے درمیان گنگا ہے ، اس لیے الہ آباد کے دل کو تقویت حاصل ہے ۔

خدا کی قسم اگر (دہلی کو) میری واپسی الہ آباد سے گزرنے پر منحصر ہو تو میں ترکِ وطن کردوں گا اور واپس نہ جاؤں گا۔

قصہ مختصر ایک رات اور ایک دن اُس بھوت پریت کے شہر میں اس لیے گزارے کہ وہاں بار برداری کے ذرائع نہیں مل سکے تھے ۔ اس جرم میں مجھے الہ آباد میں قید میں رہنا پڑا ۔'' [۱۶] (فارسی سے ترجمہ)

غالبؔ نے الہ آباد میں ایک دن اور ایک رات ہی قیام کیا ۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ بقول غالبؔ:

'' دوسرے دن ایک بیل گاڑی کرائے پر مل گئی ۔ صبح کے وقت گنگا کے ساحل پر پہنچ گیا ۔ ہوا کی طرح تیزی سے پانی پر سے گزرا (گنگا پار کر لی) پائے شوق کے ساتھ بنارس کی طرف سرگرم سفر ہو گیا ۔ جس دن بنارس پہنچا ، بادۂ جانفزا ، اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا ، مشرق کی طرف سے چل رہی تھی ، جس سے میری جان کو طاقت ملی اور دل میں تازگی پیدا ہو گئی ۔ اُس ہوا کے اعجاز نے اس غبار کو (یعنی میرے جسم کو) علمِ فتح کی طرح بلند کر دیا ۔'' [۱۷]
(فارسی سے ترجمہ)

غالبؔ الہ آباد سے روانہ ہوکر بنارس پہنچ گئے تھے۔

غالبؔ نے دہلی کے اپنے ایک دوست رائے چھج مل کو ایک خط لکھا تھا، جس میں وہ قطعہ نقل کیا، جو غالبؔ نے بنارس پہنچنے پر کہا تھا۔ خط میں غالبؔ نے لکھا ہے:-

''رائے صاحب مشفقِ شفیق تھکے ہاروں کے غم خوار اور تباہ حال لوگوں کے مددگار۔ سلامت رہیں۔ کیا لکھوں؟ میرے پاس لکھنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اگر (جسم کے) اندر کی بات کروں تو معدے اور آنتوں کی بیماری بدستور ہے اور وہی برودتِ جگر، حرارتِ قلب کی کمزوری ہے اور اگر باہر کی بات کروں تو وہ اس سے بھی زیادہ ہے:

قطعہ

مغلوبِ سطوتِ غمِ دل، غالبؔ حزیںؔ

کاندر تنش ز ضعفِ تواں گفت، جاں نبود

گویند زندہ تا بہ بنارس رسیدہ است

مارا بدیں گیاہِ ضعیف ایں گماں نبود

اس خط کے ساتھ تین خط منسلک ہیں۔ ایک جناب مبارز الدولہ نواب حسام الدین حیدر خاں بہادر کے نام، ایک مولوی فضل حق کے نام اور ایک غالبِ ناکام کے غم خانہ بدتر از ویرانہ کے لیے ہے۔ (یعنی غالبؔ کے گھر والوں کے لیے)۔ یہ خطوط انھیں پہنچا دیں اور اپنے مخلص کو ممنون عنایت فرمائیں۔ زیادہ ازیں زیادہ است۔'' ۱۸ (فارسی سے ترجمہ)

جس دن غالبؔ بنارس پہنچے، مشرق سے بادۂ جاں فزا اور نسیم سحر چل رہی تھی، جس سے جان میں توانائی آئی اور دل کو طمانیت نصیب ہوئی۔

غالبؔ نے محمد علی خاں کے نام ایک خط میں بنارس کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:-

''بنارس کی ہوا کے اعجاز نے میرے غبارِ وجود کو علمِ فتح کی طرح بلند کر دیا اور وجد کرتی ہوئی نسیم کے جھونکوں نے میرے ضعف اور کمزوری کو بالکل دور کر دیا مرحبا! اگر بنارس کو اس کی دل کشی اور دل نشینی کی وجہ سے میں سویدائے عالم کہوں تو بجا ہے۔ مرحبا۔ اس شہر کے چاروں طرف سبزہ وگل کی ایسی کثرت ہے کہ اگر اسے زمین پر بہشت سمجھوں تو روا ہے۔ اس کی ہوا کو یہ خدمت سونپی گئی ہے کہ وہ مردہ جسموں میں روح پھونک دے۔ اس کی خاک کا ہر ذرہ راہرو کے پاؤں سے پیکانِ خار باہر کھینچ لے۔ اگر گنگا اس کے پاؤں پر اپنا سر نہ رگڑتا تو ہمارے دلوں میں اُس کی اتنی قدر نہ ہوتی۔ اگر سورج اس کے در و دیوار سے نہ گزرتا تو اتنا تابناک اور منور نہ ہوتا۔ بہتا ہوا دریائے گنگا اُس سمندر کی طرح ہے، جس میں طوفان آیا ہوا ہو۔ یہ دریا آسمان پر رہنے والوں کا گھر ہے۔ (اس سے غالبؔ کی غالباً مراد یہ ہے کہ اس دریا کی لہریں آسمان کو چھوتی ہیں)۔ سبزہ رنگ پری چہرہ حسینوں کی جلوہ گاہ کے مقابلے میں قدسیانِ ماہ تابی کے گھر کتاں کے معلوم ہوتے ہیں۔ اگر میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک اُس شہر کے عمارتوں کی کثرت کا ذکر کروں تو وہ سراسر مستوں سے آباد ہیں اور اگر اس شہر کے اطراف سبزہ وگل کا بیان کروں تو دور دور تک بہارستان نظر آئے۔''[19] (فارسی سے ترجمہ)

غالبؔ لکھتے ہیں:-

''اس تماشا گاہ میں دلفریبی کا یہ عالم ہے کہ پردیس میں ہونے کا غم دل سے دور ہوگیا ہے۔ اس صنم کدے سے جب جب ناقوس کی نشاط آفریں آواز بلند ہوتی ہے تو عجب سرور وکیف کا عالم ہوتا ہے۔ بادۂ تماشا سے میرا ذوق اس قدر مخمور ہوگیا ہے کہ دہلی کی یاد بھی دل سے جاتی رہی۔ یہ عجیب صورتِ حال درپیش ہے۔ اگر دشمنوں کی خندہ زنی کا خوف نہ ہوتا تو میں ترکِ دین کر کے تسبیح توڑ دیتا، قشقہ لگا لیتا اور جنیو پہن لیتا اور اس وضع کے ساتھ اُس وقت تک گنگا کے کنارے بیٹھا رہتا جب تک کہ آرائشِ ہستی کی گرد نہ دُھل جاتی اور

قطرے کی طرح دریا میں نہ سما جاتا۔

اس ارم آباد میں قدم رکھتے ہی میں نے کوئی علاج کیا نہ کوئی دوا کھائی۔ پھر بھی نئے امراض کی تشویش بھی دل سے دور ہوگئی۔ بلکہ میں یہ دعویٰ کرسکتا ہوں کہ اصل مرض میں بھی کچھ افاقہ ہوگیا ہے۔ جو دوائیں کھا رہا ہوں، اُس کی وجہ آیندہ کے لیے محض احتیاط ہے، ورنہ اس وقت صورتِ حال یہ ہے نہ تلافیِ ماضی منظور ہے اور نہ رعایتِ حال۔

میرے قبلہ! آپ کے دل میں یہ خیال نہ گزرے کہ اپنی خیرہ سری اور پریشاں نظری کی وجہ سے غالب بنارس میں اس طرح پھنس گیا ہے جیسے مکھی شہد میں یا گدھا دلدل میں پھنس جائے۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ مجھ جیسے فلک زدہ اور گرفتارِ مصیبت کے لیے کہیں اقامت کا تصور بھی ممکن نہیں۔ سیر وتفریح کا کسے ہوش۔ بات یہ ہے کہ مجھے یہاں قیام کرنا پڑا تاکہ جن دواؤں کی ضرورت رہتی ہے وہ حاصل کروں اور کچھ ایسا رختِ سفر فراہم کروں، جس کی سردی کے موسم میں ضرورت پڑتی ہے۔ سرائے نیرنگ میں، جو عرفِ عام میں، سرائے نورنگ آباد کے نام سے مشہور ہے پانچ دن بے وجہ گزار دیے۔ اُس کے بعد اسی محلے میں اُسی کارواں سرائے کے عقب میں ایک مکان مل گیا۔ یہ مکان بخیل کی قبر سے بھی زیادہ تنگ و تاریک ہے۔ یہاں سامانِ سفر کھول کر ایک طرف لیٹ گیا۔ ہرچند دواؤں کو ملا کر جوش دینا ایسا ہے جیسے کسی کپڑے کے پیوند پر پیوند لگانا۔ اس کے لیے وقت درکار ہے۔ ابھی کم سے کم چار ہفتے اور میرا اس شہر میں قیام ہوگا۔ جو ہفتہ یہاں غفلت میں گزر گیا، وہ انھی چار ہفتوں میں محسوب ہوگا۔

ابھی تک پریشان ہوں کہ آگے کا سفر خشکی سے کروں یا دریا کے راستے۔ یوں سمجھ لو کہ آگ اور پانی میں گھرا ہوا ہوں۔ کبھی سوچتا ہوں عظیم آباد تک خشکی کے راستے جاؤں اور وہاں سے کرائے پر کشتی

لوں اور کبھی خیال آتا ہے کہ یہیں سے دریا کے راستے جاؤں۔ اب آپ سے یہ امید ہے کہ آوارگانِ دشت بلا کی مدد فرمائیں اور انگریزی ڈاک سے فوراً خط ارسال فرمائیں ۔ خط اس انداز سے لکھیں کہ جس سے آپ کے پورے حالات کا علم ہو سکے ۔ ایسا خط نہ ہو، جس کے آغاز میں خیریت و عافیت تحریر ہو اور بس ۔ خدا جانتا ہے کہ میں آپ کو اکثر یاد کرتا رہتا ہوں ۔

انشاء اللہ العزیز، میں آپ کے خط کے جواب میں جو خط لکھوں گا، اُس میں یہاں سے روانگی کی تاریخ لکھوں گا اور یہ بھی لکھوں گا کہ میں کس راستے سے آگے جاؤں گا۔

ہر چند میں اصرار کر رہا ہوں کہ آپ خط ضرور تحریر فرمائیں ۔ لیکن دل گمنامی اور ہیچ کسی کی شرم سے ہزار خنجروں سے زخمی ہے ۔ کیوں کہ میں جس مکان میں مقیم ہوں، وہ ایک بوڑھی عورت کا ہے ۔ وہ اتنی غریب ہے کہ اُس کے چراغ میں تیل بھی نہیں ہے ...... اُس گاؤں کی طرح ہے جو خراج کی ادائیگی کے خوف سے ویران ہو گیا ہو ۔ اس کے آس پاس کوئی بازار ہے اور نہ کوئی شان دار گھر، جس کے حوالے سے لوگ یہ مقام تلاش کر سکیں ۔ لہذا خط کا پتا کیا لکھا جائے ۔ کوئی نامہ بر،، خواہ وہ پیکِ خیال ہی کیوں نہ ہو ۔ کس پتے سے یہاں پہنچے گا۔

مخدومی ! مکتوب کو مکتوب الیہ کے ساتھ خدا کے سپرد کر کے یہ پتا تحریر فرمادیں ۔

محلّہ نو رنگ آباد ۔ عقب سرائے نو رنگ آباد، قریب حویلی گوسی خانساماں مٹھالی اور میاں رمضان کی حویلی میں ۔ اسد اللہ غریب الوطن تازہ وارد کو ملے ۔،،[۲۰] (فارسی سے ترجمہ)

غالبؔ جب بنارس پہنچے ہیں تو پانچ دن تک سرائے نیرنگ آباد میں، جسے عام طور پر نورنگ آباد کہتے ہیں، مقیم رہے۔ اس کے بعد اُنھوں نے نورنگ آباد کے عقب میں میاں رمضان اور مٹھالی کی

حویلی میں گوسی خانساماں کی حویلی سے ملحق ایک مکان کرائے پر لے لیا۔''[۲۱]

جن دنوں غالبؔ بنارس میں تھے بظاہر اُن کا کوئی سرپرست، مداح، عقیدت مند یا شاگرد اُس شہر میں نہیں تھا۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ غالب نے بنارس میں اتنے دن کیوں قیام کیا اور بنارس کی اتنی تعریف کیوں کی۔ غالبؔ بنارس میں گمنام زندگی گزار رہے ہوں۔ یہ اُن کے مزاج کے قطعاً خلاف تھا۔

تقریباً چار ہفتے بنارس میں قیام کر کے غالبؔ گھوڑے پر سوار ہو کر سڑک کے راستے پٹنہ اور وہاں سے مرشد آباد پہنچے۔

غالبؔ کے لیے بنارس شہر کی حیثیت اس نخلستان کی تھی جو تپتے ہوئے ریگستان میں طویل سفر کے بعد مسافر کے لیے فردوسِ بریں کا درجہ رکھتا ہو جس کا ٹھنڈا پانی، ٹھنڈی ہوائیں اور درختوں کی حیات بخش چھاؤں جسم اور روح کے جلتے ہوئے زخموں پر مرہم کا کام کرتی ہے۔

غالبؔ جب چلّہ تارا سے الہ آباد کے لیے روانہ ہوئے ہیں تو اُن کے ساتھ گھوڑا بھی تھا۔ جیسا کہ نواب محمد علی خاں کے نام خط میں غالبؔ نے لکھا ہے کہ ''ایک کشتی کرایے پر لی اور گھوڑا اور آدمی اور سامان، سب اس میں جیسے تیسے ڈالے۔''

غالبؔ نے باندے سے مودھا تک کا سفر بیل گاڑی پر چلّہ تارا سے الہ آباد تک کشتی میں سفر کیا تھا۔ غالب نے باندہ اور زیادہ اِمکان ہے کہ مودھا میں گھوڑا خریدا تھا۔ یہ وہی گھوڑا ہے جسے کلکتے میں مالی حالت خستہ ہونے پر غالبؔ نے ڈیڑھ سو روپے میں فروخت کر دیا تھا۔

اس لڑھیا پر غالبؔ مودھا سے چلّہ تارا کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ لڑھیا اتنی آہستہ چلتی تھی کہ وہ مودھا اور چلّہ تارا کے درمیان چوبیس میل کا راستہ ایک دن میں طے نہیں کر سکی۔ غالبؔ کو مجبوراً راستے میں ایک گاؤں میں قیام کرنا پڑا۔ دوسرے دن علی الصبح غالب گھوڑے پر سوار ہو کر اگلے سفر پر روانہ ہو گئے۔''

غالبؔ نے اپنے ایک دوست خواجہ فخر اللہ کے نام خط میں دہلی سے کلکتے تک کے سفر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مختصر یہ کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہونا چاہتا تھا۔ مجھے اس جرم میں کیسے کیسے برے دن دیکھنے پڑے۔ چاہتا تھا کہ اپنے ہاتھ سے لیلائے مراد کی زلف سنواروں۔ اس خطا کی پاداش میں دنیا کی کون سی ایسی مصیبت تھی، جو میں نے نہ جھیلی ہو۔ دشمن کے اثر ورسوخ اور دبدبے کے خلاف آہ و زاری کرتے تلوار کی دھار پر سینے کے بل چلتے ہوئے کلکتے پہنچا۔''

طویل بیماری کے بعد جب غالبؔ بنارس پہنچے تو انھیں اچانک بیماری سے نجات مل گئی۔ وہ ایک مہینے بنارس میں رہے۔ اس شہر کی حیثیت غالبؔ کے لیے اس نخلستان کی بن گئی جو تپتے ہوئے ریگستان میں طویل سفر کے بعد مسافر کے لیے فردوسِ بریں کی حیثیت رکھتا ہے، جس کا ٹھنڈا پانی، ٹھنڈی ہوائیں اور درختوں کی حیات بخش چھاؤں جسم اور روح کے جلتے ہوئے زخموں پر مرہم کا کام کرتی ہے۔

مثنوی چراغِ دیر

اس انتہائی تکلیف دہ سفر کی دین غالبؔ کی مثنوی 'چراغ دیر' ہے، جس کا شمار ہندوستان کے فارسی ادب کے اعلا شہ پاروں میں ہوتا ہے۔ بنارس پر مختلف زبانوں میں نظم ونثر دونوں میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے لیکن کہا جاتا ہے کہ بنارس شہر کو شاید ہی کسی اور نے غالب سے بہتر خراجِ تحسین پیش کیا ہو۔ ایک سو آٹھ شعروں کی اس مثنوی میں بنارس کی تمام روحانی اور مادّی خوبیوں کا غالب نے جس حسن وخوبی سے احاطہ کیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔

دہلی کو خیر باز کہے غالبؔ کو تقریباً چھ مہینے ہو چکے ہیں۔ وہ اپنے عزیزوں، دوستوں اور شہر دہلی کو یاد کر کے تڑپ اُٹھتے ہیں جس کا مکمل اظہار اس مثنوی میں ہوا ہے۔

مثنوی چراغِ دیر

''چراغِ دیر'' جیسی مثنوی کا مصنف وہ ہی شاعر ہوسکتا تھا، جسے تہذیبی اور ادبی ورثے میں فارسی اور اردو شاعری کی سیکولر روایات اور مذہبی رواداری ملی ہو اور جس کا ایمان ہو کہ دنیا کے مذاہب کے بنیادی عقائد ایک ہی ہیں۔

مثنوی کا متن فارسی میں ہے۔اس کے اردو نثر اور نظم دونوں میں خاصی تعداد میں ترجمہ ہوئے ہیں۔ میری نظر میں ڈاکٹر حنیف نقوی کا منظوم ترجمہ بہترین ہے۔ڈاکٹر حنیف نقوی کے ترجمے میں ایسی شگفتگی ، تازگی اور روانی ہے کہ اس میں تخلیقی شان پیدا ہوگئی ہے۔ اس لیے میں نے اس کتاب میں ڈاکٹر حنیف نقوی کے اردو منظوم ترجمے کے اشعار پیش کیے ہیں اور پوری مثنوی بھی نقل کی ہے۔ حنیف صاحب کا شکرگزار ہوں جنھوں نے مجھے مثنوی کا اپنا ترجمہ نقل کرنے کی تحریری اجازت دی۔

ڈاکٹر ظ۔انصاری نے اس مثنوی کا بہت ہی سادہ اور سلیس نثر میں ترجمہ کیا ہے۔میں نے اس نثری ترجمے سے بھی استفادہ کیا ہے اور ظ۔صاحب کے بعض تراجم نقل بھی کیے ہیں۔

مثنوی کے ابتدائی اشعار میں غالب کہتے ہیں:-

"آج یہ عالم ہے میرا دم صورِ قیامت کے ہم آواز ہے اور خاموشی میں رازوں کی قیامت برپا ہے۔ یہ راز زبان پر آنے کے لیے بے قرار ہیں۔ میں پتھر کی رگ ہوں ، چنگاریاں میرے قلم سے نکلتی ہیں۔ مٹھی بھر خاک ہوں (دل کا) غبار لکھ رہا ہوں۔ میرا دل شکایتوں سے ابل رہا ہے۔ایک حقیر بلبلے میں طوفان کی شورش ہے۔

مثنوی کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے:-

خموشی آج دمسازِ فغاں ہے
نفَس پر صورِ محشر کا گماں ہے
شرر ساماں رگِ خارا صفت ہوں
غبار آسا خرابِ شش جہت ہوں
زباں پر روح فرسا اک بیاں ہے
نفَس خوں ہے، جگر آتش بجاں ہے
گلہ ہے دوستوں کی بے رخی سے
کتاں سینہ سپر ہے چاندنی سے

وہ گوہر ہوں جو دریا سے جدا ہے

وہ جوہر جس کو آہن نے تجا ہے

غالبؔ کو اہلِ وطن کی بے وفائی اور ظلم وستم یاد آتے ہیں۔ انھیں احساس ہے کہ وطن والوں میں سے کوئی میرا ہمدرد نہیں رہا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے دنیا میں ان کا کوئی وطن ہی نہیں۔ غالبؔ کو دہلی کے تین دوست بہت یاد آرہے تھے۔ وہ دوست تھے فضلِ حق خیر آبادی حسام الدین حیدر خاں اور نواب امین الدین احمد خاں۔ پھر غالبؔ دہلی سے بے زاری کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

ہوا ہوں گھر سے میں ہر چند بے گھر

بھلایا مجھ کو ان لوگوں نے کیوں کر

چمن کے چھوٹنے کا رنج کم ہے

مجھے بے مہریِ یاراں کا غم ہے

اگر چھوٹا جہاں آباد، غم کیا

جہاں آباد، گنجایش ہے کم کیا

چمن میں بہرِ تعمیرِ نشیمن

بہت ہے ایک شاخِ گل کا دامن

اس وقت غالبؔ کی نظر میں وہ ''شاخِ گل کا دامن'' جس پر غالبؔ اپنا آشیانہ بنا سکتے تھے۔ بنارس شہر تھا۔ اس شہر کی تعریف میں غالبؔ کہتے ہیں:-

نظر میں آج ایک ایسا چمن ہے

جو رنگ و نورونکہت کا وطن ہے

وہاں تک جب سے پائی ہے رسائی

نگہ کو دعویِ گلشن ادائی

یہ اس کے وصف کا فیضِ نمو ہے
زباں جنت طرازِ گفتگو ہے
بنارس نام اُس کا ، چشمِ بد دور
بہشتِ خرّم و فردوسِ معمور
مناظر اس کے ہیں اتنے دل افروز
سلام آتے ہیں ، دلّی کے شب و روز

اس کے بعد غالب تناسخ کے عقیدے کے بارے میں کہتے ہیں کہ جو لوگ تناسخ کے فلسفے کے ماننے والے ہیں ، اُن کا عقیدہ ہے بنارس ایسا مقدس شہر ہے کہ جن لوگوں کی روح اس سرزمین پر تنِ خاکی سے پرواز کرتی ہے ، انھیں آواگون سے نجات مل جاتی ہے ۔ بقول غالب :-

تناسخ پر ہے جن لوگوں کا ایماں
وہ ہیں یوں ارضِ کاشی کے ثنا خواں
نکلتی ہے یہاں جب روح تن سے
تو پاتی ہے نجات آواگون سے
بہار آتی ہے نخلِ آرزو پر
حیاتِ جاوداں ملتی ہے مرکر

جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ بنارس آنے سے پہلے غالبؔ طویل عرصے تک بیمار رہے تھے ، لیکن بنارس پہنچے تو انھیں اس شہر کی آب و ہوا ایسی راس آئی کہ مرض میں بڑی حد تک افاقہ ہوگیا ۔ اس لیے غالب بنارس کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

''پھولوں کی اس سرزمین پر میرا دل آیا ہے ۔ کیا اچھی آبادی ہے ، جہاں بہار کا چلن ہے ۔ یہ وہ مقام ہے کہ دہلی جیسا شہر اس کا طواف کرنے آتا ہے ۔ سبحان اللہ ، بنارس کو خدا نظر بد سے بچائے ۔ یہ

ایک مبارک جنت ہے، یہ بھرا پرا فردوس ہے۔ اس شہر کی گھانس پھونس بھی گویا باغ ہے اور اس کا گردو غبار بھی روح کا لطیف غبار ہے۔ دنیا کے اس پرانے بت کدے میں، جو ہمیشہ رنگ بدلتا رہتا ہے، بنارس کی بہار رنگ کی تبدیلی سے محفوظ ہے۔ چاہے بہار کا موسم ہو، خزاں کا ہو یا گرمی کا، ہر موسم میں یہاں کی فضا جنت بنی رہتی ہے۔''

اس مثنوی میں ایک اور مقام پر بنارس کی تعریف کس خوب صورت انداز میں کی ہے۔ غالب کہتے ہیں:-

بنارس شاہدِ رنگیں قبا ہے
یہ گنگا، اُس کا گویا آئنہ ہے
فلک نے رکھ کے حسن اس کا نظر میں
جڑا ہے آئنہ سورج کا زر میں
خدا رکھے یہ شانِ حسنِ کامل
نہیں جز آئنہ جس کا مقابل
یہ جلوہ گاہِ حسنِ لا ابالی
جہاں میں ہے مثالِ بے مثالی
خوشا گنگا میں یہ پرتو فشانی
بنارس خود بنا ہے اپنا ثانی
دراصل اس رونمائی کے بہانے
اتاری ہے نظر دستِ قضا نے
کہ ہے ارژنگِ چیں میں سحر ایسا
نہ ہے دنیا میں کوئی شہر ایسا

چمن اس کے بیاباں در بیاباں

بہار اس کی گلستاں در گلستاں

غالبؔ نے دو شعروں میں بنارس کو بت پرستوں کا حرم، زیارت گاہِ مستاں، عبادت خانۂ ناقوسیاں اور کعبۂ ہندوستاں کہا ہے:۔

حریم بُت پرستاں ہے یہ خطّہ

زیارت گاہِ مستاں ہے یہ خطّہ

عبادت خانۂ ناقوسیاں ہے

یہ گویا کعبۂ ہندوستاں ہے

غالبؔ بنارس کی تعریف میں طرح طرح کی خوب صورت تشبیہ و استعارے استعمال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''یوں کہو بنارس ایک دلربا حسین ہے جس کے ہاتھ میں سنگھار کے لیے صبح و شام گنگا کا آئینہ رہتا ہے۔ اس پری چہرہ شہر یعنی بنارس کے چہرے کا عکس اتارنے کے لیے آسمان نے سورج کا آئینہ سونے سے بنایا ہے۔ نامِ خدا اس کا حسن و جمال کیسا ہے کہ آئینے میں اس کا عکس رقصاں ہے (گویا بنارس شہر کی کچھ عمارتوں کا جب گنگا میں عکس پڑتا ہے تو وہ لرزتا ہے)۔ جب بنارس شہر نے دریائے گنگا میں اپنا عکس ڈالا تو آپ ہی اپنی نظیر بن گیا اور جب پانی کے آئینے میں اس کی صورت دکھادی تو اب اس کو بری نظر لگنے کا اندیشہ نہیں رہا۔ چین کے ملک میں بنارس جیسا نگارستان نہیں ہوگا۔ چین تو کیا ساری دنیا میں ایسا شہر نہیں ہوگا۔ بنارس شہر کے جنگل جنگل لالہ زار بھرے ہوئے ہیں اور اس کی بہاریں گلستاں در گلستاں ہیں۔''

اس کے بعد غالبؔ بنارس کی تعریف کا ایک نیا پہلو نکالتے ہیں:۔

''میں نے ایک رات ایک ایسے شخص سے جو روشن بیان تھا اور زمانے کی گردشوں کے راز سے واقف تھا۔ پوچھا کہ آپ دیکھتے

ہیں۔ دنیا سے نیکی غائب ہوگئی، وفا، محبت، دل جوئی دنیا میں باقی نہیں رہی۔ ایمان کا صرف نام ہی نام باقی رہ گیا ہے۔ جعل اور فریب کے سوا کام نہیں چلتا۔ باپ بیٹوں کے خون کے پیاسے ہیں اور بیٹے اپنے باپ کی جان کے دشمن۔۔۔ بھائی بھائی سے الجھا ہوا ہے اور محبت ساری دنیا سے غائب ہوتی جارہی ہے۔ پانچ اشعار میں غالب روشن بیان سے اپنا یہ سوال کرکے پوچھتے ہیں کہ قیامت کی ایسی کھلی نشانیاں موجود ہیں۔ پھر قیامت کیوں نہیں آجاتی۔ قیامت کا صور پھونکنے میں اب کاہے کی دیر ہے۔ قیامت کو کس نے روک رکھا ہے۔''

غالبؔ بڑے خوب صورت انداز میں اس روشن بیان انسان کی طرف سے جواب دیتے ہیں کہ:

''وہ بنارس کی طرف اشارہ کرکے مسکرادیا اور اس نے کہا کہ اس شہر کی آبادی قیامت کو روکے ہوئے ہے۔ دنیا کے بنانے والے کو یہ منظور نہیں ہے کہ اس رنگین اور خوب صورت آبادی کو تباہ و برباد کردے۔ بنارس کا وقار اتنا بلند ہے کہ قوتِ خیال اس کی چوٹی تک نہیں پہنچ پاتا۔''

پھر غالبؔ خود مخاطب ہوکر اپنے مصائب و آلام کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

سنبھل اے غالبِ مجبور و لاچار
کہ ناخوش تجھ سے ہیں سب یار و اغیار
برت کر اَقربا سے بے نیازی
جنوں کی کر رہا ہے دل نوازی
نمودِ حشر تیرے آب و گِل سے
دریغ ایسے بشر سے، ایسے دل سے

اگلے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ کے ذہن میں یہ بات آئی تھی کہ وہ بنارس میں مستقل طور پر رہ جائیں۔ لیکن انہیں اپنے اس مقصد کا خیال آیا، جس کے لیے وہ گھر سے نکلے تھے۔ یعنی انہیں کلکتے پہنچ کر اپنی پینشن کے مقدمے کی پیروی کرنی تھی اور پھر انہیں یہ

بھی خیال آیا کہ وطن میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو ان کے منتظر ہیں اور انہیں غالبؔ کے مستقل قیام بنارس سے بہت زیادہ تکلیف ہوگی ۔ پھر غالبؔ خود کو بنارس چھوڑنے پر اس طرح راضی کرتے ہیں :-

گزر ان جلوہ ہائے رہگزر سے
بہشت اپنی بنا خونِ جگر سے
جنوں تیرا اگر ہوجائے کامل
تو ہے کاشی سے کاشاں نصف منزل
نکل مانندِ نکہت پیرہن سے
رہا ہو اس طِلسم جان و تن سے
طریقِ معرفت پر گامزن ہو
نہ رہ پابند ، آوارہ وطن ہو

اور آخر میں غالبؔ کلکتے جانے کے لیے خود کو ان الفاظ میں آمادہ کرتے ہیں :-

بڑھ آگے بن کے سیلِ تند رفتار
بیاباں راہ میں آئیں کہ کہسار
سبق لے قیس کے دیوانہ پن سے
گزر صحراؤں سے ، دشت و دمن سے
تن آسانی کو تاراجِ بلا کر
مداوا رنج کا کر رنج اٹھا کر
فنا کی نذر کر حرص و ہوس کو
ہوا دے آتشِ دل سے نفس کو

جگر کو کاہشِ محنت سے خوں کر
خرد کو کار آگاہِ جنوں کر
حرارت باقی ہے جب تک لہو میں
کمی آئے نہ ذوقِ جستجو میں

شرر بن کر فضاؤں میں بکھر جا تعین کے مراحل سے گزر جا
لگا کر ضربِ ''اِلاّ'' سازِ ''لا'' پر دمِ ''اللہ'' سے حرقِ ماسوا کر

غالبؔ کے عشقیہ واقعات ہم تک بہت کم پہنچے ہیں۔ وہ جس طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور جس ماحول میں رہتے تھے، اس کے پیش نظر یہ ممکن نہیں کہ ان کی پوری زندگی میں صرف ایک دو ہی عشقیہ واقعات ہوں۔۔ عام طور پر غالبؔ کی عشقیہ زندگی کا ایک واقعہ لوگوں کے ذہنوں میں ہے اور وہ ہے غالبؔ کا کسی ڈومنی سے عشق۔

غالبؔ کی زندگی کا دوسرا واقعہ بنارس کا ہے۔ جس طرح ہمیں ڈومنی کا پورا پتا نہیں چلتا۔ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی عورت سے غالب کا عشق ہوا تھا۔ اسی طرح بنارس کے معاملے کا بھی غالبؔ نے اس طرح بیان کیا ہے کہ کوئی واضح بات سامنے نہیں آتی۔

غالبؔ کے بعض اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ بنارس میں کوئی ایسا 'غارت گر ہوش' تھا، جس سے غالبؔ کو عشق ہو گیا تھا۔

قاضی عبدالودود نے غالبؔ کے بنارس کے طویل قیام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''میرا خیال ہے کہ بنارس میں کسی صورت سے تعلق ہو گیا ہوگا۔ طولِ اقامت کی اس کے علاوہ کوئی وجہ قرینِ قیاس نہیں۔ وہ، جیسا کہ خود معترف ہیں، بڑی مبتذل سی جگہ مقیم تھے۔ مگر اس کے باوجود بنارس کی مدح اتنی کی ہے کہ کسی اور جگہ کی نہیں کی۔ بنارس اس کا ہرگز مستحق نہیں۔''[۲۲]

مالک رام صاحب اس مثنوی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

''پھر جس حسن اور رنگینی سے انھوں نے بنارس اور یہاں کے مہ جبینوں کی تصویر کشی کی ہے، وہ بجائے خود قابلِ دید ہے، لیکن اس تصویر میں جو حسن اور رنگینی آئی ہے۔ اس کی واقعیت سے۔ مجھے یقین ہے کہ اس مثنوی میں بہت سے شعر آپ بیتی سے متعلق ہیں اور انھوں نے اس میں اپنے وارداتِ قلب بیان کیے ہیں۔ اس ''غارت گر ہوش'' کو وہ یہاں سے چلے جانے کے بعد بھی بھلا نہیں سکے۔'' ۲۳ے

غالبؔ نے کلکتے میں ۲۲ اشعار کا قطعہ کہا تھا۔ اس میں دہلی سے کلکتے کے راستے کے اُن دو شہروں کا ذکر کیا ہے، جن سے غالب کا گزر ہوا تھا۔ غالبؔ عظیم آباد اور بنارس کے بارے میں اس قطعے میں کہتے ہیں:-

گفتمش '' چوں بُوَد عظیم آباد ''

گفت '' رنگیں تراز فضائے چمن ''

گفتمش '' چیست ایں بنارس '' ؟ گفت

شاہدے مست محو گل چیدن

بنارس سے روانہ ہونے کے بعد طویل عرصے تک غالبؔ اس بتِ طناز کو فراموش نہیں کر سکے۔ انھوں نے کلکتے میں ایک غزل کہی تھی، جس کا مقطع ہے:-

کاش، کاں بتِ کاشی در پذیردم، غالبؔ

بندۂ توام، گویم، گویدم زناز، ''آری''

(کاش بنارس کا وہ حسین بت مجھے قبول کر لے۔ میں کہوں کہ میں تیرا غلام ہوں اور وہ ناز سے کہے کہ بے شک، بے شک)۔

اب غالبؔ کی فارسی مثنوی اور ڈاکٹر حنیف نقوی کا منظوم اردو ترجمہ ملاحظہ ہو:

خموشی آج دمسازِ فغاں ہے
نفس پر صورِ محشر کا گماں ہے
شرر ساماں رگِ خارا صفت ہوں
غُبار آسا خرابِ شش جہت ہوں
دلِ بیتاب ہے شکووں سے پُرجوش
حبابِ بے نوا ہے یم بہ آغوش
زباں پر روح فرسا اک بیاں ہے
نفس خوں ہے، جگر آتش بجاں ہے
حکایت ہے یہ برہم مثلِ گیسو
مرے دعوے پہ شاہد ہر بُنِ مو
گلہ ہے دوستوں کی بے رُخی سے
کتاں سینہ سپر ہے چاندنی سے
نوائے ساز نے پھونکا ہے مجھ کو
مری آواز نے پھونکا ہے مجھ کو
نفس اک رشتۂ سازِ فغاں ہے
تپاں مانندِ نے ہر استخواں ہے
وہ گوہر ہوں جو دریا سے جدا ہے
وہ جوہر جس کو آہن نے تجا ہے
چمن دلّی کا جب قسمت سے چھوٹا
تغافل کیشیِ یاراں نے لوٹا
نہیں کوئی وہاں غم خوار میرا
وطن میرا، نہ اب گھر بار میرا

مگر ہیں تین شخص ایسے وطن میں
کہ جن سے رنگ و رونق ہے چمن میں
وہ فضلِ حق نشانِ فضلِ داور
بجا ہے ناز جس کی دوستی پر
حسام الدین حیدر خاں وہ خوش خو
جسے ایماں کا لکھیے حرزِ بازو
امین الدین احمد خاں وہ دل بند
قبائے جاں کا کہیے جس کو پیوند
ہوا ہوں گھر سے میں ہر چند بے گھر
بھلایا مجھ کو ان لوگوں نے کیوں کر
چمن کے چھوٹنے کا رنج کم ہے
مجھے بے مہریِ یاراں کا غم ہے
اگر چھوٹا جہاں آباد، غم کیا؟
جہاں آباد ، گنجایش ہے کم کیا؟
چمن میں بہرِ تعمیرِ نشیمن
بہت ہے ایک شاخِ گل کا دامن
میسّر ہو اگر اتنا سہارا
وطن سے کیجیے یکسر کنارا
نظر میں آج اک ایسا چمن ہے
جو رنگ و نورونکہت کا وطن ہے
متاعِ فخر و سامانِ سعادت
جہاں آباد کو اس کی زیارت
وہاں تک جب سے پائی ہے رسائی
نگہہ کو دعویِ گلشن ادائی

یہ اس کے وصف کا فیضِ نمو ہے
زباں جنت طرازِ گفتگو ہے
بنارس نام اُس کا، چشمِ بد دور
بہشتِ خرم و فردوسِ معمور
کسی نے چین اس کو کہہ دیا تھا
تبھی سے چینِ پیشانی ہے گنگا
مناظر اس کے ہیں اتنے دل افروز
سلام آتے ہیں دلّی کے شب و روز
دکھاتے ہیں جو یہ نقشہ اسے خواب
دہن دلّی کا نہروں سے ہے پُر آب
حسد کہنا اُسے سوئے ادب ہے
مگر یہ رشک ہو تو کیا عجب ہے
تناسخ پر ہے جن لوگوں کا ایماں
وہ ہیں یوں ارضِ کاشی کے ثنا خواں
نکلتی ہے یہاں جب روح تن سے
تو پاتی ہے نجات آواگون سے
بہار آتی ہے نخلِ آرزو پر
حیاتِ جاوداں ملتی ہے مر کر
نہیں اس کی مسیحائی سے کچھ دور
کہ داغِ جسم ہوں جانوں سے کافور
رواں افزائی سے آب و ہوا کی
سراپا جاں بنے ہر جسمِ خاکی

ادا ناآشنائے جلوۂ ناز
پریزادوں کے دیکھیں اس کے انداز
مجسم روح ، بیگانہ جسَد سے
پرے آلائشِ ہستی کی حد سے
مثالِ بوئے گل یکسر لطافت
ہیولیٰ ماورائے جسم و صورت
یہاں کے خاروخس رشکِ گلستاں
یہاں کا ذرّہ ذرّہ جوہرِ جاں
بہاریں اس گلستاں میں ازل سے
مبّرا ہیں تلوّن کے عمل سے
بہاریں شدتِ موسم سے بچ کر
چھپاتی ہیں اسی کے سائے میں سر
مئی ہو یا جولائی یا دسمبر
بہر موسم یہاں جنّت کا منظر
ادا کرتی ہے حق مشاطگی کا
لگاتی ہے خزاں صندل کا ٹیکہ
چڑھاتی ہیں عقیدت کے یہاں ہار
بہاریں موج گل کے باندھے زنّار
فلک ہے مدعی طاعت کے حق کا
اگاکر قشقۂ رنگیں شفق کا
خزاں کا تنگ جب ہوتاہے گھیرا
بہاروں کا یہیں جمتا ہے ڈیرا

حریمِ بت پرستاں ہے یہ خطّہ
زیارت گاہِ مستاں ہے یہ خطّہ
عبادت خانۂ ناقوسیاں ہے
یہ گویا کعبۂ ہندوستاں ہے
صنم اس کے مجسّم شعلۂ طور
سراپا نورِ یزداں چشمِ بددور
بدن نازک مگر دل ہیں توانا
بحُسنِ سادگی مطلب کے دانا
تبسم کا لبِ رنگیں پہ غازہ
دہن مانندِ گل شاداب و تازہ
ادائیں صد گلستاں جلوہ در بر
خرامِ ناز سے برپا ہو محشر
کرم میں موجِ گوہر کی روانی
ستم میں خونِ عاشق کی جوانی
وہ موزوں قد وہ عالم نقشِ پا کا
سماں وہ زیرِ گل بُن دام کا سا
فروغِ حسن سے غارت گرِ ہوش
بہارِ بستر و نو روزِ آغوش
جمالِ آتشیں سے انجمن سوز
بُتانِ بت پرست و برہمن سوز
بصد سامانِ آرائش چمن رنگ
چراغاں پرتوِ رُخ سے لبِ گنگ

کرم بخشی ادائے شست و شو کی
سند موجوں کے حق میں آبرو کی
سبھی گیسو دراز و حشر قامت
دلوں کا کام کرنے میں قیامت
بدن گویا نشاط دل کا ساماں
سراپا انبساط دل کا ساماں
شرارت یہ کہ موجیں منہ چھپالیں
کرامت یہ کہ جاں پانی میں ڈالیں
دلِ دریا میں ایک شورش ہے برپا
کہ ہر مچھلی دلِ مضطر ہے گویا
لبِ گنگا پہ ہے اک عرضِ خاموش
چلی آتی ہیں موجیں کھولے آغوش
غضب جلووں کی ہے شعلہ فشانی
گہر بھی ہیں صدف میں پانی پانی
بنارس شاہدِ رنگیں قبا ہے
یہ گنگا اس کا گویا آئنہ ہے
فلک نے رکھ کے حُسن اس کا نظر میں
جڑا ہے آئنہ سورج کا زر میں
خدا رکھے یہ شانِ حسنِ کامل
نہیں جز آئنہ جس کا مقابل
یہ جلوہ گاہے حسنِ لا اُبالی
جہاں میں ہے مثالِ بے مثالی

خوشا گنگا میں یہ پرتو فشانی
بنارس خود بنا ہے اپنا ثانی
دراصل اس رونمائی کے بہانے
اُتاری ہے نظر دستِ قضا نے
کہ ہے ارژنگِ چیں میں سحر ایسا
نہ ہے دنیا میں کوئی شہر ایسا
گلستاں اُس کے ہر دشت و دمَن میں
بہاریں خیمہ زن اُس کے چمن میں
چمن اس کے بیاباں در بیاباں
بہار اس کی گلستاں در گلستاں
یہ پوچھا میں نے اک روشن بیاں سے
فلک کی گردشوں کے رازداں سے
کہ ہے نایاب جنسِ مہروالفت
جہاں سے اُٹھ گئی ہے خیروبرکت
دلوں سے نقشِ ایماں مٹ گیا ہے
ہر انساں بندۂ حرص و ہوا ہے
جگر تشنہ پدر خونِ پسر کے
پسر ہیں دشمنِ جانی پدر کے
ستیز آمادہ ہے بھائی سے بھائی
اڑا جاتا ہے رنگِ آشنائی
نمایاں ہے جب ایسی ہر علامت
بپا پھر کیوں نہیں ہوتی قیامت؟

نمودِ حشر میں تاخیر کیوں ہے؟
یہ فتنہ بستۂ زنجیر کیوں ہے؟
تو کاشی کی طرف نظریں اُٹھا کر
جواب اُس نے دیا یہ مسکرا کر
نہیں یہ صانعِ قدرت کی مرضی
کہ ہو برباد یہ فردوسِ ارضی
بلند اتنا ہے کاشی کا تجمّل
نہ پہنچے اوج کو اس کے تخیّل
سنبھل اے غالبؔ مجبور و لاچار
کہ ناخوش تجھ سے ہیں سب یار و اغیار
برت کر اقربا سے بے نیازی
جنوں کی کر رہا ہے دل نوازی
نمودِ حشر تیرے آب و گِل سے
دریغ ایسے بشر سے ، ایسے دل سے
گزر ان جلوہ ہائے رہگزر سے
بہشت اپنی بنا خونِ جگر سے
جنوں تیرا اگر ہوجائے کامل
تو ہے کاشی سے کاشاں نصف منزل
نکل مانندِ نکہت پیرہن سے
رہا ہو اس طلسمِ جان و تن سے
طریقِ معرفت پر گامزن ہو
نہ رہ پابند، آوارہ وطن ہو

توقف ہے دلیلِ نارسائی
قیامت ہے یہ کافرماجرائی
توجہ ان مسائل سے ہٹا کر
نظر کر محضرِ ذوقِ طلب پر
کر اب کاشی میں کاشانے کی باتیں
چمن میں چھیڑ ویرانے کی باتیں
جہاں کچھ خستہ دل، بے یار و یاور
سرِ شکِ خونِ حسرت کے شناور
ہوا و حرص سے دامن بچائے
تری چشمِ کرم سے لو لگائے
گھروں میں رہ کے بھی صحرا نشیں ہیں
بساطِ سوزِ غم پر جاگزیں ہیں
نظر آتے ہیں یہ بندے خدا کے
بنے سیماب آتش زیرِ پا کے
ترے ہاتھوں سے غلطاں خاک و خوں میں
پڑے تنہائی کی قیدِ زبوں میں
دلوں کو شمع ساں گلخن بنائے
لبوں پر ضبط کے پہرے بٹھائے
تری بیداد سے بے برگ و ساماں
تغافل سے ترے در پردہ نالاں
نہیں یہ سرد مہری تجھ کو زیبا
کہ سیرِ گل میں دھیان آئے نہ اُن کا

نہ ہو اندیشۂ منزل سے غافل
مراحل سخت ہیں اور راہ مشکل
بڑھ آگے بن کے سیلِ تند رفتار
بیاباں راہ میں آئیں کہ کہسار
سبق لے قیس کے دیوانہ پن سے
گزر صحراؤں سے، دشت و دمن سے
تن آسانی کو تاراجِ بلا کر
مداوا رنج کا کر رنج اُٹھا کر
فنا کی نذر کر حرص و ہوس کو
ہوا دے آتشِ دل سے نفس کو
جگر کو کاہشِ محنت سے خوں کر
خرد کو کار آگاہِ جنوں کر
حرارت باقی ہے جب تک لہو میں
کمی آئے نہ ذوقِ جستجو میں
شرر بن کر فضاؤں میں بکھر جا
تعیّن کے مراحل سے گزر جا
لگا کر ضربِ "اِلّا" سازِ "لا" پر
دمِ "اللہ" سے حرقِ ماسوا کر

غالبؔ بنارس سے کلکتے تک کا سفر کشتی کے ذریعے طے کرنا چاہتے تھے۔ جب وہ جمنا کے کنارے کشتی والوں کے پاس گئے تو کشتی بانوں نے اُن کے ساتھ بدمعاملگی کی۔ غالبؔ نے جس کشتی والے سے بات کی اس نے کلکتے تک کا کرایہ سو روپے اور پٹنے تک کا بیس روپے طلب کیا۔ غالبؔ کے لیے اتنی بڑی رقم دینا مشکل تھا، اس لیے اُنھوں نے طے کیا کہ وہ باقی سفر گھوڑے ہی پر طے کریں گے۔'' [۲۴]

غالبؔ کے لیے گھوڑے پر سوار ہو کر اتنا طویل سفر طے کرنا بہت مشکل تھا۔ اُنھوں نے سوچا کہ پٹنے تک گھوڑوں پر چلے جائیں اور پھر وہاں سے اگر کلکتے تک کا کرایا مناسب ہو تو وہ باقی سفر کشتی سے طے کریں۔ مگر کسی وجہ سے ایسا نہ ہوا اور غالبؔ کو کلکتے تک گھوڑے ہی پر جانا پڑا۔

سینکڑوں میل کا دلّی سے کلکتے تک کا دشوار گزار سفر طے کر کے غالبؔ ۱۹ر فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتے پہنچ گئے۔

دہلی سے کلکتے تک کے سفر پر تبصرہ کرتے ہوئے غالبؔ نے اپنے ایک دوست خواجہ فخر اللہ کے نام خط میں لکھا ہے۔ یہ عبارت پہلے بھی نقل کی جا چکی ہے۔

> ''مختصر یہ کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہونا چاہتا تھا۔ مجھے اس جرم میں کیسے کیسے برے دن دیکھنے پڑے۔ چاہتا تھا کہ اپنے ہاتھ سے لیلائے مراد کی زلف سنوار دوں۔ اس خطا کی پاداش میں دنیا کی کون سی ایسی مصیبت تھی جو میں نے نہ جھیلی ہو۔ دشمن کے اثر ورسوخ اور دبدبے کے خلاف آہ وزاری کرتے تلوار کی دھار پر سینے کے بل چلتے ہوئے کلکتے پہنچا۔'' ۲۵

غرض یہ ہے کہ دلّی سے کلکتے تک کا سینکڑوں میل کا دشوار گزار اور تکلیف دہ سفر طے کر کے غالب ۱۹ر فروری ۱۸۲۸ء کو پہنچ گئے۔

غالبؔ کلکتے میں

غالبؔ نے دہلی سے کلکتے اور کلکتے سے دہلی کا تقریباً تین ہزار کلومیٹر کا سفر گھوڑے، یکّے، لڑھیا (بیل گاڑی) اور کشتی کے ذریعے طے کیا تھا۔ وہ فیروز پور، کان پور، لکھنؤ، باندہ، الہ آباد، بنارس، عظیم آباد اور مرشد آباد ہوتے ہوئے کلکتے پہنچے۔ اس طویل سفر میں کون سی ایسی مصیبت تھی جس کا اُن کو سامنا نہیں کرنا پڑا ہو۔ سفر کے دوران غالبؔ کسی خطرناک بیماری کا شکار ہوگئے۔ ممکن ہے یہ مرض پہلے ہی سے ہو اور سفر کے دوران بڑھ گیا ہو۔ لکھنؤ میں پانچ مہینے علاج کرایا مگر افاقہ نہیں ہوا۔ لکھنؤ سے کان پور ہوتے ہوئے باندہ پہنچے، یہاں اُن کا تقریباً چھ مہینے قیام رہا۔ کئی مہینے علاج کے بعد صحت یاب ہوکر کلکتے کے سفر پر نکلے۔ اس پورے سفر میں جدید سہولتیں حاصل ہونے کے باوجود ہم اس راستے سے کلکتے تک کے سفر کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے، جو غالبؔ نے اپنی ہمت اور بلند حوصلگی کے سہارے ۱۷۷ سال پہلے طے کیا تھا۔ بیماری، کمزوری، نقاہت اور مالی دشواری بھی انھیں اپنے ارادے سے باز نہیں رکھ سکی۔

دہلی سے کلکتہ کے طویل اور دشوار گزار راستوں سے گزرتے ہوئے غالبؔ ۲۰ر فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتے پہنچے۔ غالبؔ کے سفر کی جو تفصیلات پچھلے باب میں بیان کی گئی ہیں، اس کے پیشِ نظر غالب کا درجِ ذیل بیان ہرگز مبالغہ آمیز معلوم نہیں ہوتا۔ غالب نے کلکتے پہنچ کر نواب محمد علی خاں کے نام ایک خط میں اس سفر کے بارے میں لکھا تھا:

> ''میں گردِ راہ کی طرح گرتا پڑتا کوہ و بیابان میں ہر قدم پر پتھروں اور کانٹوں کی دھار پر چلتا ہوا، کبھی راتوں کی سردی سے افسردہ و پریشان اور کبھی گردشِ ایام کی ستم گری سے نالاں، چوتھی شعبان کو دن کا کچھ وقت گزرنے پر کلکتے پہنچا۔'' [1] (فارسی سے ترجمہ)

یہی خط 'پنج آہنگ' میں بھی نقل ہوا ہے مگر اس میں عبارت بہت ترمیم شدہ ہے۔ اپنے اس سفر کے بارے میں غالب نے لکھا ہے:

> ''میں خارزاروں سے گزرتے ہوئے تلوار کی دھار پر چل کر ستم رسیدہ

اور نالاں سہ شنبہ چہارم شعبان کی صبح کلکتے پہنچا۔"[۲] (فارسی سے ترجمہ)

نواب محمد علی خاں کے نام جس خط کا اقتباس پہلے نقل کیا گیا ہے، اس میں غالبؔ نے اطلاع دی ہے کہ:

"انھیں کرایے پر ایسا مکان مل گیا ہے، جس میں ہر قسم کی راحت و آسائش موجود ہے۔ بہت کھلا مکان ہے۔ بیت الخلا بھی بہت بڑا ہے، صحن میں میٹھے پانی کا کنواں بھی ہے۔ اس مکان کی چھت پر اہلِ ثروت کے لائق ایک آرام گاہ بھی ہے اس مکان کے بارے میں غالب نے مزید لکھا ہے کہ بغیر کسی تلاش کے اور بغیر کوئی زحمت اُٹھائے یہ مکان چھے روپے ماہوار کرایے پر مل گیا۔"[۳-۴]

غالبؔ نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

"یہ مکان انسانوں اور جانوروں دونوں کے لیے باعثِ راحت ہے۔ جانوروں سے غالباً مراد وہ گھوڑا ہے، جس پر غالب نے باندے سے کلکتے تک کا سفر کیا تھا۔ اس مکان کا پتا تھا۔ "شہر کلکتہ قریب چیت بازار، درشملہ بازار، نزدیکِ تالاب۔"[۵] (فارسی سے ترجمہ)

مولانا ابوالکلام آزاد نے اس مکان کے بارے میں لکھا ہے:

"لارڈ ایمہرسٹ غالباً پہلے گورنر جنرل ہیں جو شملہ گئے۔ اس وقت سے یہ رسم ہوگئی کہ ہر سال نہیں تو ہر دوسرے سال گورنر جنرل گرمیاں شملہ میں بسر کرے۔ اس زمانے میں ریل نہیں تھی، الہ آباد یا کان پور تک دریا کے ذریعے، پھر پالکی، گاڑی اور گھوڑے پر، یہ سفر جس شاہانہ شان وشوکت اور ساز وسامان کے ساتھ ہوتا تھا اُس کی تفصیلات پوٹیجز وغیرہ کی زبانی ہمیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک پورا شہر کلکتے سے شملے تک اور پھر شملے سے کلکتے تک متحرک رہتا تھا۔ بہ ہر حال اس صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ مزدوروں اور ملازموں کا ایک بڑا گروہ کلکتے میں صرف اس سفر کے لیے رہنے لگا اور ان کے محلے کا نام شملہ بازار پڑ گیا۔ یہ

چیت پور روڈ کے اس حصے میں تھا جو بعد کو گینڈا تالاب کے نام سے مشہور ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہیں مرزا غالب ٹھہرے تھے۔ اب یہ حصہ بالکل بدل گیا ہے۔ پرانے مکانوں کا نام ونشان باقی نہیں۔ ریل کے جاری ہوتے ہی کیمپ کے متعلقات بھی معدوم ہو گئے تھے، اس لیے شملہ بازار بھی معدوم ہو گیا۔"[٦]

غالب نے دو دن آرام کر کے اپنی تھکان اُتاری۔ جب وہ باندے سے کلکتے کے لیے روانہ ہوئے تھے تو نواب محمد علی خاں نے کلکتے کے ایک صاحبِ اقتدار بزرگ نواب علی اکبر خاں کے نام غالب کو ایک تعارفی خط دیا تھا۔ نواب علی اکبر خاں ہُگلی میں رہتے تھے، جہاں جانے کے لیے کشتی کا استعمال کرنا پڑتا تھا۔ دو دن آرام کرنے کے بعد غالب نواب محمد علی خاں کا خط لے کر ہُگلی پہنچے۔ نواب صاحب کے گھر پہنچ کر پہلے تو اُنھوں نے اس ایوان میں حاضری دی جہاں جناب سید الشہدا علیہ التحیہ والثنا کی ضریح رکھی ہوئی تھی۔ زیارت کے بعد غالب اس کمرے میں پہنچے جہاں سید علی اکبر خاں تشریف رکھتے تھے۔ اُنھوں نے بڑی گرم جوشی سے غالب کا استقبال کیا اور کہا کہ میں تو بہت دن سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ غالب نے پوچھا کہ آپ کو میرے بارے میں کیسے علم ہوا۔ نواب صاحب نے بتایا کہ غالب سے ان کا غائبانہ تعارف ہو چکا ہے۔ لوگ غالب کے بارے میں انھیں بہت کچھ بتا چکے تھے اور بقولِ غالب 'صوری ملاقات سے پہلے ہی نواب صاحب سے میرا معنوی تعارف ہو چکا تھا'، غالب دو تین گھنٹے اکبر صاحب کے پاس بیٹھ کر واپس آ گئے۔ دو روز کے بعد پھر غالب، سید علی اکبر کے گھر پہنچے اور اس دفعہ دو دن اور ایک رات ان کے ساتھ گزارے۔ اس دوران غالب نے اپنے سفر کا مقصد بیان کیا۔ نواب صاحب نے کوئی ایسی اُمید نہیں دلائی جس سے غالب خوش ہوتے اور نہ ہی ایسا ناامید کیا کہ غالب اپنے مقصد سے دست بردار ہو جاتے۔[٧] یہاں نواب سید علی اکبر کے بارے میں مختصراً بتانا ضروری ہے۔ ہگلی کے امام باڑے کے وقف کا انتظام سید علی اکبر کے ذمے تھا۔ سر چارلس مٹکاف کے زیرِ انتظام وقف جاگیر کی آمدنی بہتر مقاصد کے لیے صرف کی جاتی تھی۔ ہگلی میں ہگلی کالج، ہسپتال، مسافر خانہ وغیرہ تمام رفاہی ادارے سید علی اکبر خاں کے زیر انتظام قائم کیے گئے تھے۔ نواب صاحب کی اس حیثیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کلکتے میں کیسے بارسوخ اور بااثر ہوں گے۔ یہ غالب کی بدنصیبی ہے کہ جب غالب کلکتے پہنچے ہیں تو علی اکبر خاں کا حکومت سے اختلاف ہو چکا تھا اور ہگلی کے کلکٹر سے ان کے تعلقات خراب تھے۔ اس لیے وہ غالب کی مدد کرنے سے معذور تھے۔

غالبؔ نے پہلی ہی ملاقات کے بعد نواب سید علی اکبر خاں کی نشست و برخاست، طور طریق اور ادب آداب کی بہت تعریف کی ہے۔

محمد علی خاں کے نام ایک اور خط میں غالبؔ نواب علی اکبر خاں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ”کافر ہوں اگر کلکتے سے دہلی تک میں نے لطافتِ طبع، نزاکت ادا، حسنِ بیان اور فہمِ درست والا ایسا کوئی امیر بزرگ دیکھا ہو۔(نواب صاحب) صالح بھی ہیں اور مصلح بھی لیکن ان میں مولوی محمد علی خاں والی بات کہاں کہ مجھ جیسے عاجز و لاچار کے کام آسکیں۔“ [8]
> (فارسی سے ترجمہ)

نواب محمد علی خاں کے بڑے بھائی سراج الدین علی خاں کلکتے میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز تھے۔ جب غالب باندے پہنچے ہیں تو اُن کا انتقال ہو چکا تھا۔ نواب محمد علی خاں نے اپنی بھابھی یعنی سراج الدین علی خاں کی بیوہ کے نام غالبؔ کے بارے میں ایک تعارفی خط دے دیا تھا۔ نواب سید علی اکبر خاں سے ملاقات کے بعد غالبؔ فاتحہ پڑھنے کے لیے سراج الدین علی خاں کے مزار پر پہنچے۔ سراج الدین علی خاں مرحوم کی بیوی کلکتے میں اشالی نام کے ایک مقام پر رہتی تھیں۔ غالب ان کے گھر گئے اور ایک ملازم کے ہاتھ وہ خط بیگم صاحبہ کو بھیج دیا۔ مولوی غلام علی نام کے ایک صاحب باہر آئے اور غالب کو حرم سرا میں لے جا کر پردے کے پیچھے بٹھا دیا۔ بیگم صاحبہ نے غالبؔ سے براہِ راست گفتگو کی۔ اُنھوں نے نواب محمد علی خاں کی خیریت دریافت کی اور غالب سے کلکتے آنے کی وجہ دریافت کی۔ غالب نے اختصار کے ساتھ اپنے مقدمے کی تفصیل بتا دی۔ بیگم صاحبہ نے فرمایا کہ میرے بھانجے کا نام مولوی ولایت حسن ہے۔ وہ دورے پر گئے ہوئے ہیں۔ جب وہ واپس آئیں گے تو میں انھیں آپ کے پاس بھیج دوں گی۔ شملہ بازار شہر سے اور سرکاری دفاتر سے دور ہے اس لیے میرا بھانجا اسی گھر میں آپ کے قیام کا انتظام کر دے گا۔

کلکتے میں غالبؔ امید وبیم کی زندگی گزار رہے تھے۔ کبھی مقدمے کے حالات ایسے ہوتے کہ وہ خوش ہو جاتے اور کبھی ناخوش۔

ایک دن غالبؔ کو ایسی خبر ملی جس سے وہ خوشی سے جھوم اُٹھے۔ غالبؔ جب کلکتے سے آئے تھے تو ان کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف کی حالت بہت خراب تھی ان کا ذہنی توازن بگڑ چکا تھا، جس کی تفصیل پہلے بیان کی جا چکی ہے۔

غالبؔ کے نام دہلی سے خط آیا، جو خود غالبؔ کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔غالبؔ نے نواب محمد علی خاں کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

''مجھے اس کا ہرگز گمان نہیں تھا۔ جو کچھ واقع ہوا وہ ایسا ہے جیسے کوئی مردہ زندہ ہوجائے اس سے پہلے...... خدا نے میرے مغزِ جاں کو بوے نشاط سے معطر کردیا......اس ابہام کی وضاحت اور اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مرزا یوسف (غالب کے چھوٹے بھائی) سراپا ننگے رہتے تھے اور دیوانگی کی وجہ سے کسی ایک جگہ آرام سے نہیں بیٹھتے تھے۔ ماں کو ماں اور بہن کو بہن نہیں سمجھتے تھے۔ ۲۷ رمضان کو مجھے دہلی سے ایک خط ملا۔خط کے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر نظر پڑتے ہی میں نے پہچان لیا کہ میرے بھائی کی تحریر ہے۔ جب میں نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ مرزا یوسف ہی کا خط ہے، جو اس نے خود لکھا ہے۔اس میں القاب و آداب پوری ہوش مندی کے ساتھ لکھے گئے تھے۔ میں خوشی سے ناچنے لگا۔اتنا خوش ہوا کہ رو پڑا۔ جب ہوش میں آیا تو خود کو سنبھالا پھر بیوی کا خط پڑھا۔اُنھوں نے لکھا تھا کہ مرزا یوسف کے پاگل پن نے ہم کو سب کو بہت پریشان کررکھا تھا جس کا ہمیں پہلے سے خوف تھا۔اس کی چیخ پکار اور مار پیٹ کی وجہ سے ہمارے دن بہت برے گزر رہے تھے۔محل کی ایک خادمہ کے ذریعے ایک فیل بان آیا۔اس کا علاج شروع کیا۔اس نے بتایا کہ جادو کی وجہ سے یہ جنون ہے اور اس کی کچھ نشانیاں بتائیں۔اس نے بتایا کہ شہر پناہ کے باہر ایک درخت ہے اس کی جڑ کھودو، وہاں ایک کنواں ہے۔ ہم لوگوں نے جب وہاں کھدائی کی تو اس نے ہمیں جو جو چیزیں بتائی تھیں، وہ سب وہاں ملیں۔غرض یہ ہے کہ پانچ مہینے علاج کے بعد بیماری میں دو حصّے افاقہ ہوگیا (مرزا یوسف) اتنے ہوش و حواس میں آگئے کہ کپڑے پہننے لگے، ستر پوشی کرنے لگے۔ بول و براز کا خیال رکھنے لگے۔دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔ بیوی، بیٹی اور ماں کے رشتوں کو سمجھنے لگے۔......خدا کی قسم اُس (مرزا یوسف) کی صحت مجھے والدِ مرحوم کے زندہ ہونے سے زیادہ عزیز ہے۔ مجھے امید ہے کہ میری گزارش پر آپ

اُسے اپنا فرزند سمجھ کر خوش ہوں گے اور خدا سے دعا کریں گے کہ یہ باقی جنون بھی ختم ہو جائے۔''۹۹

غالبؔ خوش تھے کہ ان کا عزیز بھائی صحت یاب ہوگیا۔ جب غالبؔ دلّی پہنچے تو انھیں پتا چلا کہ مرزا یوسف کی حالت ویسی ہی تھی جیسی وہ چھوڑ گئے تھے۔ اُنھوں نے ایک خط میں لکھا ہے:

''پہلی بجلی، جو پہنچنے کے ساتھ ہی میری نظر پر گری، وہ بھائی کی، خدا اسے سلامت رکھے، نشست و برخاست کی روش کا مشاہدہ تھا کہ بیماری کی شدّت کے سبب ہڈیوں کا ڈھانچا بن گیا تھا اور اس کے جسم کے خون کا ہر قطرہ سوداویت کی انتہا سے نقطۂ سیاہ ہوگیا تھا۔ جس حال کو بے عقل لوگ درست خیال کر رہے تھے، ہرگز افاقہ نہیں تھا (بلکہ) وہ بھی فنونِ جنون کا ایک رنگ تھا۔ غرضے کہ جس طرح میں اپنے پچھلے خط میں لکھ چکا ہوں، میں یہ سوچتا تھا کہ اگر یہ حال زائل ہو جائے اور مرض صحت میں تبدیل ہو جائے (تو) کیسا عجوبہ ہوگا لیکن اب تو مریض کی حالت سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ طبیعت شفا کو قبول نہیں کر رہی، (چناں چہ) میں اپنی آنکھوں کے ذریعے یقین کی اُس منزل پر پہنچا ہوں کہ میرزا یوسف تا حیات ہمیشہ بیمار ہی رہے گا اور بس!''۱۰۰

غالبؔ نواب محمد علی کی بھابھی سے پھر ملنے گئے اور اس بار عجیب تماشا ہوا۔ جب غالبؔ مکان پر پہنچے تو انھیں عمارت کے نشیمن میں بٹھا دیا گیا۔ گھر میں سے کچھ لوگ باہر نکلے اور اُنھوں نے غالب سے اُلٹے سیدھے سوال کرنے شروع کیے۔ وہ دراصل یہ سمجھے کہ غالبؔ محمد علی خاں صاحب کے رشتہ داروں میں سے ہیں اور کسی سازش کے لیے وہاں آئے ہیں۔ غالبؔ نے محمد علی خاں کے نام خط میں لکھا ہے:

''میں نے ہر چند کہا کہ مجھے مولوی محمد علی خاں صاحب سے اس سفر میں پہلی بار نیاز حاصل ہوا ہے، وہ میری بات نہ مانے۔ مجھے آپ کے عزیزوں اور خاندان کے افراد میں سمجھ کر مجھ پر انھیں گمان ہوا کہ میں مخالفت اور دشمنی کے لیے آیا ہوں۔ یہاں تک کہ بیگم صاحبہ کے بھتیجے مولوی غلام علی اندر سے تشریف لے آئے۔'' (فارسی سے ترجمہ)۱۰۱

غلام علی صاحب نے بتایا کہ وہ محمد علی خاں صاحب کو کچھ کتابیں بھیجنا چاہتے ہیں۔ غالبؔ نے

کہا کہ یہ کتابیں میں لے جاؤں گا اس میں کیا تکلیف ہوسکتی ہے اور واپسی میں محمد علی خاں صاحب کو پہنچادوں گا۔

دربار

بنارس کے راجا اودت نرائن سنگھ کلکتے پہنچے۔ انھوں نے گورنر جنرل سے ملاقات کی درخواست کی جو گورنر نے منظور کرلی اور عام حاضری طے پا گئی۔ گورنمنٹ کے سکریٹری کے عملے کے نائب میرمنشی نے غالب کو خط کے ذریعے اس دربار کی اطلاع دی اور غالباً یہ بھی بتایا کہ انھیں مدعو نہیں کیا گیا ہے۔ دوسرے دن یعنی ہفتے کو غالب سکریٹری کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ انھیں بھی دربار میں بلایا جائے۔ غالب کی یہ درخواست منظور کرلی گئی۔

غالب نے لکھا ہے:

> ''جب میں نے دیکھا کہ وہ (سکریٹری) میرے حال پر بہت کرم فرمارہے ہیں تو میں نے خلعت کی آرزو کا اظہار کیا۔ کچھ دیر سوچ میں پڑے رہے۔ پھر سر اُٹھا کر دلفریب انداز میں کہا۔ اے فلانے اس وقت خلعت کی گنجائش نہیں ہے۔ اہلِ دربار میں کسی کے نام کا اضافہ کرنا ممکن نہیں تھا پھر بھی ہم نے (دربار میں تیرے نام کا اضافہ کرکے) ہم نے تیری خاطر کی اور تیرا دل رکھا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ میں خلعت نہیں دلا سکتا۔ اس وقت گراں مائیگی خلعت کی کفالت بھی ممکن نہیں تو خود دیکھ کہ تیرا چچا متوسلان اور سردارانِ سرکار میں تھا۔ انھیں اس عہدے پر خلعت نہیں ملی۔ تقررِ جاگیر کو دس مہینے گزر چکے ہیں۔ ایسے وقت میں ممکن نہیں ہے کہ کونسل کو تیرے حال سے واقف کرکے اور تیرے بزرگوں کے شایانِ شان تیرے لیے خلعت حاصل کی جائے۔ حالاں کہ تو نے خلعت پر ایک شاندار امر کا اضافہ کیا ہے۔ اب تو صبر کرکے آرام سے بیٹھ جا۔ کلکتے سے جب تیری رخصت کا وقت آئے گا تو لارڈ صاحب سے ایک گراں مایہ خلعت اور بہادر کا خطاب تیرے لیے حاصل کرلیا جائے گا۔'' (فارسی سے ترجمہ)[۱۲]

پیر کے دن دربار منعقد ہوا۔ دربار میں نشستوں کی ترتیب اس طرح تھی:

۱: عظیم آباد کے راجا بھوپ سنگھ
۲: بھوپ سنگھ کے والد اور مدار المہام مانک سنگھ
۳: اکبر شاہ ثانی بادشاہِ دہلی کے وکیل مرزا افضل بیگ
۴: شاہِ اودھ کے وکیل منشی عاشق علی خاں
۵: مرشد آباد کے نواب ہمایوں جاہ کے وکیل رائے گردھاری لال
۶: راجا جودھ پور کے وکیل رائے جیتن رائے
۷: جے پور کے راجا کے وکیل رائے رتن سنگھ
۸: نیپال کے راجا کے وکیل اُوما کانت اوپادھیائے
۹: نواب اکبر علی خاں
۱۰: غالبؔ

غالبؔ دربار میں حاضر ہوئے۔ اکبر علی خاں نہیں آسکے تھے۔ اس لیے ان کی کرسی خالی تھی۔ گورنر جنرل دربار میں آئے اور ایک ایک کر کے سب کو ان کے سامنے پیش کیا گیا، جب غالبؔ کو پیش کیا گیا تو غالبؔ نے دو اشرفیاں بطور نذر پیش کیں، جنھیں گورنر جنرل نے معاف کر دیا اور پھر بقول غالب:

> ''گورنر جنرل نے چندے توقف فرمایا اور میری نیاز مندی کو سراہا اور انتہائی شفقت سے اپنے دستِ خاص سے عطر اور پان مجھے عنایت فرمائے۔'' (فارسی سے ترجمہ) [۱۳]

غالبؔ نے محمد حبیب اللہ ذکاؔ کے نام ایک خط مورخہ ۱۵ر فروری ۱۸۶۷ء میں لکھا ہے:

> ''کلکتہ گیا' نواب گورنر سے ملنے کی درخواست کی، دفتر دیکھا گیا، میری ریاست کا حال معلوم کیا گیا، ملازمت ہوئی سات پارچے اور جیغہ سرپیچ اور مالائے مروارید یہ تین رقم خلعت ملا، ازاں بعد جب دلّی میں دربار ہوا مجھ کو یہی خلعت ملا۔

حقیقت یہ ہے کہ غالبؔ کو خلعت نہیں ملا تھا۔ یہ صرف ان کی آرزو تھی۔ ہاں بعد میں جب وہ کلکتے سے دہلی کے لیے روانہ ہونے لگے تو یکم اگست ۱۸۲۹ء کو ایک دربار ہوا، جس میں غالبؔ بھی بلائے گئے۔

غالبؔ نے نواب محمد علی خاں کو لکھا ہے کہ:

> ''لارڈ صاحب نے دربارِ عام کیا۔ سلام کرنے والوں کو مدعو کیا گیا۔ ہم مرتبہ سب لوگ گئے، میں بھی پہنچا اور نواب اکبر علی خاں کے بعد دسواں نمبر میرا تھا۔'' (فارسی سے ترجمہ) [۱۴]

اس دربار میں غالبؔ کو معلوم ہوا کہ گورنر جنرل دہلی جارہے ہیں۔ غالبؔ نے سوچا کہ دہلی سے ریذیڈنٹ کی رپورٹ دو تین ماہ میں بھی نہیں پہنچے گی، اس لیے انھیں اس قافلے سے پہلے دہلی پہنچ جانا چاہیے۔

دربار میں نواں نمبر سید علی اکبر خاں کا تھا اور دسواں غالبؔ کا تھا۔ وہ نہیں آئے اور ان کی کرسی خالی رہی۔ غالب نے خط لکھ کر سید علی اکبر خاں سے نہ آنے کی وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہیں۔ غالب ان کی عیادت کے لیے ہگلی پہنچے۔ نواب صاحب گردے کی پتھری کے عارضے میں مبتلا تھے۔ علاج سے بہت جلد شفایاب ہوگئے۔ غالب پانچ دن اور رات ہگلی میں رہے اور پھر کلکتے واپس آگئے۔ غالب نے ایک خط میں نواب محمد علی خاں کو لکھا ہے:

> ''میں اپنی چچی کا خط جو دہلی سے آیا ہے اس عریضے کے ساتھ منسلک کررہا ہوں۔ پڑھنے کے بعد پھاڑ دیں اور پانی و آگ کے سپرد کردیں۔'' (فارسی سے ترجمہ) [۱۵]

یہ کون چچی ہیں اور اُنھوں نے خط میں کیا لکھا تھا جسے غالبؔ پھاڑ دینا چاہتے تھے۔ ممکن ہے کہ یہ غالب کے چچا نصراللہ خاں بیگ کی بیوی ہوں مگر یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

جب غالبؔ نے دیکھا کہ گورنر جنرل اور ارکانِ کونسل دہلی جارہے ہیں تو اُنھوں نے بھی دہلی جانے کا فیصلہ کرلیا۔

غالبؔ نے محمد علی خاں کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ اُنھوں نے ایک کشتی والے سے طے کرلیا کہ وہ غالب کو ساحلِ باندہ تک پہنچادیں گے اور پھر وہاں سے وہ خشکی کے راستے دہلی جائیں گے۔ غالب نے اپنا سفر کا کچھ سامان کشتی میں پہنچادیا اور محمد علی خاں کو لکھا کہ میں کلکتے سے باندہ دو مہینے میں پہنچ جاؤں گا۔ غالبؔ نے یہ بھی لکھا کہ اگر دہلی یا کلکتے سے ان کے نام کا کوئی خط آئے اسے پڑھ کر وہ اپنے محفوظ کرلیں۔ جب غالبؔ باندہ پہنچیں گے تو وہ اسے لے لیں گے۔ غالب کا خیال تھا کہ دہلی سے مولانا فضل خیرآبادی کا اور کلکتے سے مولانا سراج

الدین احمد کے خطوط آسکتے ہیں۔ سراج الدین احمد کلکتے میں دفتر خانۂ فارسی کے اراکین میں شامل تھے اور مولوی عبدالکریم کے بھتیجے تھے۔ غالب نے کلکتے سے روانہ ہونے سے پہلے سراج الدین احمد سے کہا تھا کہ اگر کوئی نئی بات ہو تو وہ ایک خط کے ذریعے اس امر کی اطلاع دے دیں۔ یہ خط مولوی محمد علی خاں کے نام ہو یا غالب کے نام۔ یہی درخواست غالب نے اپنے دہلی کے دوست مولوی فضل حق خیر آبادی سے بھی کی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ باندہ پہنچ کر انھیں دہلی و کلکتہ کے تازہ حالات سے آگاہی ہو سکے۔

غالب نے باندہ سے روانہ ہوتے ہوئے محمد علی خاں کے نام ایک خط میں بہت دل چسپ بات لکھی تھی۔ لکھتے ہیں:

> ''بالجملہ وہ اشیا جو میرے سامان میں ہیں، ممکن ہے چور کے لیے قابلِ قبول نہ ہوں۔ اس حیثیت سے میں کشتی میں ہم سفروں سے خوش اور رہزنوں سے محفوظ ہوں۔''[۱۶]

اسی خط میں غالب نے محمد علی خاں صاحب کو یہ بھی لکھا ہے کہ آپ کسی ملازم کو باندے کے کوتوالی چبوترے پر بھیج دیں اور کوتوال سے کہہ دیں کہ وہ بنارس تک ورنہ الہ آباد تک ان کے سفر کا انتظام کر دیں۔ آگے چل کر غالب لکھتے ہیں کہ انھوں نے سفر کے لیے خود کو تیار کر لیا ہے۔ چوں کہ مشہور ہے کہ جمعرات کے دن سفر مبارک ہوتا ہے اس لیے کل صبح سفر پر روانہ ہو جاؤں گا اور اگر یہ ممکن نہیں ہوا تو کل اپنے سامان میں سے کچھ سامان آپ کے دولت خانے بھیج کر جمعے کی صبح آپ کی قدم بوسی کے بعد سفر پر روانہ ہو جاؤں گا۔

غالب ۲۰ / یا ۲۱ / اگست کو کلکتے سے باندے کے لیے روانہ ہو گئے۔

غالبؔ کی پینشن کا قضیہ

غالبؔ کی پنشن کی تفصیلات اس کتاب کے پہلے باب میں اختصار سے بیان کی جاچکی ہیں۔ یہاں پنشن کے قضیے کی پوری تفصیل بتائی جارہی ہے۔

غالبؔ کی پنشن کا قضیہ ۱۸۰۶ء میں اُس وقت شروع ہوا تھا، جب غالبؔ ابھی نو سال کے تھے۔ اس وقت اُن کے والد اور چچا کا چھوڑا ہوا اثاثہ اتنا تھا کہ اُن کی اور اہلِ خاندان کی زندگی عیش و آرام سے گزر رہی تھی اور پھر چوں کہ خاندان میں غالبؔ اور اُن کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف بیگ کے علاوہ اور کوئی مرد نہیں تھا اور یہ دونوں کم عمر تھے، اس لیے پنشن کے سلسلے میں نواب احمد بخش خاں نے ان کے ساتھ جو ناانصافی کی تھی، اِس کا انھیں پتا بھی نہ چلا لیکن جب وہ سنِ بلوغت کو پہنچے تو انھیں اس ناانصافی کا پتا ہوا۔ غالبؔ نے بارہا نواب احمد بخش خاں کی توجہ اس ناانصافی کی طرف مبذول کراکے اپنا جائز حق مانگا لیکن نواب احمد بخش خاں نے غالبؔ کے مطالبات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ مجبور ہوکر ۲۸ر اپریل ۱۸۲۸ء کو غالبؔ نے ایک عرض داشت کے ذریعے کلکتے میں حکومت کی توجہ اس ناانصافی کی طرف مبذول کرائی۔ خط کے متن سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت کے نام پنشن کے سلسلے میں غالبؔ کی یہ پہلی عرض داشت تھی۔

غالبؔ ۱۸۲۳ء (جب حاجی خاں کی وفات کے بعد غالبؔ، نواب احمد بخش سے ملاقات کے لیے فیروز پور گئے) سے ۱۸۴۵ء تک یعنی تقریباً بائیس تک پنشن کے سلسلے میں اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافی کے خلاف جدوجہد کرتے رہے۔ ۱۸۲۸ء اور ۱۸۴۵ء کے دوران غالبؔ نے بڑی تعداد میں حکومت کو درخواستیں دیں۔ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا میں محفوظ غالبؔ کی درخواستیں اور مقدمے سے متعلق دیگر دستاویزیں نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، نئی دہلی میں محفوظ ہیں، جنھیں پرتھوی چندر نے مرتب کرکے 'حقِ جاگیر غالبؔ' کے نام سے ۱۹۶۸ء میں نئی دہلی سے شائع کردیا تھا۔ اس کتاب کی اشاعت میں آرکائیوز کے ساتھ کوئی ایسی قانونی پیچیدگی پیدا ہوگئی کہ پرتھوی چند صاحب کو کتاب کی تمام جلدیں واپس لے کر ضائع کرنی پڑیں۔ چند جلدیں محفوظ رہ گئیں، جن میں ایک میرے پاس بھی ہے۔

نیشنل آرکائیوز آف انڈیا کے علاوہ انڈیا آفس لائبریری (لندن) اور لاہور کے پنجاب آرکائیوز میں بھی اس مقدمے سے متعلق دستاویزیں موجود ہیں۔ ان تینوں اداروں سے یہ تمام دستاویزیں حاصل کرکے 'مقتدرہ قومی زبان' اسلام آباد نے 'غالب کی خاندانی پنشن اور دیگر امور، سرکاری اسناد و دستاویزات' کے نام سے مرتب کرکے ۱۹۹۷ء میں اسلام آباد کراچی سے شائع کرکے غالبیات کے سلسلے میں اہم ترین ضرورت کو پورا کیا ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے اس کتاب پر عالمانہ حواشی و تعلیقات لکھے ہیں۔ کتاب میں ۱۵۶ درخواستیں، عرض داشتیں، حکومت کے احکامات، سرکاری افسران کے لکھے ہوئے جواب اور دیگر امور سے متعلق خطوط اور ایسی دستاویزیں شامل ہیں، جن کا غالب کی پنشن سے براہِ راست تعلق ہے۔

محققینِ غالب نے غالب کی پنشن کے معاملات پر اتنا کچھ لکھا ہے کہ اگر اُسے اکٹھا کیا جائے تو وہ ہزاروں صفحات پر مشتمل ہوگا لیکن اس سلسلے کی سب سے اہم دستاویز خود غالب کی وہ درخواست ہے جو اُنھوں نے کلکتے پہنچ کر ۲۸/اپریل ۱۸۲۸ء کو حکومت کو پیش کی تھی۔ یہ درخواست انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ ہے۔ غالبیات کے سلسلے میں بہت سے اہم کارناموں میں مالک رام صاحب کا ایک کارنامہ اس درخواست کی دریافت بھی ہے۔ یہ درخواست انگریزی میں ہے۔ مالک رام صاحب نے اس کا اردو میں ترجمہ کرکے ماہانہ 'افکار' (کراچی۔ مارچ ۱۹۶۹ء، ص ص ۴۶۔۵۴) میں شائع کرایا۔ بعد میں مرحوم نے یہ ترجمہ اپنے مضامین کے مجموعے 'فسانۂ غالب'[1] شامل کردیا۔ مقتدرہ قومی زبان، پاکستان سے شائع ہونے والی کتاب 'غالب کی خاندانی پنشن اور دیگر امور: سرکاری اسناد و دستاویزات' میں بھی یہ درخواست شامل ہے۔ اس سلسلے کی ایک اور اہم دستاویز ہے اور وہ ہے مرزا افضل بیگ کی طرف سے دائر کردہ جواب دعویٰ جو ۸/مارچ ۱۸۳۰ء کو حکومت کو پیش کیا گیا۔ اس دعوے کے ساتھ مرزا افضل بیگ نے جو خط لکھا ہے، اس میں کہا ہے کہ اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ نے اُن (خواجہ حاجی خاں کے صاحب زادوں خواجہ شمس الدین عرف خواجہ جان اور خواجہ بدرالدین عرف خواجہ امان۔ یہ دونوں مرزا افضل بیگ کے سگے بھانجے بھی تھے) کی حق تلفی کے ارادے سے کلکتے سے مراجعت[2] کے وقت ایک درخواست حکومت کو پیش کی تھی۔ یہ درخواست اس کا جواب دعویٰ ہے۔ غالب کی درخواست اور مرزا افضل بیگ کا جواب دعویٰ غالب کی پنشن کے سلسلے کی اہم ترین دستاویزیں ہیں۔ یہ دونوں تحریریں خاصی طویل ہیں لیکن اُن کی اہمیت کے پیشِ نظر دونوں کو مکمل طور پر یہاں نقل کیا جارہا ہے تاکہ دونوں فریقوں کے دلائل کو پوری طرح سمجھا جاسکے پہلے غالب کی درخواست پیش کی جاتی ہے:

سیاسی روئداد۔۔۲رمئی ۱۸۲۸ء

(منجانب اسد اللہ خاں موصولہ ۲۸راپریل ۱۸۲۸ء)

جب مسٹر پیرون کماندار تھے تو آں جناب کی طرف سے صوبہ آگرہ کا انتظام و انصرام میرے چچا نصر اللہ بیگ خاں کے پاس تھا۔ انگریزی فوج جب اس علاقے میں پہنچی تو نصر اللہ بیگ خاں نے اس کی اطاعت قبول کرلی، خود کو سرکار برطانیہ کے ساتھ وابستہ کر کے جنرل لارڈ لیک صاحب بہادر کی خدمت میں حاضر ہوئے جنھوں نے آگرہ صوبے کا انتظام ان کے حوالے کردیا۔ بعد میں جب مسٹر ولیئرز آگرے کی قلعہ داری کے منصب پر فائز ہوئے تو صوبہ داری کی حیثیت وہ نہ رہی جو سابق کماندار کے زمانے میں ہوا کرتی تھی چناں چہ نصر اللہ بیگ خاں متھرا چلے گئے اور جنرل موصوف کی خدمت میں حاضر ہوئے، جنھوں نے انھیں سترہ سو روپے ماہانہ تنخواہ پر چار سو سواروں کے ایک دستے کی رسالداری سونپ دی۔

راجا بھرت پور کے ساتھ دوستانہ مراسم کے قیام اور جنرل موصوف کی ولایت کو واپسی طے ہونے کے بعد آں جناب لارڈ صاحب بہادر نے واپسی سے پہلے نصر اللہ بیگ خاں کی وفاداری اور خدمات کے صلے میں انھیں تاحینِ حیات صوبہ آگرہ کے دو پرگنے سونک اور سونسا پندرہ ہزار آٹھ سو روپے پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عنایت فرمائے، جن کا مالیہ ایک لاکھ روپیہ سے زیادہ تھا۔

اس عطیے میں، سواروں کے دستے کی رسالداری کے ساتھ اگر ان کی پنشن کو بھی شامل کرلیا جائے تو ان کی طاقت اور مرتبے میں بڑا اضافہ ہوگیا تھا۔ جنرل صاحب بہادر کی مہر شدہ سند اور کرنل براؤن صاحب بہادر کی سند جو لفظ بہ لفظ جنرل موصوف کی سند کی نقل ہے اور وظائف کی بابت نصر اللہ بیگ خاں کے نام جنرل موصوف کا پروانہ جس پر ان کی مہر لگی ہوئی ہے، میرے پاس موجود ہیں اور ان میں سے ہر دستاویز کی نقل اپنی اس عرض داشت کے ساتھ منسلک کررہا ہوں۔

جاگیر پر ان کی تقرری کے دس یا گیارہ مہینے بعد نصر اللہ بیگ خاں ہاتھی پر سوار جارہے تھے کہ اتفاقاً نیچے گرے اور پیر کی ہڈی ٹوٹ جانے اور اندرونی چوٹوں کی وجہ سے ان کا انتقال ہوگیا۔

جس روز یہ واقعہ ہوا حکومت نے اسی دن ان کی جاگیر پر قبضہ کرلیا اور کچھ ہی عرصے بعد ان کے چار سو سواروں کے دستے کو بھی سبک دوش کر دیا۔

۲- چوں کہ نصر اللہ بیگ خاں لاولد تھے اس لیے مندرجہ ذیل چھ اشخاص کے سوا ان کا اور کوئی وارث نہیں تھا جن کے نام یہ ہیں:

۱- میں خود کہ نصر اللہ بیگ خاں کا بھتیجا۔

۲- میرا بھائی جو مجھ سے دو سال چھوٹا تھا۔

۳- میری دادی یعنی نصر اللہ بیگ خاں کی والدہ اور

۴- نصر اللہ بیگ خاں کی تین بہنیں۔

اس وقت میری عمر صرف نو سال تھی اور میرے بھائی کی عمر سات سال۔ میری دادی ستر سال کی عمر کو پہنچ چکی تھیں اور بیٹے کی موت کے غم میں ان کی دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ اسی طرح نصر اللہ بیگ خاں کی بہنیں بھی اس ناگہانی آفت کی وجہ سے دل گرفتہ اور مغلوب جذبات تھیں چناں چہ ہم میں سے کوئی اس قابل نہیں تھا کہ نصر اللہ بیگ خاں کی چھوڑی ہوئی املاک و جائداد کو سنبھال سکتا اور نہ ہی کوئی اس قابل تھا کہ جنرل موصوف کی خدمت میں حاضر ہو سکتا اور اپنا حال بیان کر سکتا۔

ایک شخص نے جس کا نام خواجہ حاجی تھا اور جس کا حال نصر اللہ بیگ خاں کے عزیز و اقارب کے احوال کے ضمن میں آگے چل کر بیان کیا جائے گا، یہ شخص نصر اللہ بیگ خاں کے گھرانے کا ایک ملازم تھا۔ میدان کھلا پایا تو اس نے بے اصول حاشیہ نشینوں اور طفیلیوں کے ساتھ دوستانہ مراسم بڑھائے اور نصر اللہ بیگ خاں کے سارے مال و متاع، فرنیچر، خیمہ، خرگاہ، اونٹوں اور پالکیوں وغیرہ پر قبضہ کرلیا اور ستر اسّی سواروں، ایک ہاتھی، مذکورہ بالا لاؤ لشکر اور سامانِ حرب کے ساتھ چل پڑا اور نواب احمد بخش خاں سے جا ملا۔

چوں کہ نصر اللہ بیگ خاں نواب احمد بخش خاں کے داماد تھے اور ظاہر ہے ہر شخص ان کے داماد اور عزیز و اقارب سے واقف تھا اس لیے یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ نواب احمد بخش خاں خواجہ حاجی کو نصر اللہ بیگ خاں کا وارث و جانشین اور رشتہ دار سمجھ بیٹھتے خصوصاً اس لیے بھی کہ نصر اللہ بیگ خاں کی اہلیہ جو احمد بخش خاں کی بیٹی تھیں (کذا) ؎ اپنے شوہر سے پہلے ہی وفات پا چکی تھیں

اور ان کی کوئی اولاد نہیں تھی لیکن صرف یہ خیال کر کے کہ اپنے تمام سواروں، ہاتھیوں، لاؤ لشکر اور طاقت کے ساتھ حاجی ایک قیمتی اثاثہ ہے، نواب احمد بخش خاں نے اسے اپنے دوستوں میں شامل کرلیا اور اسے اپنی جگہ چھوڑ کر وہ خود لارڈ لیک صاحب بہادر سے ملاقات کے لیے کان پور چلے گئے۔

اسی زمانے میں فیروز پور، جھرکہ، پونا ہانا، نگینہ سانکرس (Sankurus) اور دوسرے اضلاع، حکومت نے ہمیشہ کے لیے بیس یا تیس ہزار روپیہ سالانہ معاوضے پر احمد بخش خاں اور ان کے وارثوں کو دائمی قبضے پر دے دیے تھے چناں چہ احمد بخش خاں اور ان کے وارثوں پر یہ لازم قرار دیا گیا کہ وہ یہ رقم باقاعدگی سے ادا کرتے رہیں تاہم اُنھوں نے جنرل موصوف سے درخواست کی کہ "میرے داماد[۴۲] (کذا) نصراللہ بیگ خاں کا، جو سونک اور سونسا کے جاگیردار تھے، انتقال ہوگیا ہے اور اپنے پیچھے بہت سے عزیز و اقارب اور پچاس سوار چھوڑ گئے ہیں۔ اگر حکومت اس رقم کی مجھے ادائیگی کرنے دے اور طے کردے کہ یہ رقم نصراللہ بیگ خاں کے عزیز و اقارب کی گزر اوقات کے لیے ہوگی تو وہ بے نصیب محتاج و مفلس لوگ مملکت کی خوش حالی اور فلاح و بہبود کے لیے ساری زندگی دست بہ دعا رہیں گے اور وہ پچاس سوار ہمیشہ میری سپردگی میں رہیں گے اور جب بھی حکومت انھیں بجا آوری خدمات کے لیے طلب کرے گی تو انھیں ہمہ وقت تیار پائے گی۔

جنرل صاحب بہادر نے اس درخواست کو منظور کرلیا اور اس کی ایک رپورٹ کلکتہ ارسال کردی۔ جہاں گورنر جنرل صاحب بہادر نے بھی اس کی منظوری دے دی۔ چناں چہ گورنر جنرل صاحب بہادر نے احمد بخش خاں کے نام ایک پروانہ جاری کردیا۔ جس میں نصراللہ بیگ خاں کے عزیز و اقارب کی پرورش و کفالت اور مقررہ پچاس سواروں کی خدمات مہیا کرنے کی شرط کو پورا کرنے کا حکم دیا گیا۔

چوں کہ جنرل صاحب بہادر کو احمد بخش خاں کی باتوں پر مکمل اعتماد تھا اس لیے اُنھوں نے نصراللہ بیگ خاں کے عزیز و اقارب کے حقیقی احوال و حالات کے متعلق تفتیش نہیں کی بلکہ ان کی درخواست پر خواجہ حاجی کے نام ایک پروانہ جاری کردیا، جس میں بتایا گیا ہے کہ نصراللہ بیگ خاں کے عزیز و اقارب کی گزر اوقات کے لیے جو وظیفہ اور پچاس سواروں کے لیے جو الاؤنس مقرر کیا گیا ہے وہ احمد بخش خاں کو دی جانے والی جاگیر کے سمجھوتے کی شرائط میں شامل ہے اور یہ رقم ہمیشہ ان سے وصول کی جانی چاہیے۔

آخرکار جب احمد بخش خاں کان پور سے واپس میوات پہنچے جہاں ان کی جاگیر تھی تو اُنھوں نے خواجہ حاجی کو ان کے ستراسّی سواروں کے دستے سمیت، جو نصراللہ بیگ خاں، چھوڑ گئے تھے برقرار رکھا اور دستے کو اپنی ملازمت میں لے لیا اور پھر اس کی مدد سے اپنے اِضلاع کا بندوبست کیا۔

جب وہ (نواب احمد بخش خاں) اپنی جائیداد کے بندوبست سے مطمئن ہوگئے اور جنرل صاحب بہادر بھی یورپ واپس چلے گئے تو یہ دیکھتے ہوئے کہ نصراللہ بیگ خاں کے ہم دونوں بھتیجے ابھی ناسمجھ ہیں اور یہ جانتے ہوئے کہ ماں اور بہنیں گوشہ نشیں اور بے علم ہیں اُنھوں نے خواجہ حاجی کے ذریعے پہلے پچاس سواروں کے دستے کو برطرف کردیا اور پھر اس وعدے اور اقرار کے ساتھ خواجہ حاجی سے جنرل صاحب بہادر کے پروانے کا مطالبہ کیا کہ اگر وہ پروانہ حوالے کردیں تو نصراللہ بیگ خاں کے عزیز و اقارب کے گزربسر کے لیے ملنے والے وظیفے میں وہ انھیں بھی ایک حصّہ دار کی حیثیت سے شامل کرلیں گے۔

چوں کہ وہ بدبخت اور بدقماش اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کی کوئی حیثیت نہیں اور نصراللہ بیگ خاں کے ساتھ اس کی کوئی قرابت داری بھی نہیں یہ سوچ کر کہ نصراللہ بیگ خاں کے خاندان کے ساتھ یہ تعلق اس کی خوش بختی کے لیے ایک نادر موقع ہے، اس نے پروانہ احمد بخش خاں کے حوالے کردیا۔

احمد بخش خاں نے خواجہ حاجی کو چند روز اپنے ساتھ رکھا اور پھر برطرف کردیا۔ اس کے بعد انھوں نے اعلان کیا کہ حکومت نے ان کی جاگیر سے پانچ ہزار روپیہ سالانہ کی جو رقم نصراللہ بیگ خاں کے عزیز و اقارت کی کفالت کے لیے مقرر کی تھی اسے انھوں نے اپنی مرضی سے مندرجہ ذیل لوگوں میں اس طرح تقسیم کیا ہے: مبلغ دو ہزار روپے سالانہ خواجہ حاجی کو، پندرہ سو روپے سالانہ نصراللہ بیگ خاں کی والدہ کو اور پندرہ سو روپے سالانہ مجھے (آپ کے درخواست گزار کو)۔

چند برس بعد جب میں بلوغت کو پہنچا اور اس قابل ہوا کہ صحیح اور غلط اچھے اور برے میں تمیز کرسکوں تو میں نے محسوس کیا کہ پانچ ہزار روپیہ کی تقسیم میں احمد بخش خاں نے صریحاً ناانصافیوں کا ارتکاب کیا ہے۔ پہلی یہ کہ اُنھوں نے عزیز و اقارب میں ایک ادنیٰ درجہ کے نوکر کو شامل کرلیا ہے دوسرے یہ کہ اُنھوں نے اس تقسیم سے میرے بھائی کو بالکل علاحدہ رکھا ہے جو میری ہی طرح نصراللہ بیگ خاں کا حقیقی بھتیجا ہے۔

مزید برآں مجھے یہ بات بڑی غیر معمولی لگی کہ جنرل صاحب بہادر نے جو بے پایاں سخاوت اور فیاضی کا پیکر تھے اور لاکھوں روپیہ بخش دیا کرتے تھے۔ ایک استمرار دار کے عزیز و اقارب کی پرورش کے لیے صرف پانچ ہزار روپے سالانہ مقرر کیے ہوں جب کہ جو اراضی اس کے پاس تھی اس کی سالانہ آمدنی ایک لاکھ روپے تھی۔

میں نے ہر ممکن طریقے سے اپنے دعاوی کا مسئلہ اُٹھانے کی کوشش کی اور وقتاً فوقتاً کبھی تحریری اور کبھی زبانی اپنا مقدمہ احمد بخش خاں کے سامنے پیش کیا اور ان سے عرض کیا کہ جناب عالی آخر وہ کون سا محرک ہے جس نے آپ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ آپ نے ایک اجنبی کو عزیز و اقارب کے زمرے میں شامل کرلیا اور ایک حقیقی بھتیجے کو اس زمرے سے خارج کر دیا؟ اگر آپ خواجہ حاجی کے کاموں سے بہت خوش ہیں تو اسے آپ اپنی جیب خاص سے دیں یا نصر اللہ بیگ خاں کے دستے میں سے دو تین سواروں کا وظیفہ ان کے لیے مقرر کردیں۔ اس کے کیا معنی ہیں کہ نصر اللہ بیگ خاں کے عزیز و اقارب کے وظیفے میں سے خواجہ حاجی کو تنخواہ دی جارہی ہے؟

احمد بخش خاں مجھے خط کے ذریعہ بھی جواب دیا کرتے تھے اور اپنے دعوے کے حق میں جھوٹی قسمیں کھا کر کہا کرتے تھے ''میں کیا کرسکتا ہوں؟ میں عزت مآب جنرل صاحب بہادر کو بتا چکا ہوں کہ خواجہ حاجی نصر اللہ بیگ خاں کے عزیز و اقارب میں شامل نہیں اور میری غلطی سے ان کا نام سرکاری ریکارڈ میں درج کیا جاچکا ہے۔ اب مجھے ذلیل و رسوا نہ کرو اور چند روز صبر کرو خواجہ حاجی کے انتقال کے بعد میں یہ دو ہزار روپے تم دونوں بھائیوں کو دیا کروں گا۔

چوں کہ احمد بخش خاں دو طرح سے میرے بزرگ اور عزیز تھے اوّل اس طرح کہ میرے چچا نصر اللہ بیگ خاں ان کے داماد[۵] تھے دوسرے یوں کہ میں ان کے بھائی الٰہی بخش خاں کا داماد تھا۔ ان واقعات و حالات کے بارے میں، میں نے احمد بخش خاں کی بزرگی اور ان کے ساتھ قرابت داری کا احترام کیا اور خود بھی اپنے ساتھ کی گئی ناانصافیوں کی اذیت کو خاموشی سے برداشت کرلیا۔ میں نے اپنے بھائی کو بھی باز رکھا کہ وہ بھی اپنی شکایات کا اظہار نہ کرے اور نہ ہی حکومت سے دادرسی کا طالب ہو۔

اس طرح سے ایک زمانہ گزر جانے کے بعد خواجہ حاجی کا انتقال ہوگیا اور وہ اپنے پیچھے دو بچے[۶] چھوڑ گیا۔ میں نے سوچا کہ اس سال کی آمدنی مجھے ملے گی لیکن جب تنخواہ کی تقسیم ہوئی تو احمد بخش خاں کی ریاست سے دو ہزار روپے سالانہ کی رقم، جس کا پہلے ذکر کیا جاچکا ہے، فوراً خواجہ

حاجی مرحوم کے بچوں کو ادا کر دی گئی۔

مایوسی کے عالم میں، میں احمد بخش خاں کے پاس فیروز پور گیا اور ان سے کہا کہ آپ کو اپنا وعدہ پورا کرنا چاہیے اور جو لوگ قانونی طور پر مستحق ہیں ان کے حقوق بحال کر دینے چاہئیں یا پھر مجھے اجازت دیں کہ میں اپنا مقدمہ حکومت کے سامنے پیش کر دوں۔ اس وقت وہ اپنے بستر سے اُٹھ بیٹھے جس پر وہ زخمی ہو جانے کی وجہ سے لیٹے ہوئے تھے اور الور کی مختاری نکل جانے کے باعث بڑے دل شکستہ تھے۔ اُنھوں نے سسکیاں بھر بھر کر میرے سامنے رونا شروع کر دیا اور کہنے لگے، 'برخوردار تم میرے بچے اور میری آنکھوں کا نور ہو، تم دیکھ رہے ہو کہ میں زخمی بھی ہوں اور بے در بھی ہو چکا ہوں اور فریب سے مجھے اپنے واجبات سے محروم کر دیا گیا ہے۔ مزید یہ کہ جنرل آکٹر لونی سے نہ میری دوستی رہی ہے اور نہ پہلے جیسے پر تپاک مراسم۔ کچھ دن اور انتظار کر لو تمھارے تمام کے تمام حقوق بالآخر بحال کر دیے جائیں گے۔

بعد میں جنرل آکٹر لونی کا انتقال ہو گیا اور سر چارلس مٹکاف کی آمد کا اعلان ہوا۔ احمد بخش خاں نے مجھ سے بہت سے وعدے کیے اور کہا'' خاموش اور مطمئن رہو۔ جب سر چارلس مٹکاف آئیں گے تو میں تمھارا ان سے تعارف کراؤں گا، تفصیل سے تمھارا مقدمہ ان کے سامنے پیش کروں گا اور بتاؤں گا کہ حکومت کے ساتھ تمھارے چچا کے تعلقات و مراسم کی نوعیت کیا تھی اور مستحق کو اس کا حق دلاؤں گا میں تم پانچوں کے نام حکومت کی جانب سے سند بنواؤں گا تا کہ میرے انتقال کے بعد میرے بچے تمھاری گزر اوقات کے لیے مقرر تنخواہ ادا کرنے میں نہ تو کوئی لیت و لعل کر سکیں اور نہ ہی کوئی دشواری پیدا کر سکیں۔

موصوف (سر چارلس مٹکاف) کی آمد کے بعد چوں کہ بھرت پور کا معاملہ ان کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا اور وہ راجہ کی امداد اور بھرت پور میں باغیوں کی گوشمالی کی جانب اپنی ساری توجہ مبذول کیے ہوئے تھے، اس لیے احمد بخش خاں نے کہا کہ مجھے اس سفر میں ان کے ساتھ جانا چاہیے باوجودیکہ میں اس زمانے میں اپنے بھائی کی علالت اور قرض خواہوں کے سخت تقاضوں کی وجہ سے اذیت ناک پریشانی میں مبتلا تھا اور بالکل اس سفر کے قابل نہیں تھا اس امید پر کہ موصوف (سر چارلس مٹکاف) کی طرف سے جو فرض منصبی مجھ پر عائد ہوتا ہے وہ ادا ہو جائے گا۔ میں نے اپنے بھائی کو بخار اور ہذیانی حالت میں چھوڑا، چار آدمی اس کی دیکھ بھال اور نگہداشت پر مقرر کیے، کچھ قرض خواہوں سے وعدے وعید کر کے انھیں راضی کیا، دوسروں سے (قرض خواہوں سے) چھپتا چھپاتا اور بھیس بدل کر کسی قسم کی سہولت کے بغیر بمشکل تمام

احمد بخش خاں کے ساتھ بھرت پور روانہ ہوگیا۔

بھرت پور کی فتح کے بعد میں نے احمد بخش خاں سے بات کی تاہم اُنھوں نے اب بھی سر چارلس مٹکاف سے میرا تعارف نہیں کروایا۔ اسی زمانے میں ان کے چہرہ پر فالج کا حملہ ہوا لیکن ڈاکٹر ڈنکن کے بہترین علاج سے بالاخر انھیں شفا حاصل ہوئی اور وہ فیروز پور واپس آگئے۔ سر چارلس مٹکاف نے اگرچہ فیروز پور میں تین روز قیام کیا اور میں تینوں دن روزانہ احمد بخش خاں سے التجائیں کرتا رہا لیکن اُنھوں نے میرا تعارف ان سے نہ کرانا تھا اور نہ کروایا۔

جب موصوف (سر چارلس مٹکاف) دہلی چلے گئے تو میں نے احمد بخش خاں سے وابستہ اپنی تمام امیدیں ختم کردیں اور اپنے دل میں کہا انصاف پسند حکمران اپنے جماعتوں میں سے ہر ایک کی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں اس لیے کیا ضرورت ہے کہ میں اس کام کے لیے احمد بخش خاں کے وسیلے اور اعانت کا سہارا لوں؟

بہتر یہ ہے کہ کسی اور کو بیچ میں ڈالے بغیر میں خود سر چارلس مٹکاف سے ملوں اور اپنا سارا احوال شروع سے آخر تک، بلا کم و کاست ان کی خدمت میں پیش کروں۔ تاہم قرض خواہوں کے تقاضوں کے خوف نے میرے لیے یہ ناممکن بنادیا کہ میں دہلی جاؤں۔ علاوہ اپنی نیک نامی کے خیال سے کہ اسے بٹہ نہ لگ جائے میں نے یہ ارادہ ترک کردیا۔ اس کے علاوہ ان ہی دنوں گورنر جنرل کی آمد کی خبر عام ہوئی اور امکان یہ تھا کہ سر چارلس مٹکاف گورنر جنرل کی ہم رکابی کے لیے تشریف لائیں گے تو میرے دل میں کانپور جانے اور وہاں سے ان کے خدم و حشم کے جلوس کے ساتھ واپس آنے اور راستے میں خود کو سر چارلس مٹکاف سے متعارف کرانے، اپنی عسرت و تنگ دستی کی ذلت بھری داستان بے چارگی اور قرض کا احوال ان کے گوش گزار کرنے اور انصاف حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ مختصر یہ کہ اس ارادے کے ساتھ میں فیروز پور سے فرخ آباد اور کان پور کی جانب روانہ ہوا۔ اتفاق دیکھیے کہ کان پور پہنچتے ہی میں بیمار پڑ گیا۔ اچانک نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ہلنے جلنے کی طاقت بھی جاتی رہی۔ چوں کہ مجھے اس شہر میں کوئی مناسب طبیب نہ مل سکا اس لیے مجبوراً دریائے گنگا کو عبور کر کے کرائے کی ایک فینس میں مجھے لکھنؤ کی راہ لینا پڑی۔ میں لکھنؤ میں پانچ ماہ اور چند روز صاحب فراش رہا۔ میں نے گورنر جنرل کی آمد کی خوش کن خبر سنی اور آں جناب سے ملاقات کے لیے شاہِ اودھ کے سفر کا حال سنا۔ ان دنوں میں اس قابل بھی نہ تھا کہ اپنے بستر سے اُٹھ سکوں۔ کیوں کہ لکھنؤ کی آب

دہوا مجھے کبھی راس نہ آئی۔

چوں کہ میرے اور نواب ذوالفقار علی بہادر کے آباواجداد میں دوستانہ مراسم زمانۂ قدیم سے چلے آرہے تھے اور میرے دل میں بھی نواب بہادر کے لیے بڑی محبت اور لگاؤ تھا اس لیے میں نے ایسی تدبیریں شروع کردیں کہ جس طرح بھی بن پڑے میں بندیل کھنڈ میں باندے پہنچ جاؤں۔ میں وہاں نواب صاحب کے دولت کدے پر چھ مہینے تک مقیم رہا۔ اللہ کے فضل اور نواب صاحب کی توجہ اور تیمارداری کی بدولت مجھے اس خطرناک بیماری سے شفا حاصل ہوئی۔ اس وقت تک موسم برسات گزر چکا تھا اور گورنر جنرل واپس کلکتہ جاچکے تھے۔ میں جب فیروز پور سے دہلی نہ جاسکا تو باندے سے کلکتہ کیسے جاسکتا تھا؟ اس کے علاوہ میں نے محسوس کیا کہ دہلی اور کلکتہ کے درمیان ہر جگہ ایک ہی قانون نافذ ہے اس لیے میں حکومت ہی کے انصاف پر اعتماد کروں گا۔

میں کشتی کے ذریعے سفر کرنے کے قابل بھی نہیں تھا، اس لیے مجبوراً دوتین نوکروں کے ساتھ آرام و آسائش کے کسی سامان کے بغیر خشکی کے راستے گھوڑے پر کلکتہ روانہ ہوا۔ ان دنوں میری حالت یہ تھی کہ میں بہت کمزور، ناتواں اور مضمحل تھا۔

میں جب مرشدآباد پہنچا تو مجھے احمد بخش خاں کے انتقال اور شمس الدین احمد خاں کی جانشینی کی خبر ملی لیکن چوں کہ میرا دعویٰ احمد بخش خاں کے موقف سے تھا لہٰذا میں نے سوچا کہ ان کی زندگی یا موت سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور میں کلکتہ پہنچ گیا۔

پچھلے بیس برس کے واقعات بیان کرنے کے بعد اب میں نصراللہ بیگ خاں کے خاں دان کے حالات کا خاکہ بیان کرتا ہوں۔ جس میں، میں نے اپنی شکایات بھی تفصیلاً بیان کی ہیں اور اپنے مخصوص مطالبات کا لب لباب بھی اجمالاً پیش کیا ہے۔

جناب عالی!

نصراللہ بیگ خاں کے متوسلین میں پہلا وہ شخص تھا جس کا نام خواجہ حاجی تھا جو اٹھارہ انیس سال احمد بخش خاں کے توسط سے دو ہزار روپیہ سالانہ وصول کرتا رہا اور جو ابھی تک احمد بخش خاں کی جاگیر سے اس کے بچوں کو مل رہا ہے۔ اس کی تاریخ یہ ہے نصراللہ بیگ خاں کے والد محترم کے زمانے میں جن کا نام قوقان بیگ خاں تھا۔ ایک نوجوان ہوا کرتا تھا جس کا نام خواجہ مرزا تھا اور جو پانچ روپیہ ماہانہ تنخواہ پر اسپ سواروں کے دستے میں بطور بارگیر ملازم تھا۔

قوقان بیگ خاں کی اہلیہ یعنی نصراللہ بیگ خاں کی ماں کی ایک بیوہ بہن تھی جن کی ایک غیر شادی شدہ بیٹی تھی۔ نصراللہ بیگ حان کی والدہ کسی دوسرے متوسل کی طرح اپنی بہن اور بھانجی کی کفیل اور محافظ تھیں۔

قوقان بیگ خاں نے اپنی بیوی کی بہن کی بیٹی کا عقد خواجہ مرزا سے کردیا اور یہ خواجہ حاجی ان ہی کا بیٹا تھا۔

سوائے اس کے کہ خواجہ حاجی کی والدہ نصراللہ بیگ خاں کی ماں کی بہن کی بیٹی تھی خواجہ حاجی اور نصراللہ بیگ خاں کے والدین کے درمیان نہ کبھی کوئی قرابت داری یا تعلق تھا اور نہ ہے۔

نصراللہ بیگ خاں کے جائز وارثوں میں ایک میری دادی، نصراللہ بیگ خاں کی والدہ تھیں، جن کے لیے احمد بخش خاں نے اپنی زندگی ہی میں پندرہ سو روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کردیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد یہ وظیفہ ان کی سب سے بڑی بیٹی کو ملتا رہا جو نصراللہ بیگ خاں کی سب سے بڑی بہن ہیں اور یہ وظیفہ انھیں اب بھی مل رہا ہے۔ وہ اپنی آمدنی اس طرح تقسیم کرتی ہیں کہ اس آمدنی کا ایک حصہ اپنی دو جوان بہنوں کو دے دیتی ہیں اور بقیہ رقم خود اپنی ضروریات پر خرچ کرتی ہیں لیکن چوں کہ بھائی اور ماں کے بہت سے پرانے گھریلو ملازمین اور وابستگان ان ہی کے پاس رہتے ہیں اس لیے ان کی قلیل آمدنی خود ان کی ضروریات کے لیے ناکافی ہوتی ہے چناں چہ انھوں نے اپنا بہت سا پرانا اثاثہ، ہر قسم کا ساز و سامان اور مال و متاع جو ان کے پاس تھا فروخت کردیا ہے اور کئی ہزار روپے کی مقروض بھی ہوگئی ہیں۔ وہ اسی امید کے ساتھ گزر بسر کر رہی تھیں کہ حکومت سے انھیں معاوضہ مل جائے گا، ان کی دو جوان بہنیں بھی اسی قلیل وظیفہ پر صبر و شکر اور جذبہ احسان مندی کے ساتھ گزر بسر کرنے پر مجبور ہیں جو انھیں ان کی بڑی بہن سے مل رہا ہے۔

میرے چچا نصراللہ بیگ خاں کے اور وارث نصراللہ بیگ خاں کے بھتیجے اور میرے بھائی یوسف علی خاں المعروف مرزا یوسف ہیں۔ ان کا معاملہ یہ ہے کہ احمد بخش خاں نے ان کے لیے ایک پھوٹی کوڑی بھی وقف نہیں کی اور اس بندوبست میں انھیں بالکل فراموش کردیا۔ اگرچہ وہ اکثر احمد بخش خاں کے پاس جاتے تھے اور گزراوقات کے لیے ان سے اعانت و امداد کی التجائیں کرتے تھے۔ احمد بخش خاں وعدوں سے ان کا منہ بند کردیتے اور کہتے کہ خواجہ حاجی کے مرنے کے بعد وہ انھیں کچھ نہ کچھ ضرور دیں گے اور بعض اوقات چرب زبانی، فریب اور خوشامد سے انھیں خاموش کردیتے تھے۔ ان کی گزر بسر کا ایک بڑا ذریعہ تو یہ تھا کہ وہ اپنے والد مرحوم کی

چھوڑی ہوئی املاک کو بیچ ڈالتے تھے اور کچھ اس طرح کہ تھوڑی بہت میں ان کی اعانت کردیا کرتا تھا۔

وہ نوجوان شادی شدہ تھے اور ان کے اخراجات میں بے پناہ اضافہ اور ان کی ذریعۂ معاش نہ ہونے کی پریشانی بدبختی اور غربت کے آلام و مصائب نے انھیں جنون کی ایک ایسی کیفیت میں مبتلا کردیا جس کے بعد رفتہ رفتہ وہ دماغی توازن کھو بیٹھے اور پاگل ہوگئے۔

میں مجبور تھا کہ سالانہ پندرہ سو روپے کی رقم میں سے چھ سو روپے ان کے علاج معالجے کے لیے علاحدہ کردوں۔ ان کی ایک بیوی ایک بیٹی ہے۔ بیٹی اس زمانے میں پیدا ہوئی تھی جب ان کا دماغ درست تھا۔ خادماؤں اور نوکروں کے علاوہ چار آدمی محض ان کی دیکھ بھال اور حفاظت پر مامور تھے۔ سالانہ چھ سو روپے جو میں دیتا ہوں وہ ملا کر ہزار روپے ان کے علاج پر خرچ ہوجاتے ہیں اور تنخواہوں کی ادائیگی اور گھر کے دیگر اخراجات کو پورا کرنے کے لیے ان کی بیوی اپنے زیورات اور اسباب فروخت کرتی رہتی ہے لیکن وہ بھی آخر کب تک اس قابل رہیں گی کہ اپنا اثاثہ بیچتی رہیں؟ انجام کار وہ کیا کریں گی؟ تاہم حال ہی میں گھر سے موصول ہونے والے ایک خط سے پتا چلا ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے اسے (مرزا یوسف) کو کچھ افاقہ ہوا ہے۔ قوی امید ہے کہ اس آزار سے انھیں مکمل شفا ہوجائے گی اور ان کی صحت ویسی ہی ہوجائے گی جیسی پہلے ہوا کرتی تھی اور یہ کہ حکومت کے التفات کی بدولت وہ مایوسیوں اور آزمائشوں کے بیس برس گزارنے کے بعد بالآخر اپنی تمام آرزوؤں اور تمناؤں کو پورا کرنے کے قابل ہوجائیں گے۔

نصراللہ بیگ خاں کا ایک اور جائز وارث میں آپ کا درخواست گزار محمد اسداللہ خاں المعروف مرزا نوشہ ہوں۔ احمد بخش خاں نے میرے گزارے کے لیے پندرہ سو روپے سالانہ مقرر کیے تھے۔ کچھ عرصے تک میں نے جائیداد اور اثاثہ جات جو میرے مرحوم والد نے چھوڑے تھے اور اپنے نانا غلام حسین جو آگرہ کے ممتاز امرا میں سے اور نواب نجف خاں کے درباری امیر تھے، کا خزانہ، اشیا اور املاک بیچ کر گزارہ کیا۔ بالآخر، ضرورت سے مجبور ہوکر میں دہلی گیا جو میرے آباواجداد کا اصل زاد بوم ہے۔ یہاں میں نے اپنے نانا اور والد کے تمام اثاثے جو میرے پاس بچ رہے تھے بیچ ڈالے اور قرض خواہوں سے قرض چکانے کے لیے رابطہ قائم کیا اور اس آمدنی سے قرض چکانے کے باوجود اس وقت بھی میں بیس ہزار روپے کا مقروض ہوں۔

اس زمانے میں میرا بھائی دماغی عارضے میں مبتلا ہوچکا تھا اور اس کی دیکھ بھال کے لیے مجھے

چھ سو روپے نکالنے پڑتے تھے اور میرے پاس قرض خواہوں کو ادا کرنے کے لیے نو سو روپے بچ رہتے تھے۔ دو تین نوکروں کے ساتھ بھیس بدل کر دہلی سے گھوڑے پر روانہ ہو گیا اور بھرت پور کی فتح تک میں نے احمد بخش خاں کے ساتھ رہنے کی اذیتیں محض اس لیے برداشت کیں تا کہ وہ اپنے وعدوں کو ایفا کریں۔ بالآخر قرض خواہوں کے واجب الادا قرضوں کے ڈر اور اپنی نیک نامی کی لاج کے خیال سے میں نے دہلی واپس جانا ناممکن خیال کیا اور کان پور چلا گیا۔ وہاں میں بیمار پڑ گیا اور پانچ مہینے کچھ دن لکھنؤ میں گزارے اور چھ مہینے تک بندیل کھنڈ میں باندے میں صاحبِ فراش رہا۔ اب دو مہینے سے میں یہاں ہوں جہاں انصاف کی گدی ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ اگر حکومت نے میرے ساتھ کی گئی ناانصافیوں کی تلافی کر دی اور میرے دعوؤں کی شنوائی کی تو بامراد و مطمئن اپنے گھر چلا جاؤں گا اور آرام سے زندگی بسر کروں گا اور اپنے غریب بھائی کی معالجے کی کوشش کروں گا اور اگر اربابِ حکومت میرے مقدمہ میں تحقیق کرنے کی زحمت گوارا نہیں کریں گے تو میں یہاں سے جدھر منہ اُٹھے گا چلا جاؤں گا، اپنے لباس کو تار تار کر دوں گا اور خاک چھانتا عرب اور دوسرے ممالک کے اجنبی شہروں میں ساری زندگی بھیک مانگ کر گزار دوں گا کیوں کہ اس اعزاز کے ساتھ کہ حکومت سے میرے مراسم بڑے اچھے ہیں میں ہندوستان میں کسی کے در پر بھیک مانگنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

میری شکایات کا لب لباب یہ ہے کہ حکومت نے احمد بخش خاں کو بیس بائیس ہزار روپے کی رقم واجب الادا ادائیگی سے اس لیے مستثنیٰ کیا تا کہ نصر اللہ بیگ خاں کے عزیز و اقارب کو دیے جاتے اور نصر اللہ بیگ خاں کے اسپ سوار دستے کی خدمات حاصل کرنے کے لیے خرچ کیے جاتے اور یہ کہ احمد بخش خاں نے ایک شخص کے ساتھ مل کر، جو نصر اللہ بیگ خاں کا ایک ملازم تھا اسپ سوار دستے کو فی الفور برطرف کر دیا اور بلا جھجک دستے کی خدمات اپنے لیے حاصل کر لیں اور یہ کہ نصر اللہ بیگ خاں کے خاندان کا وظیفہ موقوف کر کے صرف پانچ ہزار روپے کی رقم مقرر کی جس میں سے دو ہزار روپے اس سے خواجہ حاجی کو اس کی ان خدمات کے صلے میں دیے جو اس نے نصر اللہ بیگ خاں کے اسپ سوار دستے کو برباد کرنے میں انجام دی تھیں اور تین ہزار روپے سالانہ نصر اللہ بیگ خاں کی ایک بہن اور ایک بھتیجے کو دیے تا کہ یہ بات کہی جا سکے کہ نصر اللہ بیگ خاں کے قرابت داروں کو وظیفہ مل رہا ہے حالاں کہ حکومت نے نصر اللہ بیگ خاں کے عزیز و اقارب کے وظیفے کے لیے جو رقم مقرر تھی اس میں سے انھیں سالانہ تین ہزار روپے ملے اور وہ بھی پانچ میں سے صرف دو کو دوسرے تین اعزہ کو ان میں شامل ہی نہیں کیا گیا۔ بحیثیت مجموعی میں نہ تو احمد بخش خاں کی مقرر کی ہوئی رقم سے مطمئن ہوں اور نہ ان

کے رقم کی تقسیم کے طریقۂ کار سے اور اب میں مزید برداشت نہیں کرسکتا کہ میں اپنے حقوق کسی اور کے ہاتھوں سے وصول کروں اور نہ یہ برداشت کرسکتا ہوں کہ میرے ایک ادنیٰ ملازم کو میرے برابر کھڑا کردیا جائے۔

میرے مطالبے کا لب لباب یہ ہے کہ حکومت ہی میری سند، میری گواہ، میری سلامتی، میری شناخت اور میری طاقت وقوت کا سرچشمہ ہے۔ وہ ازراہِ مہربانی جنرل لارڈ لیک صاحب بہادر کے زمانے کے کاغذات اور وہ رپورٹیں ملاحظہ کرلے جو اُنھوں نے ۱۸۰۵ء سے ۱۸۰۶ء کے اختتام تک کلکتہ بھیجی تھیں۔ان سے پتا چلے گا کہ یہ جائیداد جس کی مالیت تین لاکھ روپے تھے۔حکومت نے صرف چند ہزار روپے کی مقررہ ادائیگی کے عوض احمد بخش خاں کو دی تھی اور پھر انھیں اس رقم کی ادائیگی سے مستثنیٰ بھی کردیا تھا۔۔۔آخر کیوں؟ اور کس لیے؟ اس لیے کہ یہ رقم نصراللہ بیگ خاں کے خاندان والوں کے وظیفے کے طور پر مقرر کی گئی تھی! حکومت کو چاہیے کہ وہ شمس الدین خاں سے اس تمام رقم کا حساب طلب کرے اگر ایسا ہو تو پتا چل جائے گا کہ نصراللہ بیگ خاں کے خاندان والوں کو پانچ ہزار روپے سالانہ سے زیادہ کبھی نہیں ملے۔

جیسا کہ میرے ادعا کے موجب خواجہ حاجی کی کارستانی اور نصراللہ بیگ خاں کے سواروں کے دستے کی بربادی ثابت ہوچکی ہے اس لیے وہ دو ہزار روپے یقیناً اس وظیفے کے حساب میں شامل نہیں کیے جائیں گے جو نصراللہ بیگ خاں کے عزیز واقارب کے لیے مقرر کیے گئے تھے اس لیے کہ استحقاق کے بغیر شراکت داری ناممکن ہوتی ہے۔ نہ ہی حکومت کو وہ رقم شامل حساب کرنی چاہیے جو اسپ سوار دستے کے لیے رکھی گئی تھی کیوں کہ اس کے لیے گھوڑوں اور سواروں کی موجودگی ایک ضروری شرط تھی لیکن جب گھوڑوں اور سواروں کا کوئی وجود ہی نہیں تو حکومت کا ان کے لیے کوئی بھتہ مقرر کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ حکومت کو احمد بخش خاں کی جاگیر سے تقاضا کرنا چاہیے کہ وہ ۱۸۰۶ کے آغاز سے اسپ سوار دستے کے لیے مقرر کیا گیا الاؤنس واپس کرے اور اسے سرکاری خزانے میں جمع کرائے کیوں کہ میرا اور میرے ساتھیوں کا اس روپے پر کوئی دعویٰ نہیں۔ نصراللہ بیگ خاں کے عزیز واقارب کا وظیفہ کچھ بھی ہو، حکومت کو اس میں سے تین ہزار روپے سالانہ کے حساب سے منہا کرلینا چاہیے اور بقیہ رقم احمد بخش خاں کی جاگیر سے لینی چاہیے اور جب یہ ساری رقم سرکاری خزانے میں جمع ہوجائے تو پھر حکومت کو نصراللہ بیگ خاں کے متوسلین کے بارے میں جانچ پڑتال کرنی چاہیے اور میرے بیانات کے مطابق اگر یہ ثابت ہوجائے کہ دو بھتیجے اور تین بہنیں نصراللہ بیگ خاں کی وارث ہیں تو گزشتہ برسوں کی رقم پانچ افراد میں ان کے دعوؤں، استحقاق اور ان میں سے ہر فرد کی عسرت و مفلسی

کے مطابق تقسیم کردی جانی چاہیے۔ ؎

اور آئندہ کے لیے یہ متعین کر دیا جانا چاہیے کہ حکومت کو واجب الادا اصل رقم سرکاری خزانے میں جمع کرائی جائے اور حکومت نصر اللہ بیگ خاں کے دو بھتیجوں اور تین بہنوں کی گزراوقات کے لیے، ان کے حقوق و استحقاق کے مطابق ان میں سے ہر ایک کے انفرادی اخراجات کو ملحوظ رکھتے ہوئے وظیفے کی جو تقسیم کرے اس کے مطابق ہر ایک کو جداگانہ سند جاری کی جائے تاکہ ہر ایک کو دہلی کے خزانے سے فرداً فرداً وظیفہ ملنے لگے اور وہ سب مملکت کی ابدی فلاح و بہبود کے لیے ہمیشہ دست بہ دعا رہیں اور اراکین حکومت کی انصاف پسندی اور عدل گستری کا ڈنکا ساری دنیا میں بجتا رہے۔ حکومت کی واجب الادا رقم محفوظ ہوجائے اور ہم پانچوں ستائے ہوئے لوگوں کو ان کا حق دوبارہ حاصل ہوجائے۔

یہ سیاسی روئداد ۲رمئی ۱۸۲۸ء کو لکھی گئی اور ۱۵ر اپریل ۱۸۲۸ء کو پیش کی جانے والی عرض داشت گورنر جنرل کے نام ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ کلکتے میں جب غالب سائمن فریزر سے ملنے گئے تو فریزر نے پوچھا کہ 'نواب گورنر جنرل کے لیے کوئی درخواست لائے ہو؟ تو بقول غالب میں نے وہ قطعۂ درخواست گریبانِ قبا سے نکالا اور انھیں پیش کردیا۔"

اس عرض داشت کے اہم نکات ہیں:

نصر اللہ بیگ خاں ہاتھی سے گر پڑے اور ایسی چوٹ لگی کہ جاں بر نہ ہوسکے۔ لاولد تھے، اُن کے حسبِ ذیل ورثا تھے:

i: غالبؔ (نصر اللہ بیگ خاں کے بھتیجے)

ii: دوسرے بھتیجے مرزا یوسف (غالبؔ کے چھوٹے بھائی)

iii: نصر اللہ بیگ خاں کی والدہ

iv: نصر اللہ بیگ خاں کی تین بہنیں

v: خواجہ حاجی نامی ایک شخص نصر اللہ بیگ خاں کے گھرانے کا ملازم تھا۔ اس نے نصر اللہ بیگ کے سارے مال و متاع، فرنیچر، خیمہ، اونٹوں، پالکیوں وغیرہ پر قبضہ کرلیا اور ستر اسّی سواروں، ایک ہاتھی اور تمام سامانِ حرب کے ساتھ نصر اللہ بیگ خاں کے سسر نواب احمد بخش خاں سے جاملا۔

vi: اس زمانے میں حکومت نے ہمیشہ کے لیے فیروز پور، جھرکہ، پونا ہانا، نگینہ سانکرس (Sankurus) اور دوسرے اضلاع (تین لاکھ روپے سالانہ کی جاگیر) نواب احمد بخش خاں کو اس شرط پر دے دیے کہ وہ پچیس ہزار روپے سالانہ برطانوی حکومت کے خزانے میں داخل کرتے رہیں گے۔

vii-نواب احمد بخش خاں نے جنرل لیک سے درخواست کی کہ سونک اور سونسا کے جاگیردار نصر اللہ بیگ خاں کا انتقال ہوگیا ہے۔ وہ اپنے پیچھے پچاس سوار اور بہت سے عزیز و اقارب چھوڑ گئے ہیں۔ اس کی منظوری دی جائے کہ یہ پچاس سوار ہمیشہ میری سپردگی میں رہیں اور حکومت کو ضرورت پڑنے پر وہ یہ سوار پیش کردیں نیز عزیز و اقارب کے اخراجات کی رقم ادا کرنے کی بھی منظوری دی جائے۔ فیروز پور جھرکہ، پونا ہانا وغیرہ کے معاوضے کے طور پر پچیس ہزار روپے کی جو رقم سالانہ ادا کرنی ہوتی ہے، وہ معاف کردی جائے۔ اس میں سے پندرہ ہزار روپے سالانہ پچاس سواروں پر خرچ ہوں گے اور دس ہزار روپے سالانہ نصر اللہ بیگ کے وارثوں میں تقسیم کیا جاتا رہے گا۔ حکومت نے یہ درخواست منظور کرلی۔

viii-نواب احمد بخش خاں نے خواجہ حاجی کو کچھ عرصے ملازم رکھ کر برطرف کردیا۔ اُنھوں نے اعلان کیا کہ حکومت نے پانچ ہزار کی جو رقم نصر اللہ بیگ کے عزیز و اقارب کی کفالت کے لیے بطور پنشن مقرر کی ہے۔ اس کی تقسیم اس طرح ہوگی:

۱-خواجہ حاجی	۲۰۰۰/- روپے سالانہ
۲-نصر اللہ بیگ خاں کی والدہ	۱۵۰۰/- روپے سالانہ
۳-غالب اور اُن کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف	۱۵۰۰/- روپے

ix-غالبؔ کا کہنا تھا کہ حکومت نے پانچ ہزار نہیں دس ہزار روپے سالانہ طے کیے تھے۔

x-بقول غالبؔ نواب احمد بخش خاں نے اپنے ایک ملازم کو نصر اللہ بیگ خاں کے وارثوں میں شریک کردیا ہے، جو صریحاً غلط تھا۔

xi-غالبؔ کا یہ بھی کہنا تھا کہ حکومت نے پچاس سواروں کے خرچ کے طور پر پندرہ ہزار روپے سالانہ رقم مقرر کی تھی۔ چوں کہ سواروں کا یہ دستہ تحلیل کردیا گیا ہے۔ اس لیے نواب احمد بخش خاں کو یہ رقم حکومت کو واپس کرنی چاہیے۔

xii - غالبؔ کے تین مطالبے تھے۔حکومت کو چاہیے کہ نصراللہ خاں کے وارثوں کا خود تعین کرے۔

xiii - ہر ایک وارث کو الگ الگ پنشن دی جائے ، غالبؔ کو ان سب حصّہ داروں کا نگراں بنایا جائے۔

xiv - نواب احمد بخش خاں نے جو رقم نصراللہ بیگ خاں کے جائز وارثوں کو نہیں دی اور جو رقم پچاس سواروں کے دستے پر خرچ نہیں کی وہ سب نواب صاحب کی جاگیر سے وصول کی جائے۔

xv - چوں کہ نواب احمد بخش کا نصراللہ بیگ خاں سے کوئی تعلق نہیں تھا،اس لیے یہ پنشن سرکاری خزانے سے ادا کی جائے۔

اب خواجہ حاجی کے لڑکوں کے سگے ماموں مرزا افضل بیگ خاں کی طرف سے پیش ہونے والا جواب دعوے ملاحظہ ہو:

افضل بیگ خاں کی طرف سے دائر کردہ جواب دعویٰ مورخہ ۸ر مارچ ۱۸۳۰ء کی نقل

(فارسی سے اردو)

غریب پرور سلامت!

افضل بیگ خاں جو خواجہ شمس الدین عرف خواجہ جان اور خواجہ بدرالدین عرف خواجہ امان پسرانِ خواجہ حاجی مرحوم نمک پروردہ سرکاری عالیہ کا مختار ہے، کی جانب سے اسداللہ خاں کی عرضی کا جواب حسبِ ذیل ہے:

۱۸۰۶ء میں فیروز پور جھرکہ، سانگرس، پونا، ہانا، وبچھورو، نگینہ کی جاگیریں نواب احمد بخش خاں کو استمراری حق (لگان داری) پر مع سند دس مخصوص شرائط کے مطابق نسلاً بعد نسل عطا ہوئیں۔

اوّل: یہ کہ مرزا نصراللہ بیگ خاں مرحوم کے زیرِ کفالت افراد خواجہ وغیرہ کی پرورش اور دیکھ بھال نواب موصوف کے ذمہ ہوگی۔

دوم: یہ کہ پچاس سوار بوقتِ ضرورت سرکار کے لیے حاضر کیے جائیں ۔اگر چہ نواب موصوف نصراللہ بیگ مرحوم کے زیرِ کفالت افراد یعنی خواجہ حاجی وغیرہ کو صرف پانچ ہزار روپے سالانہ

دیتے تھے یعنی مبلغ دو ہزار روپے خواجہ حاجی کو مبلغ ایک ہزار پانچ سو روپے مرحوم کی بہنوں کو ایک ہزار پانچ سو روپے اسداللہ خاں اور مرزا یوسف کو جو نصراللہ بیگ خاں مرحوم کے بھتیجے تھے سالانہ ملتے تھے۔ گزشتہ سال اسداللہ خاں نے اولاً شرکا کی رضامندی سے نواب احمد بخش مرحوم کے ورثا کے خلاف تنخواہ میں اضافے کے لیے ایک عرضی حضور کی خدمت میں پیش کی۔ ثانیاً طمع اور بے انصافی کے تحت خواجہ حاجی خاں کے بیٹوں کو ان کے حق سے محروم کرنے کے لیے ایک دوسری عرضی پیش کی اور خواجہ حاجی کے بیٹوں کی، جو اسداللہ بیگ کے لیے بھی واجب الاحترام بزرگ ہیں، تحقیر و تذلیل کو مفید مطلب سمجھتے ہوئے لکھا کہ خواجہ حاجی ہرگز اس امر کے مستحق نہیں کہ سرکار ان کی کفالت کا اہتمام کرے۔

غریب پرور! دشمنی اور کینہ پروری نے اسداللہ خاں کے ذہن کو بالکل ماؤف کر دیا ہے یہاں تک کہ اس نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ حکومت کے اہل کاروں کو امورِ مملکت کے انتظام میں تعلیم دینے پر کمربستہ ہے اور حکومت کے خیرخواہوں کی درجہ بندی اور کفالت کے سلسلے میں کسی کوتاہی کو سرکاری اہل کاروں کی غفلت پر محمول کرتا ہے۔ اگر سرکاری اہل کاروں کو خواجہ حاجی کی خیرخواہی اور خدمت گزاری پر مکمل اعتماد نہ ہوتا اور خواجہ حاجی خاں کی نصراللہ بیگ مرحوم کی معیت میں حسنِ خدمت کے صلے کے طور پر خواجہ حاجی اور اس کی اولاد کی کفالت سرکاری اہل کاروں کی خصوصی توجہ کا مرکز نہ ہوتی تو خواجہ حاجی کا نام نصراللہ بیگ مرحوم کے زیرِ کفالت افراد کے زمرے میں شامل نہ ہوتا اور حضور کی جانب سے عطا کردہ سند میں اس کا نام کمپنی انگریز بہادر کی حکومت کی سرپرستی کے مستحق افراد میں درج نہ ہوتا۔ دیگر دلائل سے قطع نظر سند کی عبارت بلاشبہ خواجہ حاجی مرحوم کے لازوال استحقاق کے لیے ایک ناقابلِ تردید دلیل ہے۔

ثانیاً: اسداللہ خاں خواجہ حاجی کے بیٹوں کی رسوائی کی غرض سے لکھتا ہے کہ خواجی حاجی یعنی فدوی کے بھانجوں کا باپ نصراللہ بیگ خاں کا غلام زادہ اور نمک خوار تھا۔ خواجہ مرزا، خواجہ حاجی کا باپ نصراللہ بیگ خاں کے باپ کے پاس صرف پانچ روپے ماہانہ پر بطور سائیس ملازم تھا لیکن خاں مذکور کو اپنے بیان کے تناقص کی پرواہ کیے بغیر دوبارہ لکھتا ہے کہ نصراللہ بیگ خاں کی ماں نے اپنی بھانجی کا نکاح جو اس بزرگ خاتون کو اپنی بیٹی کی طرح عزیز تھی خواجہ مرزا کے ساتھ کر دیا اور خواجہ حاجی مرحوم بن خواجہ مرزا اسی بیٹی کے بطن سے ہے۔ غریب پرور! نصراللہ بیگ خاں کی ماں اور اسداللہ خاں کی دادی کی حالت پر تاسف ہے کہ بقول اسداللہ خاں اس نے اپنی بھانجی کا نکاح کمال رضامندی کے ساتھ ایک غیر اور گھٹیا شخص کے ساتھ کر دیا۔ حیف ہے اسداللہ خاں کے حال پر کہ وہ خواجہ حاجی کے لیے جو اس کی دادی کی بھانجی کا بیٹا

ہے۔غلام زادہ اور اسی قسم کے دوسرے ہتک آمیز الفاظ استعمال کرتا ہے۔حالاں کہ یہ شخص (اسداللہ خاں) خود گھٹیا ہے۔نصراللہ بیگ خاں کی ماں یعنی اس (اسداللہ خاں) کی دادی نے اپنی بہن کی عزت افزائی و خاطر داری کے لیے خواجہ حاجی کو دودھ پلایا اور اپنے بیٹوں سے کہا کہ جب خواجہ حاجی جوان ہو جائے تو کوئی اس سے پردہ نہ کرائے لیکن اسداللہ خاں اپنے بزرگوں کے برعکس اپنی دادی کی بہن اور اس کی اولاد کی قدر افزائی کی بجائے ان کی عزت کو حاکمانِ وقت کے حضور بار بار اپنی زبان درازی سے مجروح کرتا ہے اور اپنے بزرگوں کی توہین وتحقیر کو اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھتا ہے۔غریب پرور! اسداللہ خاں اولاً خواجہ حاجی خاں سے کسی قسم کی رشتہ داری سے انکار کرتا ہے اور خواجہ حاجی کو صرف نصراللہ بیگ خاں کے نوکروں کے زمرے میں شمار کرتا ہے اور آخر کار نصراللہ بیگ مرحوم اور خواجہ حاجی مغفور کے درمیان کمزور تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔

خانِ مذکور پر یہ بات پوشیدہ نہ ہوگی کہ خواجہ حاجی مرزا نصراللہ بیگ خاں مرحوم کے زیرِ کفالت افراد میں سب سے اوّل نمبر پر ہے۔سند کی عبارت نصراللہ بیگ خاں مرحوم کے زیرِ کفالت افراد یعنی خواجہ حاجی کی کفالت ونگہداشت وغیرہ ان کے ذمہ ہے اس امر پر صریحاً دلالت کرتی ہے۔لغوی طور پر توسل کے معنی ہیں کسی چیز کے واسطے سے نزدیکی چاہنا اور توسل الیہ سے مراد ہے (بوسیلہ الی القرب الیہ بعمل)۔اس صورت میں خواجہ حاجی پر لفظ متوسل کا اطلاق دوسروں کی نسبت نہایت صحیح اور واضح ہے۔عرف عام میں متوسلین کا لفظ ان رشتہ داروں، دوستوں اور غیروں پر صادق آتا ہے جن کا تعلق کسی دوسرے شخص سے ہو۔ چناں چہ گورنر جنرل بہادر کا متوسل اور نامور بادشاہوں کے متوسلین وغیرہ کا لفظ خواص کے لیے استعمال ہوتا ہے۔خواجہ حاجی جو نصراللہ بیگ خاں کی خالہ کا نواسا ہے اور مہمات کے انتظام میں بھی ان کے ساتھ رہا ہے، قرابت داری اور دوستی کے اعتبار سے نصراللہ بیگ خاں مرحوم کے خصوصی متوسلین میں سے ہے اور دوسرے اشخاص نصراللہ بیگ خاں کے عمومی متوسلین میں داخل ہیں۔ چناں چہ سند میں متوسلین سے متعلق جو عبارت درج ہے وہ ان ہی حقائق کے مصداق ہے اور نصراللہ بیگ خانِ مرحوم کی رفاقت میں خواجہ حاجی کے خدمات، جانفشانی اور اعتبارات کے پیشِ نظر سرکاری اہل کار، خواجہ حاجی مرحوم کی اس پرداخت کو اوّلین اور اہم تصور کرتے ہوئے خواجہ حاجی مذکور اور اس کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں کی کفالت کرتے چلے آرہے ہیں۔غریب پرور سلامت! اسداللہ خاں، خواجہ حاجی اور اس کے بیٹوں کو حق سے محروم کرنے کی خاطر معلی القاب جارج بارلو گورنر جنرل بہادر کی عطا کردہ سند کو، جس پر خواجہ حاجی اور اس کے بیٹوں کے

دعویٰ اور اسداللہ خاں اور اس کے بھائی اور نصراللہ بیگ خاں مرحوم کی بہنوں کی مخالفت کا دارومدار ہے، ساقط الاعتبار قرار دیتا ہے اور بیان کرتا ہے کہ حضور کی سند میں خواجہ حاجی کے نام کا اندراج نواب احمد بخش خاں مرحوم کی غلط بیانی کی وجہ سے ہے کیوں کہ نواب احمد بخش خاں نے خواجہ حاجی کو اپنے معاملات کا رازدار بنا رکھا تھا۔ انصاف پرور! اس صورت میں کہ نواب احمد بخش خاں مرحوم کو سندِ استمراری کا اجرا اور خواجہ حاجی وغیرہ نصراللہ بیگ خاں متوسلین کو سرکار کی طرف سے تنخواہ کا حصول سپہ سالار نامدار جنرل لارڈ لیک بہادر کے تجربہ و تحقیق کی بنا پر نہیں بلکہ اس کا دارومدار احمد بخش کی بدنیتی اور غلط بیانی پر تھا سندِ استمراری اور دائمی تنخواہ کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا، اس لیے کہ جس شے کی بنیاد ہی دھوکہ اور فریب پر ہو وہ قابلِ اعتبار و استمرار نہیں ہوسکتی۔ چناں چہ خواجہ حاجی اور اس کے بیٹوں کے حق کو غلط ثابت کرنے کی خاطر اسداللہ خاں نے خود اپنے حق کا ابطال بھی کر دیا ہے۔ اس سے اسداللہ خاں کے طمع و حرص اور واضح عناد کے سوا کچھ اور ظاہر نہیں ہوتا۔

غریب پرور! اس کے باوجود کہ سرکاری اہل کاروں نے خواجہ حاجی وغیرہ متوسلین نصراللہ بیگ خاں مرحوم جو سرکار کے جاںنثار رہے ہیں، کی کفالت و نگہداشت کا ہر صورت تہیہ کر رکھا ہے۔ اسداللہ خاں غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے ظاہر کرتا ہے کہ چوں کہ سرکار نے نصراللہ بیگ مرحوم کے قریبی رشتہ داروں کی پرورش اپنے ذمّہ لی تھی لہٰذا وہ رقم جو خواجہ حاجی اور اس کے بیٹوں کو بغرض پرورش دی جاتی ہے اسے نصراللہ بیگ خاں مرحوم کے رشتہ داروں کی پرورش اور نگہداشت پر محمول نہ کیا جائے۔ انصاف پرور! سرکاری اہل کاروں کی نیت اور ارادے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں بلکہ کونسل کی جانب سے عطا کردہ سند کی عبارت سرکار کے اس ارادے پر صریحاً دلالت کرتی ہے اور اسداللہ خاں یا کسی دوسرے کی تشریح و توضیح کی محتاج نہیں۔ افسوس کہ اس حرص کے بندے کو یہ بھی معلوم نہیں کہ اگر خواجہ حاجی اپنے نام کی صراحت کے باوجود سرکاری پرورش کا مستحق نہیں تو نصراللہ بیگ خاں مرحوم کے زیرِ کفالت افراد کے علاوہ دیگر افراد جن میں اسداللہ خاں کا نام بھی شامل ہے اور جن کا ذکر سند وغیرہ میں ہے کسی طرح بھی سرکار کی طرف سے پرورش کے مستحق نہیں ٹھہرتے۔ اسداللہ خاں کی درخواست کی عبارت سے ظاہر ہے کہ نصراللہ بیگ خاں کے دونوں بھتیجے یعنی اسداللہ خاں و مرزا یوسف استمراری کے اجرا اور تنخواہ کے تقرر کے وقت کم سن یا بے خبر نہ تھے اس صورت میں ظاہر ہے کہ خواجہ حاجی نے جو کہ نصراللہ بیگ خاں کے قرابت داروں میں سے ایک ہے ان (نصراللہ بیگ) کی رفاقت میں سرکار دولت مدار کی خدمات

سرانجام دی تھیں۔اس لیے ایسے آدمی، جس نے بذاتِ خود خدمت و جاں نثاری کی ہو، کے مقابلے میں ناسمجھ لڑکوں کا استحقاق فائق نہیں ہوتا۔غریب پرور! اسداللہ خاں کے بیان سے یہ ظاہر ہے کہ نصراللہ بیگ کے بھتیجے سند کے حصول سے قبل اس سے بالکل بے خبر تھے بلکہ مقامِ افسوس ہے کہ ابھی بھی ان میں سے ایک یعنی مرزا یوسف پاگل ہے اور شریعت کا مکلف نہیں ہے اور دوسرے کا مزاج اکثر و بیشتر قمر کے زوال و کمال کے ساتھ ساتھ اعتدال سے تجاوز کر جاتا ہے۔عین ممکن ہے کہ یہ عرضی جو خاندان اور عزیزوں کی رسوائی اور ذلت کا مرقع ہے۔آثارِ قمر کے غلبہ کے موقع (پر) تحریر کی گئی ہو۔اسداللہ خاں نے عرضی کے آخر میں اپنے سوءِ ظن کے اظہار میں بعض فضول باتیں بھی کی ہیں اسداللہ خاں کا یہ واضح ہذیان اس قابل نہیں کہ اس کا سرکار جواب دے یا اس پر غور کرے۔

غریب پرور! مذکورہ بالا محالات نواب احمد بخش خاں کو نسل در نسل دو خاص شرائط یعنی خواجہ حاجی وغیرہ متوسلین نصراللہ بیگ خاں کی کفالت وحسبِ طلبِ سرکار کے حضور پچاس سوار حاضر کرنے پر عطا ہوئی تھی۔اس صورت میں ظاہر ہے کہ ان دو شرائط پر محالات دواماً عطا کرنے سے سرکار دولت مدار کے پیش نظر اور ملحوظ خاطر یہ ہے کہ علیٰ ہذاالقیاس یہ دو شرائط کی نوعیت بھی مدامی و مستقل ہے۔لہٰذا آپ کی انصاف پروری سے مجھے امید واثق ہے کہ آپ نواب موصوف کے ورثا کے نام فرمان صادر فرمائیں گے۔نواب احمد بخش کے اس معاہدے کے مطابق جو سرکاری اہل کاروں کے ساتھ طے پایا ہے مبلغ چار ہزار روپے سالانہ تنخواہ اور باقی ماندہ رقم بھی خواجہ حاجی کے بیٹوں کو جو سرکار دولت مدار کے نمک خوار ہیں عطا فرمائیں اور آئندہ اس سلسلے میں کسی تنگ چشمی اور غفلت کا مظاہرہ نہ کیا جائے تاکہ آپ کے یہ پرانے نمک خوار مع قبیلوں اور خانوادوں کے آپ کی حکومت کی سلامتی و درازی کے لیے دعا گو رہیں۔

(مورخہ: ۸؍مارچ ۱۸۳۰ء، افضل بیگ، مقام کلکتہ عبدہ افضل بیگ)

افضل بیگ خاں کی طرف سے پیش ہونے والے جواب دعوے کے چند اہم نکات ہیں:

۱- گزشتہ سال غالبؔ نے اولاً شرکا کی رضامندی سے نواب احمد بخش مرحوم کے ورثا کے خلاف تنخواہ میں اضافے کے لیے ایک عرضی حضور میں پیش کی۔

۲- بعد میں خواجہ حاجی کے بیٹوں کو اُن کے حق سے محروم کر.نے کے لیے ایک دوسری عرضی پیش کی کہ خواجہ حاجی نصراللہ بیگ خاں کے ورثا میں نہیں ہیں۔اس لیے اُن کے بیٹوں کو دی

جانے والی پنشن بند کی جائے۔

۳- دشمنی اور کنبہ پروری نے اسداللہ خاں کے ذہن کو ماؤف کر دیا ہے۔ اب وہ سرکاری اہل کاروں پر الزام تراشیاں کرتے ہیں نیز سرکاری افسروں کو امورِ مملکت کے انتظام میں تعلیم دیتے ہیں۔

۴- اسداللہ خاں ایک طرف دعویٰ کرتے ہیں کہ خواجہ حاجی کے والد اُن کے دادا کے پاس پانچ روپے ماہوار پر بطور سائیس ملازم تھے اور دوسری طرف کہتے ہیں کہ نصراللہ بیگ کی والدہ (یعنی اسداللہ خاں کی دادی) کی ایک بھانجی تھیں جو انھیں بیٹی کی طرح عزیز تھیں۔ دادی نے اس لڑکی کی شادی خواجہ مرزا سے کردی۔ خواجہ حاجی خواجہ مرزا اور اسی لڑکی کے صاحب زادے ہیں اگر اسداللہ خاں کے دونوں بیان درست ہیں تو حیرت ہے کہ ایسے اعلا خاندان کی لڑکی کی شادی ایک سائیس کے ساتھ کیسے کر دی گئی؟

۵- مرزا افضل بیگ کا کہنا ہے کہ اسداللہ خاں کی دادی نے خواجہ حاجی کو اپنا دودھ بھی پلایا تھا۔

۶- پنشن سے متعلق سند میں کہا گیا ہے کہ نصراللہ بیگ خاں مرحوم کی زیرِ کفالت یعنی خواجہ وغیرہ کی کفالت و نگہداشت، اس سند میں صرف ایک نام لیا گیا ہے اور وہ ہے خواجہ حاجی کا، جس سے خاندان میں اُن کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

۷- اسداللہ خاں خواجہ حاجی کے بیٹوں کو اُن کے حق سے محروم کرنے کے لیے جارج بارلو گورنر جنرل بہادر کی عطا کردہ سند کو جعلی بتاتے ہیں۔ اگر یہ سند جعلی ہے تو خواجہ حاجی اور اُن کے لڑکے اسداللہ خاں اور اُن کے خاندان کے دوسرے ورثا میں کوئی بھی پنشن کا حق دار نہیں ہے۔

۸- اسداللہ خاں کا بھائی پاگل ہے اور شریعت کا مکلّف نہیں ہے۔ نیز اسداللہ خاں کا مزاج اکثر و بیشتر قمر کے زوال و کمال کے ساتھ ساتھ اعتدال سے تجاوز کر جاتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ یہ عرضی جو خاندان اور عزیزوں کی رُسوائی اور ذلّت کا مرقع ہے، آثارِ قمر کے غلبے کے موقع پر تحریر کی گئی ہو۔

۹- جوابِ دعوے کے آخر میں درخواست کی گئی ہے کہ 'نواب احمد بخش کے اس معاہدے کے مطابق جو سرکاری اہل کاروں کے ساتھ طے پایا ہے۔ مبلغ چار ہزار روپے سالانہ تنخواہ اور باقی ماندہ رقم بھی خواجہ حاجی کے بیٹوں کو عطا فرمائی جائے۔'

غالبؔ کے دعوے کے جواب میں نائب معتمد اینڈریو اسٹرلنگ نے مورخہ ۵رمئی ۱۸۳۰ء کو ایف ہاکنز کے نام ایک خط میں گورنر جنرل کی اطلاع کے لیے لکھا کہ میری رائے میں اسداللہ خاں کو اُس سے زیادہ مطالبہ کرنے کا حق نہیں جتنا لارڈ لیک صاحب بہادر نے اُن کے اور اُن کے بھائی مرزا یوسف کے لیے مقرر کر دیا تھا یعنی پندرہ سو روپے سالانہ جو نواب شمس الدین خاں ہمیشہ ادا کرنے کے لیے تیار رہے ہیں۔'

دہلی کے قائم مقام ریذیڈنٹ نے غالبؔ کی عرض داشت کی نقل نواب شمس الدین خاں کو بھیج کر تفصیلی وضاحت طلب کی۔ نواب صاحب نے وضاحت میں جو خط لکھا، اس کے اہم نکات ہیں:

۱- اسداللہ خاں نے اپنی عرض داشت میں جن ناانصافیوں کا ذکر کیا ہے اور جن کے ازالے کے لیے وہ رجوع کرنے پر مجبور ہوئے ہیں، اس سے پتا چلتا ہے کہ نصراللہ خاں صاحب کے عزیز و اقارب کی کفالت کے لیے جو رقم مقرر کی گئی تھی۔ اُس کی مقدار سے وہ ناواقف ہیں۔

۲- اسداللہ خاں اپنے حصّے کی رقم ہمیشہ وصول کرتے رہے ہیں اور اس کی رسیدیں دفتر میں جمع کراتے رہے ہیں لیکن اب وہ مقررہ رقم سے اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں۔

۳- اسداللہ خاں شاعر ہیں اور شاعر ہونے کی حیثیت سے انھیں آزادی حاصل ہے کہ اپنی عرض داشت میں جس قدر چاہیں، مبالغہ آرائی سے کام لیں۔

۴- نواب شمس الدین نے لارڈ لیک کے احکامات کے حوالے سے پنشن کی رقم کی درج ذیل تفصیل بیان کی۔

i- اسداللہ خاں نے پچاس سواروں کے سلسلے میں جو اعتراض کیا ہے۔ یہ معاملہ میرے اور سرکار کے درمیان ہے۔ اسداللہ خاں کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ii- اسداللہ خاں صاحب نے وظائف میں اضافے کا مطالبہ کیا ہے، اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مجھے نصراللہ خاں مرحوم کے ورثا کے لیے جو رقم ملتی ہے، میں اُن کو دے دیتا ہوں۔

کلکتے میں ایک سرکاری افسر تھے سائمن فریزر جو بہت اہم عہدے پر فائز تھے۔ غالبؔ نے اُن کے بارے میں لکھا ہے کہ 'عہدے کے لحاظ سے سائمن فریزر دادخواہوں اور منصفوں کے درمیان بلکہ سارے اہلِ حاجات و صاحبانِ کونسل کے درمیان ایک واسطہ ہیں۔' مطلب یہ کہ تمام انصاف چاہنے والوں کی درخواستیں پہلے سائمن فریزر کے پاس پہنچتی تھیں اور پھر اُن

کے حکم پر مزید کارروائی ہوتی تھی:

ایک دن غالبؔ سائمن فریزر کے پاس پہنچ گئے۔ سائمن نے بقول غالبؔ کھڑے ہو کر اُن کی تعظیم کی اور بغل گیر ہوئے۔ غالب نے اپنا پورا مقدمہ اُنھیں سمجھایا۔ اُنھوں نے پوچھا کہ مقدمے کے سلسلے میں کوئی عرض داشت لائے ہو۔ غالب نے گریبانِ قبا سے گورنر جنرل کے نام عرض داشت نکال کر سائمن فریزر کو پیش کر دی۔ فریزر سے غالب کی پہلی ملاقات غالباً اسی دن ہوئی تھی۔ غالب نے فریزر کے نام ایک عرض داشت لکھی تھی۔ اس کا پورا اِمکان ہے کہ اسی ملاقات میں فریزر کو یہ عرض داشت پیش کی ہو۔ عرض داشت درجِ ذیل ہے:

مسٹر فریزر کے نام اسد اللہ خاں غالبؔ کے مراسلہ مورخہ ۲۸؍اپریل ۱۸۲۸ء کی نقل (فارسی سے اردو)

صاحب والا مناقب، والا شان، عادل باانصاف، فیض پہنچانے والے،

آپ کا شان و شکوہ قائم رہے۔

خدمت عالی میں عرض گزار ہوں کہ فدوی سرکار عالی مقام کمپنی انگریزی بہادر دام اقبالہ، کے متوسلین، پرورش یافتگان اور نمک خواروں میں سے فدوی کے سگے چچا نصر اللہ بیگ خاں، اعلیٰ خوبیوں کے مالک جرنیل لارڈ لیک صاحب بہادر کے عہد میں سرکار کی طرف سے چار سو سواروں کے رسالے کا افسر اور سرکار کی جانب سے ایک لاکھ روپے کی جاگیر کا مالک تھا۔ اس کی وفات کے بعد اس کے لواحقین کی پرورش کے لیے احمد بخش خاں جاگیردار میوات کی جاگیر سے سرکار نے وظیفہ مقرر کیا۔ چوں کہ میں اس رقم کے تعین اور احمد بخش خاں کے طریقۂ تقسیم سے راضی نہیں ہوں، اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے خود کلکتہ آیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ نواب والا القاب گورنر جنرل بہادر کی خدمت میں اپنی درخواست پیش کروں۔ صاحب ریذیڈنٹ شاہ جہان آباد کی خدمت میں فدوی کے حاضر نہ ہو سکنے کے دو وجوہ ہیں۔ پہلی وجہ یہ کہ فدوی احمد بخش خاں کی زیادتیاں برداشت کرتا رہا پھر بھرت پور کی فتح تک احمد بخش خاں کے وعدے پر سفر سے دور رہا اور کان پور چلا گیا۔ کان پور میں بیمار پڑ گیا۔ یہ مفصل روئداد میں نے آپ کی خدمت میں پیش کردہ عرضداشت میں بیان کر دی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جن دستاویزات پر میرے دعوے کا انحصار ہے ریذیڈنسی کے دفتر واقع شاہ جہان آباد میں نہیں ہیں۔

ایک رپورٹ جو احمد بخش خاں کی جاگیر اور سرکار انگریزی کی طرف سے اس پر زرِ استمراری کی

معافی کے بارے میں والا مناقب جنرل لارڈ لیک صاحب بہادر نے (۱۸۰۶ء) کو کلکتہ سے ارسال کی تھی وہ بھی کلکتہ کے دفتر میں موجود ہوگی۔ چوں کہ دہلی، کلکتہ اور ہندوستان کے جملہ شہر ایک ہی حکومت کے تابع ہیں لہذا فدوی حصولِ انصاف اور کامیابی کی امید سے بے سروسامانی، بیماری اور ناتوانی کی حالت میں دوسو فرسنگ (چھ سو میل) کا فاصلہ طے کر کے اس دادگاہ تک پہنچا ہے اور اس مقدمے سے فدوی کا مقصد سرکار جہاں مدار کی خیر اندیشی اور حصول حمایت ہے۔ چناں چہ میری عرض داشت کے ملاحظے کے بعد یہ بات واضح ہو جائے گی۔ امید ہے کہ فدوی کی درخواست حضور سراپا نور کی پُر برکت نظر سے فیض یاب ہوگی۔ آپ کے اقبال اور حکومت کا سورج تاباں اور درخشاں رہے۔

عرضی

اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ برادر زادۂ نصر اللہ بیگ خاں

جاگیر دار سونک سونسا

لفافے پر:

صاحب والا توصیفات،

عادل اور فیض بخش جناب فریزر صاحب بہادر

دام شوکتہٗ کی پرستانہ نظر فیض اثر سے گزرے

اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ برادر زادہ مرزا نصر اللہ بیگ خاں جاگیر دار سونک سونسا کی عرض داشت

مرقومہ۔ ۲۸ر اپریل ۱۸۲۸ء

عرضی

اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ

برادر زادۂ نصر اللہ بیگ خاں۔۔ جاگیر دارِ سونک سونسا

لفافے پر فریزر کا نام اور عہدہ اس طرح لکھا گیا تھا۔ والا مرتبت، والا شان، داورِ دادرس، فیض رساں

فریزر صاحب بہادر دام شوکتہ کی نظرِ فیض مظہر سے گزرے۔

عرض داشت اسد اللہ عرف مرزا نوشہ برادر زادۂ مرزا نصر اللہ بیگ خاں جاگیردارِ سونک سونسا

معروضہ ۲۸/اپریل ۱۸۲۸ء

سرکاری افسروں نے غالبؔ کو بتایا تھا کہ غالبؔ نے براہِ راست کلکتے آکر غلطی کی ہے۔ کیوں کہ اُنھیں اپنی عرض داشت دہلی کے ریذیڈنٹ کول بروک کو پیش کرنی چاہیے تھی لیکن جب سائمن نے غالبؔ کی عرض داشت لے کر رکھ لی تو غالبؔ کو یہ خیال ہوا کہ غالب نے ریذیڈنٹ کے ذریعے درخواست نہ بھیجنے کی جو غلطی کی تھی، اُسے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ سائمن فریزر نے وہ درخواست اپنے پاس رکھ لی۔ جب غالبؔ رخصت ہونے لگے تو سائمن فریزر نے عطر و پان سے اُن کی تواضع کی اور کھڑے ہو کر غالب کا سلام قبول کیا۔ سائمن کے اس رویّے سے غالبؔ خوش خوش اپنے گھر واپس آئے۔ کچھ دن بعد غالب سائمن فریزر سے پھر ملے۔ سائمن کا رویّہ بہت ہمدردانہ تھا۔ اُنھوں نے غالب کو بتایا کہ برطانوی افسر باٹن صاحب فارسی درخواستوں کا ترجمہ کرتے ہیں اور فریزر کا کام ہے کہ وہ فارسی سے انگریزی ترجموں کا موازنہ کریں۔ فریزر نے فارسی کی ایک تحریر دکھاتے ہوئے غالبؔ سے کہا کہ یہ آپ کی عرض داشت ہے۔ اس کا فارسی میں ترجمہ ہو چکا ہے اور میں نے اس کا فارسی سے مقابلہ بھی کرلیا ہے۔ اب یہ صاحبانِ کونسل کے پاس بھیج دیا جائے گا۔ فریزر نے یہ بھی کہا کہ آپ کا حق سرکاری طور پر ثابت ہو چکا ہے، اور ارکینِ سرکار کسی کے حق کی ادائیگی میں کوئی لحاظ نہیں کرتے۔

اس وقت کلکتے میں ایک اور افسر تھے اینڈریوز اسٹرلنگ۔۔۔ یہ کونسل میں بہت اعلا عہدے پر فائز تھے۔ اُن کے بارے میں غالبؔ نے لکھا ہے کہ 'ایک افسر اینڈریوز اسٹرلنگ، کونسل میں اعلا عہدے پر فائز ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ صاحبِ علم اور سخن فہم ہیں۔ شعر کی لطافت سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ میں نے اُن کی مدح میں پچپن اشعار کا ایک قصیدہ کہا ہے۔ اس قصیدے کے آخری اشعار میں اپنا کچھ حال بھی بیان کر دیا ہے۔' غالب کو ۲۸/فروری ۱۸۲۸ء اسٹرلنگ کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع مل گیا۔ غالب نے قصیدے کے کچھ اشعار پڑھ

کر سنائے، جن سے اسٹرلنگ خوش ہوئے۔ سائمن فریزر اُن ہی کے ماتحت تھے۔ اسٹرلنگ طے کرتے تھے کہ کون سا مقدمہ کونسل کو بھیجا جائے اور کون سے مقدمے کو بنیادی مرحلے پر رَد کر دیا جائے۔ غالب نے اُن سے اپنی ملاقات کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسٹرلنگ کی گفتگو سے وہ اپنے مقدمے کے سلسلے میں بہت پُر امید ہو گئے تھے۔ اسٹرلنگ سے غالب سے ہمدردی تھی لیکن وہ اصول و ضوابط کے سامنے معذور تھے۔ قانون کے مطابق اسٹرلنگ نے عرض داشت پر لکھا تھا کہ 'عرض داشت پہلے دہلی کے ریذیڈنٹ کے سامنے پیش کی جانی چاہیے تھی اور پھر وہاں سے اُن کے پاس آنی چاہیے تھی۔

غالب نے جب یہ سنا کہ اراکینِ کونسل نے اُن کے مقدمے کو قبول کر لیا ہے لیکن یہ شرط لگا دی ہے کہ 'عرض داشت دہلی کے ریذیڈنٹ کی معرفت آنی چاہیے۔ غالب کو اس کی بہت خوشی تھی کہ اراکینِ کونسل نے اُن کا مقدمہ قبول کر لیا ہے لیکن اُن کو پریشانی تھی کہ اُنھیں اپنی عرض داشت دہلی کے ریذیڈنٹ کی معرفت بھیجنی ہوگی۔ غالب نے پریشان ہو کر کہا کہ اوّل تو وہ مالی اعتبار سے اس قابل نہیں اور دوسرے اُن کی صحت بھی اتنے لمبے سفر کے لیے متحمل نہیں ہو سکتی۔ اُنھیں جواب دیا گیا کہ آپ کلکتے ہی میں رہیں اور یہیں سے اپنے کاغذات ریذیڈنٹ کے پاس کاروائی کے لیے بھیجیں۔ اُن کے ذریعے وہ کاغذات کلکتے آ جائیں گے۔

غالب نے دہلی کے اپنے دوستوں میں سے ایک دوست مولانا فضل حق خیر آبادی کو خط لکھ کر اس سلسلے میں مدد مانگی۔ مولانا فضلِ حق نے غالب کے لیے دہلی میں ایک وکیل پنڈت ہیرا لال کی خدمات حاصل کر لیں۔ غالب نے فوراً ہی اپنا مختار نامہ متعلقہ وکیل کو بھیج دیا۔ کاغذات بھیجے ہوئے خاصے دن ہو گئے اور وہاں سے کوئی جواب نہیں آیا تو غالب پریشان ہو گئے۔ غالب نے عرضِ داشت اور متعلقہ کاغذات ایک ورق میں لپیٹے اور خود ڈاک خانے پہنچ گئے اور بقول غالب، 'اُنھوں نے پوسٹ ماسٹر اور ڈاک خانے کے دوسرے عملے کو اس پر گواہ بنا کر لفافے کو اُن کی موجودگی میں لاکھ سے بند کیا۔' اس لفافے کا وزن دس روپے تھا اور قاعدے کے مطابق اس کا ڈاک محصول دس روپے بنا۔ غالب اس خط کی رسید لے کر آ گئے۔ ابھی یہ خط پہنچا بھی نہیں ہوگا کہ مولوی فضل حق کا خط موصول ہوا، جس میں اُنھوں نے لکھا تھا کہ 'اپنی مہر والا مختار نامہ بغیر رجسٹری کے نہ بھیجنا۔' غالب نے جو خط بھیجا تھا، وہ غیر رجسٹری شدہ تھا، اس لیے اُنھوں نے اسٹامپ خریدا۔ اس پر مختار نامہ تحریر کیا اور رجسٹری کر کے دہلی بھیجا تھا۔ کچھ دن تک غالب کو اس کا جواب نہیں ملا۔ وہ سخت مایوس تھے۔ قدم قدم پر ناکامیوں نے غالب کو گھیر رکھا تھا۔ ابھی مقدمے کے معاملات چل ہی رہے تھے کہ

غالبؔ کو معلوم ہوا کہ گورنر جنرل مع کونسل اور کونسل کے عملے کے افراد کے شمالی ہندوستان جا رہے ہیں۔ غالبؔ نے سوچا کہ گورنر جنرل اور اراکینِ کونسل کلکتے سے چلے جائیں گے تو وہ یہاں رہ کر کیا کریں گے۔ بہتر تو یہی ہوتا کہ وہ بقول غالبؔ 'اُفتاں و خیزاں سر کے بل اس کارواں کے ساتھ جائیں لیکن اُن کے مالی حالات ایسے تھے کہ اُنھیں کلکتے ہی میں رہنا پڑا۔ کچھ دِن بعد غالبؔ کو دہلی سے خط ملا کہ 'تمھارا مقدمہ مِسل کے کاغذات میں شامل ہو گیا ہے۔ غالبؔ اس فقرے کا مطلب نہیں سمجھے لیکن خوش امیدی نے اُنھیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اُن کی عرض داشت مِسل پر لگ گئی ہے اور اب یہ مقدمہ شروع ہو جائے گا۔

غالبؔ کو خبر ملی کہ گورنر جنرل، افرادِ کونسل اور اشخاصِ عملہ ہندوستان جا رہے ہیں۔ تین سال کے لیے ضلع میرٹھ، جو دہلی کے قرب و جوار میں ہے، دارالسلطنت قرار پائے گا۔ حکومت نے طے کیا تھا کہ سارے متوسلین، چاہے وہ وکیل ہوں یا درخواست گزار، سب کے سب اس قافلے میں ہم سفر اور ہم قدم ہوں گے۔ غالبؔ کی مشکل یہ تھی کہ سفر کے لیے ساز و سامان کہاں سے لاتے۔ غالبؔ سوچ رہے تھے کہ 'اگر مقدمے نے بہتری کی کوئی راہ پکڑ لی ہوتی تو وہ اِعانت کے طور پر حکومت سے کچھ قرض لے لیتے۔'

پہلے یہ خبر آئی تھی کہ دہلی کے ریذیڈنٹ دورے پر چلے گئے ہیں لیکن اب پتا چلا کہ دوسری شعبان کو ریذیڈنٹ دہلی پہنچ گئے ہیں اور پانچویں شعبان کو غالبؔ کی عرض داشت اُن کی عدالت میں پیش ہوگی۔ ۱۷/اپریل ۱۸۲۹ء کو غالبؔ کو دہلی کے ریذیڈنٹ کا مہر کردہ خط موصول ہوا۔ خط کی عبارت تھی:

> ''خاں صاحب مہربان (خدا آپ کو سلامت رکھے) شوقِ ملاقات کے بعد واضح ہو کہ جناب عالی کا خط پینشن کے مطالبات کے بارے میں دوسرے منسلکہ کاغذ کے ساتھ پنڈت ہیرا لال کے ذریعے موصول ہوا اور کاشفِ حال ہوا۔ مہربان! اس مقدمے میں ایک تحریر اہلیانِ صدر کے سامنے لکھ کر بھیج دی گئی ہے۔ ان مہربان کے جواب آنے پر آپ کو اطلاع دی جائے گی۔''

۱۷/اپریل ۱۸۲۹ء

دوسرے دن یعنی ۱۸/اپریل ۱۸۲۹ء کو غالبؔ گورنر جنرل سے ملاقات کے لیے گئے۔ غالبؔ نے ریذیڈنٹ کا خط اُنھیں دکھایا۔ اُنھوں نے یہ خط دیکھا اور اس سے پہلے کہ غالبؔ کچھ

کہتے، اُنھوں نے کہا کہ 'تمھارے مقدمے میں کول بروک صاحب نے صدر دفتر کو جو خط لکھا تھا اُس کا یہاں سے مناسب جواب بھجوا دیا گیا تھا۔ گورنر جنرل نے یہ بھی کہا کہ ریذیڈنٹ آپ پر نظرِ عنایت رکھتے ہیں اور توقع ہے کہ آپ کے دعووں کی تشخیص اور تحقیق کر کے صدر دفتر کو رپورٹ بھیجیں گے۔ غالب نے ایک دو دن بعد وکیل کے خط کا جواب اور دوسرے کاغذات ریذیڈنٹ دہلی کے منشی کو ڈاک سے بھجوا دیے۔

غالب نے نواب محمد علی خاں کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ 'میں نے کچھ سعی و تدبیر اور کچھ روپے کے زور سے دہلی کے ریذیڈنٹ کی رپورٹ کی نقل ضمیمہ حکم کے ساتھ حاصل کر لی ہے۔'

اس دوران میں ایک اور حادثہ پیش آیا۔ دہلی کے ریذیڈنٹ کے خلاف اُس کے دشمنوں نے کچھ الزام تراشیاں کیں، اس لیے بقول غالب، وہ فی الوقت اپنی خدماتِ مفوضہ انجام نہیں دے رہا ہے اور جب تک ان الزامات کی تحقیق مکمل نہیں ہوتی، یہی حال رہے گا اور اگر بے گناہ اور پاک نکلا تو اپنے عہدے پر بحال ہو جائے گا ورنہ کوئی دوسرا آدمی آ جائے گا۔' یہ ریذیڈنٹ کول بروک تھے۔ اُن کو برطرف کر کے فرانسس ہاکنس کا تقرر کر دیا گیا۔ ہاکنس بقول غالب 'شکار دوست اور لاپرواہ تھا' غالب نے نواب محمد علی خاں کو خط لکھا کہ 'اگر آپ کسی ایسے انگریز کو جانتے ہوں کہ ہاکنس کا شناسا ہو تو ازراہِ کرم اُس سے ایک سفارشی خط لے کر مجھے بھیج دیجیے۔' پتا نہیں غالب کی اس درخواست کا کیا ہوا۔

گورنر کا قافلہ بنارس تک پہنچ گیا تھا کہ قافلے کا کوچ اگلے سال تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ گورنر کے حکم پر سب لوگ کلکتے واپس آ گئے۔ غالب نے دیکھا کہ فرانسس ہاکنس دہلی کے ریذیڈنٹ مقرر ہو گئے ہیں اور اب غالب کا مقدمہ اُن کے ذمے ہوگا تو اُنھوں نے ہاکنس کی مدح میں ایک قصیدہ کہا اور بقول غالب 'ہاکنس کو پسند آیا۔' غالب نے لکھا ہے کہ 'دہلی میں پہلی ہی ملاقات میں ہاکنس نے مجھ سے پورے ایک گھنٹے تک قصیدہ سنا، کلکتے کے خبروں کی پوچھ گچھ اور میری نالش کے دائر کرنے کے متعلق بات چیت کے بعد ملتفت ہوئے۔'

غالب مسلسل یہ کہتے رہے کہ لارڈ لیک کے دستاویز جعلی ہے لیکن حکومت کے مختلف عہدے داران اس کے اصل ہونے پر اصرار کرتے رہے۔ جارج سوئنٹن معتمد اعلا برائے حکومت نے ۳۱/دسمبر ۱۸۳۰ء کو دہلی کے ریذیڈنٹ ولیم بائم مارٹن کو سی۔ نورس کے خط کی نقل بھیجتے ہوئے لکھا کہ نورس کا خط پڑھنے سے آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ مدعی (غالب) نے لارڈ لیک صاحب بہادر کے دستخط اور مہر سے جاری ہونے والے جس پروانے یا مراسلے کو جعلی قرار

دیا ہے اُسے جناب سر جون میلکم نے صحیح دستاویز تسلیم کیا ہے۔ اس سب کے باوجود غالبؔ مستقل یہ کہتے رہے کہ لارڈ لیک والی دستاویز جعلی ہے۔

غالبؔ نے اپنے مقدمے کے بارے میں لکھا ہے:

''اپریل ۱۸۲۹ء میں میرے مقدمے کی رپورٹ دہلی سے صدر دفتر آگئی۔ اس مہینے میں اس کا جواب بھیج دیا گیا۔ اتفاق یہ ہوا کہ صدر دفتر سے حکم کا پہنچنا، حاکم کی معزولی، دہلی کے ریذیڈنٹ اور دفتر کے اوراق کا بکھرنا۔ یہ سب ایک ہی وقت میں ہوئے۔ اس پراگندگی کی وجہ سے وہ خاص کاغذ غائب ہوگیا، جس پر اس سیہ بخت (غالبؔ) کی کامیابی کا دارومدار تھا۔ منصف کے حکم پر دفتر کے لوگوں نے تمام دفتر چھان مارا۔ ایک ایک کاغذ دیکھا مگر وہ ہی کاغذ نہیں ملا۔ دہلی کے ریذیڈنٹ کے سکریٹری نے مجھے بتایا کہ میں نے اس مقدمے کے بارے میں مرکز کو لکھا ہے اور اس حکم کا مثنیٰ طلب کیا ہے تا کہ وقت پر کام آجائے اور کھوئی ہوئی چیز ہاتھ آجائے۔''

دہلی پہنچ کر اُنھوں نے دہلی کے ریذیڈنٹ سے رابطہ قائم کیا۔ جب غالبؔ نے دیکھا کہ کلکتے میں مزید قیام سے انھیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا تو وہ ۲۰/۲۱/ اگست ۱۸۲۹ء کو کلکتے سے روانہ ہوکر ۱۸/ نومبر ۱۸۲۹ء کو دہلی پہنچ گئے۔

دہلی پہنچ کر اُنھوں نے دہلی کے ریذیڈنٹ سے رابطہ قائم کیا۔ دہلی کے قائم مقام ریذیڈنٹ نے ۵/ مئی ۱۸۳۰ء کے ایک خط میں گورنر جنرل کو اطلاع دی تھی کہ غالبؔ کی شکایت بے بنیاد ہے۔ لارڈ لیک نے وظیفے کی جو رقم طے کی تھی وہ انھیں پابندی سے مل رہی ہے۔ اس کے جواب میں چیف سکریٹری گورنمنٹ۔ جی سوئٹن نے دہلی کے قائم مقام ریذیڈنٹ ایف ہاکنز کو مئی ۱۸۳۰ء کے ایک خط میں لکھا کہ گورنر جنرل آپ کی اس رائے سے متفق ہیں کہ اسد اللہ خاں کی شکایت بے بنیاد ہے۔

حکومت کے اس حتمی فیصلے کے باوجود غالبؔ ہمت نہیں ہارے۔ اُنھوں نے جولائی ۱۸۳۰ء کو گورنر جنرل کو ایک اور عرض داشت بھیجی، جس میں وہ تمام باتیں پھر دہرائیں جو خواجہ حاجی اور پنشن کی تقسیم کے بارے میں پہلی عرض داشت میں کہہ چکے تھے اور مقدمہ پر نظر ثانی کی درخواست کی۔ اس دفعہ غالب کو یہ کامیابی حاصل ہوئی کہ غالبؔ کی عرض داشت پر گورنر

جنرل لارڈ ولیم بینٹک نے ۲۰ر اگست ۱۸۳۰ء کو دہلی کے قائم مقام ریذیڈنٹ ایف ہاکنز کو حکم دیا کہ لارڈ لیک کا ۷ر جون ۱۸۰۶ء کا وہ خط جو نواب احمد بخش خاں کے نام لکھا گیا تھا اور جس میں نصر اللہ بیگ خاں کے ورثا کی پنشن کی رقم مقرر کی گئی تھی۔ نواب شمس الدین سے لے کر اُن کو بھیج دی جائے۔

ایف ہاکنز نے نواب صاحب سے یہ خط لے کر ۸ر اکتوبر ۱۸۳۰ء کو گورنر جنرل کو بھیج دیا۔

۱۹ر اگست ۱۸۳۰ء کو چیف سکریٹری برائے حکومت جی سوئنٹن نے ایک تفصیلی نوٹ لکھا جس میں غالب کی پینشن کے تمام معاملات دہرائے۔ اس میں بہت سے سوالات اُٹھائے ہیں، جس میں سے چند درجِ ذیل ہیں:

۱۹ر اگست ۱۸۳۰ء کو جی سوئنٹن معتمد اعلیٰ برائے حکومت نے ایک طویل نوٹ لکھا، جس میں مقدمے کے درجِ ذیل پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

کہ عرض داشت دہلی کے ریذیڈنٹ کو پیش کریں۔ (۲۰ر جون ۱۸۲۸ء کو فریزر کے دستخط سے ایک حکم جاری ہوا کہ "مدعی (غالب) کو مطلع کیا جائے کہ یہ عرض داشت دہلی کے ریذیڈنٹ کے نام ہونی چاہیے)۔

لارڈ لیک کی ۷ر جون ۱۸۰۶ء کی متنازعہ دستاویز ریکارڈ میں نہیں ہے۔

یہ واضح نہیں ہوتا کہ اصل دستاویز ہاکنز کو پیش کی گئی تھی یا نہیں۔

مجھے ۷ر جون کا خط ملنا ضروری ہے۔ اس خط کے جائزے کے بعد اگر کچھ شکوک پیدا ہوں تو انھیں پریذیڈنسی میں بھیجا جائے۔

نواب شمس الدین نے ہاکنز کے مراسلے، جو گزشتہ ۵ر مئی کو پیش کیا گیا تھا، میں بڑی غیر سنجیدگی سے کام لیا ہے۔ ان کی اس رائے سے کہ وہ (غالب) ایک شاعر ہے اور شاعر کے اس استحقاق سے وہ مبالغہ آرائی سے کام لیتا ہے اور پورا فائدہ اُٹھاتا ہے۔ اسد اللہ خاں کے دعوے کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ ہمیں مقدمے کا سنجیدگی سے جائزہ لینا چاہیے۔

ہمیں احمد بخش خاں کو عطا کی گئی سند مورخہ ۴ر مئی ۱۸۰۶ء کا جائزہ لینا چاہیے جو اصل و حقیقی ہے اور گورنر جنرل صاحب بہادر ان کونسل نے اس کی توثیق کی تھی۔ اس کی ایک نقل سر جان میلکم کے اسی تاریخ کے مراسلے میں شامل ہے اور وہیں دیکھی جا سکتی ہے وظیفے کی مد میں حقیقتاً

نصراللہ بیگ خاں کے عزیزواقارب کے لیے دس ہزار روپے رکھے گئے ہیں لیکن بدقسمتی سے جس ڈھیلے ڈھالے انداز میں ۴رمئی ۱۸۰۶ء کی سند کو الفاظ کا جامہ پہنایا گیا ہے اس میں ٹھیک ٹھیک رقم کا کوئی ذکر نہیں۔ زرِاستثنیٰ کو ایک مقررہ مقصد یعنی نصراللہ بیگ خاں کے عزیز و اقارب کی کفالت اور گزراوقات کے لیے پچیس ہزار سے کم کرکے پندرہ ہزار کردیا گیا ہے۔

اس میں کنایتاً مذکورہ بالا منہائیوں اور شرائط کا ذکر تو کیا گیا ہے لیکن منہائی اور شرائط کے الفاظ عمومی معنوں میں استعمال کیے گئے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ لارڈ لیک صاحب بہادر نے جو اس وقت کان پور میں تھے ۴رمئی کو یہ پروانہ عطا کرنے اور اسی مہینے کی سولہ تاریخ کو حکومت کا جواب ملنے کے بعد جس میں جو کچھ کہا گیا تھا اس کی منظوری دی گئی تھی۔ احمد بخش خاں کو یہ بتانے کے لیے کہ گزشتہ مہینے کی سولہ تاریخ کو کیا طے پایا ۷رجون کو دوبارہ خط لکھا ہو۔

نواب احمد بخش کی درخواست پر (جو اس وقت لارڈ لیک صاحب بہادر کی معیت میں کان پور میں تھے۔ لکھا کہ اگر لارڈ موصوف نے ۷رجون کا خط لکھا تھا تو کرنل میلکم صاحب بہادر نے جنھوں نے چند روز بعد (۱۰رجون) ۱۶رمئی کے سرکاری احکامات کے وصول پانے کی اطلاع دی تھی، یہ رپورٹ کیوں نہ دی کہ احمد بخش خاں کو ایک خط ارسال کیا گیا ہے جس میں پانچ ہزار روپے کی ایک معینہ رقم نصراللہ بیگ خاں کے خاندان والوں کی کفالت کے لیے مقرر کی گئی ہے اور ان اسباب کی وضاحت کی گئی ہے جن کی بنا پر زرِاستثنیٰ کی بقیہ رقم وظیفے میں دوبارہ شامل نہیں کی گئی جو نواب کی جاگیر سے ادا کی جاتی ہے؟ لیکن ایسی کوئی رپورٹ نہیں۔ اگر دستاویز اصلی ہے تو یہ بعید از قیاس نہیں کہ احمد بخش نے یہ فریب اور دھوکہ سے حاصل کی ہو لیکن اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ یہ ایک ایسا حکم ہے جو لارڈ لیک صاحب بہادر نے اپنی رضامندی سے جاری کیا ہے تو کیا لارڈ موصوف اتنے بااختیار تھے کہ بغیر گورنر جنرل ان کونسل کے منظور کیے ہوئے کسی سابقہ فیصلے کو درہم برہم کرسکیں؟ اور کیا حکومت اس کی پابند ہوگی؟ مجھے یہ تصور بھی نہیں کرنا چاہیے اور خواہ یہ دستاویز اصلی ہو یا جعلی، ظاہر یہی ہوتا ہے کہ نصراللہ بیگ خاں کے اقربا زیادہ وظیفے کے حق دار ہیں۔

اس نوٹ میں جن کاغذات کا حوالہ دیا ہے وہ حوالے کے لیے منسلک ہیں۔

(دستخط) جی۔ سوئنٹن
۱۹راگست ۱۸۳۰ء
معتمد اعلیٰ برائے حکومت
(صحیح نقل)

(دستخط) جی۔ سوئنٹن
معتمد اعلیٰ برائے حکومت ہند

☆ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا۔ فارن ڈیپارٹمنٹ متفرقات جلد نمبر ۲۰۸

جی سوئنٹن کا یہ خط تھوڑا بہت غالبؔ کے حق میں ہے۔ غالبؔ کے مقدمے سے متعلق تمام دستاویزوں میں یہ پہلی دستاویز ہے جس میں نوابِ احمد بخش خاں پر انگلی اُٹھائی گئی ہے اور غالبؔ کی طرف داری کی گئی ہے۔ مگر اس سے غالبؔ کو کچھ فائدہ نہیں پہنچا۔ جان میلکم نے برسوں پہلے لارڈ لیک کے خط کے اصل ہونے کی تصدیق کر دی تھی۔

لارڈ لیک کے اس خط کے سلسلے میں چیف سکریٹری گورنمنٹ ؟ جی سوئنٹن نے سی نورس چیف سکریٹری برائے حکومت بمبئی کو ایک خط بھیجا، جس میں لکھا کہ اس متنازعہ خط کو ایک فریق اصل قرار دیتا ہے اور دوسرا جعلی بتاتا ہے۔ براہِ کرم اس خط کا جائزہ لے کر اپنی رائے سے مطلع کیجیے۔

اس خط میں یہ بھی اطلاع دی گئی کہ 'گورنر جنرل فرماتے ہیں کہ:

'فارسی خط کی پشت پر انگریزی زبان میں کوئی تصدیقی دستخط نہیں ہیں جیسا کہ دستور ہے کہ دفتر فارسی کے معتمد کے دفتر سے فارسی زبان میں جاری کیے جانے والے خط کی پشت پر دستخط ہوا کرتے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نواب احمد بخش خاں نے لارڈ لیک سے یہ حکم نامہ لکھوا کر باقاعدہ دفتر میں داخل نہیں کیا بلکہ اپنے پاس رکھ لیا۔

سی۔ نورس نے ۳۰ نومبر ۱۸۳۰ء اس خط کا درج ذیل جواب لکھا۔

> ''میں نہایت وثوق کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ اس سند پر لارڈ لیک صاحب بہادر کے دستخط ثبت ہیں۔ جس زمانے میں یہ حاصل کی گئی تھی، اس وقت واجبات کی ادائیگی کر دی گئی تھی۔ معزز ہندوستانی باشندے احمد بخش خاں کو لارڈ لیک صاحب بہادر اور ان کے دیگر واقف کاروں کا بھرپور اعتماد حاصل تھا۔ نیز مقامی باشندوں کی دیانت دارانہ نظر میں بھی وہ قابل احترام تھے۔ ایسی صورت حال کہ میں ان پر

غیر دیانت دارانہ طرزِ عمل کے لگائے گئے الزامات کے خلاف صفائی پیش کی جا سکتی ہے۔ اگر وہ ان نازیبا اقدامات کے قرار واقعی مرتکب ہوتے تو میرے خیال میں کسی نہ کسی فریق کی جانب سے ان پر اعتراضات ضرور صادر کیے جاتے۔

(دستخط) جان میلکم
(نقل مطابق اصل)
(دستخط) سی، نورس
معتمد اعلیٰ
(نقل مطابق اصل)
(دستخط) جارج سوئٹن
معتمد اعلیٰ برائے حکومت ☆

جب غالبؔ نے دیکھا کہ افسران لارڈ لیک کے دستخطوں کو اصلی قرار دیتے ہیں تو اُنھوں نے لارڈ ولیم بینٹک گورنر جنرل کے نام ایک درخواست میں سرکاری افسروں پر رشوت خوری اور خود لارڈ لیک پر سرکاری کاموں میں لاپرواہی کے الزامات عائد کیے۔ غالب نے گورنر جنرل کو لکھا تھا:

غالبؔ نے ولیم بنٹنک گورنر جنرل (William Bentinck) کے نام اپنی درخواست میں لکھا تھا:

''اس سند پر لگی ہوئی مہر اور دستخط سب جعلی ہیں اور دوسرے یہ کہ یہ سند مرحوم نواب احمد بخش خاں نے اپنی رہائش گاہ پر تیار کی اور لکھوائی اور عملے کو رشوت دے کر اُس زمانے میں جب لارڈ لیک صاحب بہادر دوسرے اہم امور و معاملات میں بہت اُلجھے ہوئے تھے، اس دستاویز کو فارسی زبان کی دوسری ڈھیروں دستاویزات اور کاغذات میں رکھ کر، جو روزانہ دستخط کے لیے اُن کے سامنے گزاری جاتی تھی۔ یہ درخواست بھی پیش کروائی، اس پر دستخط حاصل کر لیے اور یہ اپنی نوعیت کا بدترین فریب اور انتہائی گھٹیا اور خطرناک جعل سازی تھی۔''

میرا خیال ہے کہ اس تحریر سے سرکاری افسران غالبؔ کے مخالف ہوگئے۔

پہلے غالبؔ کی طرف دہلی کے قائم مقام ریذیڈنٹ فرانسس ہاکنس کا رویہ ہمدردانہ تھا لیکن نہ جانے کیا ہوا اور وہ کس کے دباؤ میں آگئے کہ اُنھوں نے ۸/ اکتوبر ۱۸۳۰ء کے ایک خط میں جو کچھ تحریر کیا وہ صریحاً غالبؔ کے خلاف تھا۔

ایف ہاکنس (F. Hawkins) قائم مقام ریذیڈنٹ دہلی نے چیف سکریٹری سوئنٹن (Swinton) کے نام ایک خط مورخہ ۸/ اکتوبر ۱۸۳۰ء میں لکھا:

> ''نواب صاحب (شمس الدین احمد خاں) نے مطلوبہ خط جو فارسی میں لکھا ہوا ہے اور جس پر لارڈ لیک بہادر کی مہر اور دستخط ثبت ہیں، مجھے ارسال کر دیا ہے اور اسے پیش کرتے ہوئے مجھے امید ہے کہ اس طرح یقین ہو جائے گا جس طرح مجھے گزشتہ مئی میں اُس وقت یقین ہو گیا تھا جب میں نے اسے دیکھا تھا اور میں نے اسداللہ خاں کے دعوے میں رپورٹ دی تھی اور اس شخص کے جھوٹے دعوے کو تسلیم کرنے کی اذیت میں مبتلا نہیں ہوگی جس نے نہ صرف حکومت کو بلکہ آپ کو اور مجھے بہت پریشان کیا اور نواب (شمس الدین) کی دل شکنی کی۔ اب وہ شخص سزا سے نہیں بچ سکے گا۔''

۳۱/ دسمبر ۱۸۳۰ء کے ایک خط کے ذریعے دہلی کے ریذیڈنٹ فرانسس ہاکنس کو ہدایت دی گئی تھی کہ وہ نواب شمس الدین خاں سے اصل دستاویز حاصل کر کے کلکتے بھیجے۔

۲۷/ جنوری ۱۸۳۱ء کو جارج سوئنٹن نے چیف سکریٹری حکومت برطانیہ کے نام ایک خط میں پرنسیپ (H.T.Princep) کو لکھا تھا:

> ''حضور والا (گورنر جنرل) نصراللہ خاں کے متوسلین کی مالی امداد کے ضمن میں فیروز پور کے جاگیردار کے کیے ہوئے انتظام و انصرام میں مداخلت پسند نہیں فرمائیں گے۔''

دہلی کے ریذیڈنٹ ڈبلیو بی مارٹن نے ۲۴/ اگست ۱۸۳۱ء کے ایک خط میں گورنر جنرل کو لکھا، جس میں بتایا کہ 'یہی وہ دستاویز ہے'، جس کی بابت اسداللہ خاں کا دعویٰ ہے کہ اُس میں تحریف کی گئی ہے لیکن جب اصل دستاویز سرجون میلکم بہادر کو تجزیے کے لیے پیش کی گئی تھی تو موصوف نے اس کے صحیح ہونے کی تصدیق کی تھی۔ چناں چہ تمام حقائق کے مدنظر رکھتے

ہوئے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ نہ تو مدعی کو نالش کرنے کا مجاز ہے۔ نہ ہی حکومت نواب شمس الدین خاں سے کسی رقم کی ادائیگی کا مطالبہ کرسکتی ہے جیسا کہ دادخواہ چاہتا ہے۔'' اس خط میں مارٹن نے اس حقیقت کا اظہار بھی کیا ہے۔ پہلے بھی دو دفعہ اس طرح کی عرض داشتیں پیش کی گئی تھیں اور دونوں دفعہ انھیں مسترد کردیا گیا تھا۔ گورنر جنرل کی ہدایت پر معتمد میکنائن نے یکم مئی ۱۸۳۲ء کو غالب کو ایک خط لکھا جس کے آخری پیراگراف میں بتایا گیا کہ 'گورنر جنرل صاحب، فضیلتِ مآب نائب صدران کونسل کے خیالات سے کلی طور پر اتفاق فرماتے ہیں۔ لہٰذا ایسی صورت میں نواب شمس الدین خاں سے موجودہ پنشن میں اضافے کا مطالبہ سراسر ناروا ہے اور جنرل لارڈ لیک صاحب کی عطا کردہ سند جس میں مختلف حصے داروں کے نام مخصوص رقم کا اندراج ہے، بالکل صحیح ہے۔

۲۲ر مارچ ۱۸۳۴ء کو ولیم فریزر کے قتل کے الزام میں حکومت نے نواب شمس الدین خاں کو گرفتار کرلیا۔ مئی ۱۸۳۵ء میں نواب صاحب کی جاگیر بحقِ حکومت ضبط کرلی گئی۔ ۹ر اکتوبر ۱۸۳۵ء کو انھیں پھانسی دے دی گئی۔ نواب صاحب کی وفات کے بعد اُن کے نجی معاملات اور خصوصاً قرض وغیرہ کے معاملات ٹی ٹی مٹکاف ایجنٹ برائے گورنر دہلی کے سامنے پیش ہوئے۔ موقع غنیمت سمجھ کر غالب نے اپنی درخواست آگرہ پریذیڈنسی میں پیش کردی۔ اُنھوں نے آگرے کے گورنر ولیم بلنٹ کے سامنے اپنی عرض داشت پیش کی، جس میں تمام باتیں دہرائیں جو اپنی عرض داشتوں میں غالب کہتے رہے تھے لیکن اس دفعہ اُنھوں نے یہ نیا مطالبہ کیا کہ حکومت نے غالب اور اُن کے متعلقین کے لیے دس ہزار روپے سالانہ کی رقم پنشن مقرر کی تھی۔ جب کہ نواب احمد بخش خاں اور پھر ان کے بیٹے شمس الدین خاں کل تین ہزار روپے سالانہ دیتے رہے۔ گویا غالب اور ان کے متعلقین کے سات ہزار روپے سالانہ اس جاگیر پر واجب ہیں۔ مئی ۱۸۰۶ء سے مئی ۱۸۳۵ء تک مبلغ دو لاکھ تین ہزار روپے واجب الادا ہے۔ غالب کا مطالبہ تھا کہ یہ رقم نواب شمس الدین خاں کی جاگیر سے دلوائی جائے۔

بلنٹ نے غالب کی عرض داشت اور اُس سے منسلکہ دیگر یادداشتیں ٹی ٹی مٹکاف ایجنٹ برائے گورنر کو بھیج دیں۔ مٹکاف نے ۳ر دسمبر ۱۸۳۵ء کو اپنے جواب میں لکھا کہ لارڈ لیک کے ۷ر جون ۱۸۰۶ء کے حکم نامے کے مطالعے سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ اسداللہ خاں کا دعویٰ قابلِ اعتنا نہیں ہے۔ مٹکاف نے اپنے جواب میں یہ بھی لکھا کہ 'مرزا نوشہ نے پہلے تو یہ دعویٰ کیا کہ مذکورہ شقہ ہی سرے سے جعلی ہے لیکن جب انھیں یہ باور کرایا گیا کہ سرجان میلکم نے مذکورہ شقے کی صحت کی تصدیق کردی تھی تو اُنھوں نے دوسرا دعویٰ یہ کیا کہ

جرنیل لارڈ لیک بہادر کی مہر اور دستخط فریب کاری کے ذریعے حاصل کیے گئے تھے۔ان بیانات سے مرزا نوشہ کی متنازعہ شخصیت ہونے کی حقیقت کھل جاتی ہے۔'

ایسا لکھتے ہوئے غالبؔ کو یہ خیال نہیں آیا کہ وہ لارڈ لیک پر غیر ذمے داری کا الزام لگا رہے ہیں۔

آر۔ایچ۔اسکاٹ معتمد برائے حکومت آگرہ نے دہلی کو اطلاع دی کہ 'اسد اللہ خاں کے دعوے کی مکمل جانچ پڑتال کرلی گئی ہے اور اسے سرکارِ عالیہ نے مسترد کردیا ہے، اس لیے مزید احکامات کی ضرورت نہیں ہے۔فیروز پور کے جاگیردار کے ساتھ طے شدہ معاہدے پر اُن کا اعتراض بالکل ناروا ہے۔'

غالبؔ کے بار بار عرض داشتیں پیش کرنے سے حکومت اور خود گورنر جنرل اور دوسرے سرکاری افسران تنگ آگئے تھے۔ ۲۸/اپریل ۱۸۳۶ء کو گورنر جنرل George Eden Auckland نے پالیٹکل ڈیپارٹمنٹ کو ایک حکم بھیجا، جو صرف دس الفاظ پر مشتمل تھا۔حکم تھا 'کیا اس مقدمے کا بار بار فیصلہ نہیں ہوا ہے۔گویا یہ دروازہ بالکل بند ہوگیا۔'لیکن غالبؔ پھر بھی ہمّت نہیں ہارے۔غالبؔ کا شعر ہے:

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

اس شعر میں محض ایک شاعرانہ خیال ہی بیان نہیں کیا گیا، بلکہ غالبؔ نے اپنی عملی زندگی کی عکاسی کی ہے۔اگر معمولی دل گردے کا آدمی ہوتا تو ابتدا ہی میں وہ میدان چھوڑ کر بھاگ جاتا یا ذہنی توازن کھو دیتا ہے لیکن یہ غالبؔ کی ہمّت اور حوصلہ تھا کہ مقدمے میں مسلسل ناکامیوں کے باوجود انھوں نے اپنی جدوجہد کا سلسلہ جاری رکھا یا بقول خود اُن کے قفس میں آشیاں کے لیے خس فراہم کرتے رہے۔

لیفٹیننٹ گورنر شمال مغربی صوبہ جات کے شعبۂ سیاسی میں ہونے والی کاروائیوں کی بابت ماہ اپریل، مئی اور جون ۱۸۳۶ء مورخہ ۲۹/اکتوبر ۱۸۳۶ء کے ایک اقتباس میں کہا گیا ہے۔'دہلی کے ایجنٹ صاحب بہادر کو یہ ہدایت دی گئی تھی کہ وہ مدعی کو اس حقیقت سے مطلع فرمادیں کہ اس کا مقدمہ نبٹایا جاچکا ہے۔

ٹی ٹی مٹکاف ایجنٹ برائے لفٹننٹ گورنر شمال مغربی صوبہ جات کی ایک تحریر مورخہ ۷/اکتوبر ۱۸۳۷ء کے مطابق جب غالبؔ کلکتے گئے تھے تو دو سال تک اُنھوں نے پنشن نہیں لی تھی۔

۱۲/اگست ۱۸۴۳ء کو غالبؔ کی بیوی امراؤ بیگم نے ولیم فریزر کو ایک عرضی پیش کر کے درخواست کی کہ اُن کے شوہر کے بقایا جات سے انھیں بھی رقم دلائی جائے۔

فریزر نے غالبؔ کو بلا کر پوچھا کہ وہ اپنی پنشن میں سے کتنی رقم اپنی بیوی کو دینا چاہیں گے۔ غالب نے جواب دیا۔ اُنھوں نے اپنی بیوی کو چار سو روپے سالانہ بطور گزارہ الاؤنس دینے کا فیصلہ کیا تھا لیکن پانچ سال سے وہ کچھ بھی نہیں دے پائے۔ اگر اُن کے بقایا جات مل جائیں تو وہ مناسب رقم ادا کر دیں گے۔ غالب نے یہ بھی بتایا کہ اُن کی بیوی نے تین ہزار روپے کے اپنے زیورات فروخت کر کے گزارہ کیا تھا۔ ۲۴/اگست ۱۸۴۳ء کو فریزر نے نواب شمس الدین خاں کو ہدایت دی کہ وہ امراؤ بیگم کو تین ہزار روپے ادا کر دیں اور اُن کی پنشن کا تسلیم شدہ حصہ یعنی چار سو روپے سالانہ انھیں ادا کیا جاتا رہے۔

امراؤ بیگم نے یہ تسلیم کیا کہ ماضی میں غالبؔ کو ملنے والی پینشن یعنی ڈیڑھ ہزار روپے سالانہ میں سے چار سو روپے سالانہ کے حساب سے ڈیڑھ سال کا وظیفہ موصول ہوا تھا۔ تین ہزار کے بقایا جات کے لیے اُنھوں نے کمشنر کی خصوصی عدالت میں درخواست دی لیکن یہ درخواست نامنظور کر دی گئی۔

ہر طرف سے ناکام ہو کر غالبؔ نے گورنر جنرل لارڈ ایڈورڈ ایلن برا کی معرفت ملکہ عالیہ کو ایک عرض داشت بھیجی، جس میں پینشن میں اضافے کی درخواست کی۔ ایلن برا نے یہ عرض داشت ایسٹ انڈیا کمپنی کے کورٹ آف ڈائرکٹرز کو بھیج دی۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ غالب کی یہ عرض داشت ملکہ عالیہ کو بھیجی گئی یا نہیں؟ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ اس دروازے سے بھی غالب خالی ہاتھ لوٹے اور پینشن میں اضافے کے مقدمہ کا یہ سلسلہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

مئی ۱۸۵۷ء میں جب دہلی میں ناکام بغاوت ہوئی تو غالبؔ کی پینشن بند ہو گئی۔ پینشن کے سلسلے میں غالبؔ کی بھاگ دوڑ پھر شروع ہو گئی۔ تین سال کی لگاتار جدوجہد کے بعد مئی ۱۸۶۰ء میں پینشن دوبارہ جاری ہوئی اور انھیں وہی پینشن ملنی شروع ہو گئی جو پہلے ملتی تھی یعنی ڈیڑھ ہزار روپے سالانہ۔

ادبی معرکے کے تین مشاعرے

غالبؔ کی پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں مرزا افضل بیگ کی غالبؔ دشمنی کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی جاچکی ہے۔ غالبؔ نے کلکتے پہنچ کر صاحبِ اقتدار برطانوی افسروں سے تعلقات پیدا کر لیے تھے۔ مرزا افضل بیگ کو محسوس ہوا کہ انگریزوں سے غالبؔ کے ان تعلقات کی وجہ سے ممکن ہے کہ یہ مقدمہ غالبؔ کے حق میں طے ہو جائے اور ان کی سگی بہن کے بچے پینشن کے حق سے محروم ہو جائیں۔ اس لیے مرزا افضل بیگ نے غالبؔ کے خلاف وہ تمام حربے استعمال کرنے شروع کیے جن سے غالبؔ کی عزت اور وقار کو ٹھیس پہنچے اور پینشن کے مقدمے کا فیصلہ غالب کے خلاف ہو۔

مرزا افضل بیگ اور اُن کے ٹولے کے بارے میں غالبؔ نے ایک خط میں لکھا ہے:

> "یہ امر پوشیدہ نہ رہے کہ جب میں کلکتے پہنچا تو لوگوں کے گروہ میرے پیچھے پڑ گئے اور اُنھوں نے نکتہ چینی اور شرفا آزاری شروع کر دی بلکہ اُنھوں نے ایک ٹولا خاص طور پر (مجھے) پریشان کرنے کے لیے ترتیب دیا اور وہ آپس میں مل بیٹھے صرف اس لیے کہ میری مخاصمت پر اُٹھ کھڑے ہوں۔" [1]

جب غالبؔ کلکتے پہنچے ہیں تو مرزا افضل بیگ اکبر شاہ ثانی کے وکیل کی حیثیت سے کلکتے میں موجود تھے۔ اُنھوں نے غالبؔ کے خلاف لوگوں کو بھڑکانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ غالب پر مختلف طریقوں سے حملے کیے گئے۔ مرزا افضل بیگ کے برطانوی افسروں سے اچھے مراسم تھے، اُنھوں نے غالبؔ کی پنشن کے بارے میں ان افسروں کو یقیناً بہکایا ہوگا۔ مرزا افضل بیگ نے غالب پر ہر محاذ پر شکست دینے کی کوشش کی۔ بہ حیثیت شاعر غالب کی ممتاز حیثیت تھی۔ اس حیثیت کو بگاڑنے کے لیے تین طریقے استعمال کیے گئے۔ کلکتے میں قتیلؔ کے حامیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، اس لیے یہ افواہ پھیلائی گئی کہ غالبؔ قتیلؔ کو برا بھلا کہتے ہیں، جس کی وجہ سے حامیانِ قتیلؔ غالب سے بدظن ہو گئے پھر یہ کہا گیا کہ غالبؔ سخنورانِ کلکتہ کو بے حیثیت گردانتے ہیں۔ ان الزامات کے سبب کلکتے کے شاعروں اور دانشوروں کا

ایک بڑا طبقہ غالبؔ کا مخالف ہوگیا، اس کی تفصیل آگے بتائی جائے گی۔

غالبؔ کی پنشن کے مقدمے کو بگاڑنے کے لیے دو خطرناک وار اور کیے گئے۔ یہ مشہور کردیا گیا کہ غالبؔ اپنا نام اور تخلّص بدلتے رہتے ہیں۔''[۲] مرزا افضل بیگ اور اُن کے ہم نواؤں نے غالبؔ کے خلاف ہر طرح کا حربہ استعمال کرنا شروع کردیا اور غالبؔ کے پنشن کے مقدمے کو ہر ممکن طریقے سے بگاڑنے کی کوشش کی۔ اُنھوں نے مشہور کردیا کہ غالب اپنا نام اور تخلّص بدلتے رہتے ہیں۔

اس الزام تراشی کا مقصد یہ تھا کہ کارپردازانِ دفتر کو نام کے جھگڑے میں ایسا اُلجھا دیا جائے کہ وہ غالبؔ کی درخواست ہی گورنر جنرل تک نہ پہنچائیں۔ چوں کہ غالب مخالفین کے مقصد سے بخوبی واقف تھے اس لیے اُنھوں نے اپنی صفائی میں حکومت کو خط لکھا۔ اُنھوں نے اس پورے معاملے کے بارے میں ایک فارسی خط میں (خط پر) اُس سرکاری افسر کا نام نہیں ہے جسے خط لکھا گیا ہے) غالبؔ لکھتے ہیں:

> ''مخفی نہ رہے کہ جب میں کلکتے پہنچا تو ایک بدطینت اور میرے وطن کا ستم گر (مرزا افضل بیگ) میرے کلکتے پہنچنے سے پہلے دہلی سے یہاں آچکا تھا اور اربابِ حکومت سے تعلقات رکھتا تھا۔ اس نے میرے خلاف یہ پروپیگنڈہ کیا کہ دہلی سے اس تازہ وارد مصیبت کے مارے نے (کلکتے پہنچ کر) اپنا نام اور تخلص دونوں بدل لیے ہیں جس کی وجہ سے دفتر کے کارکنوں کو سربراہ (گورنر جنرل) کے سامنے میرے معاملے کو پیش کرنے میں تامل ہوا۔ سات سال سے زیادہ مدت ہوئی کہ میں نے اپنا دیوانِ ریختہ مرتب کیا تھا۔ اس دیوان کے آخر میں میرے نام کی ایک مہر ثبت تھی۔ مہر پر''اسداللہ خاں عرف مرزا نوشہ۔ ۱۲۳۱ھ کندہ تھا۔ دشمنوں کا منہ بند کرنے کے لیے یہ مہر کافی تھی۔ میں نے سرکاری دفتر کے افسرِ اعلا کے پاس یہ دیوان بھیج دیا اور یہ خط ساتھ بھیجا۔
>
> قبلۂ سعی ستم رسیدگان۔ سلامت
>
> شیوۂ جانفشانی کے اظہار کے بعد گزارش ہے کہ میرے اسم وعلم

کے سلسلے میں جو تفرقہ پیدا کیا گیا ہے۔ وہ اس تنگِ آفرینش کے لیے باعثِ شرم بھی ہو سکتا ہے لیکن کیا کیا جائے پریشانیوں میں پریشانیاں پیدا ہو رہی ہیں...... سبحان اللہ دو سو فرسنگ سے تلوار کی دھار پر سفر کرتا ہوا اور شرکا کے ظلم و ستم کے خلاف فریاد کرتا ہوا عدالتِ انصاف میں حاضر ہوا ہوں۔ اگر یہاں سے لعنت کا طوق گردن میں ڈال کر اور ملامت کے سنگریزے دامن میں بھر کر واپس جاؤں تو میرے بعد یہاں کے لوگ کہیں گے کہ فلاں زمانے میں ایک ایسا گمنام اور مجہول الاحوال شخص اس عظیم شہر میں آیا تھا جو ہر سال نیا تخلص اختیار کرتا تھا اور ہر مہینے اور ہر ہفتے اپنا نیا نام رکھ لیتا تھا۔ میرا دیوان اور پرانی غزلوں کے مقطع دیکھے جائیں۔ مدعی کو خاموش کرنے کے لیے یہ کافی ہیں۔ وللہ بغیر بالعباد۔ میرے دوسرے دیوان کے خاتمے پر میرے نام کی مہر...... جو اُن اوراقِ پریشان پر ثبت ہے۔ خاص طور سے بغور دیکھی جائے۔ یہ مہر بھی...... اس گفتگو میں تیغ دودم کی حیثیت رکھتی ہے۔ مہر میں کندہ میرا نام مخالفوں کے منہ بند کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہ بھی ثابت کرنے کے لیے یہ مہر کافی ہے کہ اس گمنام نے مستقل طور پر اپنے نام کو قبول کیا ہے یا نہیں...... حقیقت یہ ہے کہ اس فقیر کا نام اسداللہ خاں ہے، عرف مرزا نوشہ اور تخلص غالب ہے لیکن چوں کہ 'لفظِ غالب' میں چار حروف ہیں اس لیے بعض مصرعوں میں یہ تخلص نہیں آ سکتا اس گناہ گار کا اسمِ مخفف 'اسد' ہے۔ یہ سہ حرفی لفظ ہے اس لیے کبھی کبھی ضرورت پڑنے پر 'اسد' بھی بطور تخلص استعمال کر لیتا ہوں۔ اگر یہ غلطی ہے تو معافی چاہتا ہوں اور اگر جائز ہے تو انصاف کا طالب ہوں۔

توقع ہے کہ میری اس گزارش کے بعد نام تبدیل کرنے کا کمینے پن کا داغ میرے دامن سے دُھل جائے گا۔"[۳] (فارسی سے آزاد ترجمہ)

یہی نہیں بلکہ مذہبی محاذ پر بھی غالبؔ پر حملے کیے گئے۔ بقول غالبؔ:

> '' مرزا افضل بیگ میرے ساتھ پوشیدہ دشمنی رکھتے تھے۔ اُنھوں نے اہلِ سنت میں مجھے کٹر رافضی اور اہلِ تشیع میں صوفی وملحد وزندیق مشہور کردیا۔'' (فارسی سے ترجمہ)[۴]

مرزا افضل بیگ کا مقصد یہ تھا کہ سنّی وشیعہ دونوں فرقے غالبؔ کے خلاف ہوجائیں اور بنیادی مدعا وہی تھا جو پہلے بیان کیا گیا یعنی برطانوی حکومت کے افسران کو غالب سے بدظن کردیا جائے لیکن مرزا افضل بیگ اور ان کے ساتھیوں کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ غالب، نواب محمد علی خاں کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

> '' لیکن خدا کی قسم اس نے (مرزا افضل بیگ) میرے کام میں جوبھی رخنہ ڈالا وہ میرے لیے روزنِ نجات بن گیا۔ کیا کہوں کہ فریزر صاحب سے ملاقات کے وقت اس کے بارے میں...... مولوی عبدالکریم صاحب سے کیسی کیسی غلط بیانیاں ہوئیں، لیکن علی ابنِ ابی طالب کے اعجاز پر نازاں ہوں کہ میرے ساتھ ملاقات میں (بہت اچھی طرح پیش آئے) مجھے رخصت کرنے کے لیے آئے۔ مجھ سے بغل گیر ہوئے، عطر اور پان پیش کیا، جو رسمِ ملاقات کے انتہائی معمولی اور عمومی آداب ہیں بجالائے۔''[۵] (فارسی سے ترجمہ)

یہ حالات دیکھ کر مرزا افضل بیگ نے ایک اور حربہ استعمال کیا جس کی وجہ سے غالبؔ کو سخت ترین پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مشاعروں میں غالبؔ کو شرکت کی دعوت دی گئی جن میں فارسی اور اردو کے اس ہمیشہ زندہ رہنے والے عظیم شاعر کو بہت معمولی لوگوں کے ہاتھوں رسوا اور بے آبرو کرایا گیا۔ مرزا افضل بیگ اور اُن کے گروہ کے لوگوں نے غالبؔ کو شعروادب کے نہیں بلکہ غنڈہ گردی کے میدان میں شکست دی۔ ان معاملات نے غالبؔ کی انا کی لے کو اتنا تیز کردیا کہ غالبؔ نے اپنے بعض مربیوں اور دوستوں کے نام خطوط میں اس ادبی معرکے کے سلسلے میں جو واقعات بیان کیے ہیں ان میں غم وغصے کی وجہ سے کہیں تو غالب کی یادداشت نے دھوکا دیا ہے، کہیں غالب نے مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے اور کہیں اپنی انا کی وجہ سے حقیقت سے روگردانی کرتے ہوئے بے بنیاد اور بے اصل باتیں کہیں ہیں۔ دوسروں اور خاص

طور سے سفیرِ ہرات کی زبانی اپنی تعریف کرائی ہے۔

جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ مرزا افضل بیگ نے غالبؔ کو عوام و خواص کی نظر میں کم علم[6] ثابت کرنے کے لیے مشاعرے کا حربہ استعمال کیا تھا۔

ادبی معرکے کے سلسلے میں تین مشاعرے ہوئے تھے۔ غالبؔ نے اپنے خطوط میں ان مشاعروں میں ہونے والے واقعات کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ معلوم نہیں ہوتا کہ کس مشاعرے میں کیا واقعہ رونما ہوا اور کون سا مشاعرہ کس تاریخ کو منعقد ہوا۔ یہ خطوط بار بار پڑھنے کے بعد میں نے مشاعروں کی جو تاریخیں متعین کی ہیں وہ ہیں:

پہلا مشاعرہ یکم جون ۱۸۲۸ء

دوسرا مشاعرہ ۸رجون ۱۸۲۸ء

تیسرا مشاعرہ ۱۵رجون ۱۸۲۸ء[7]

کس مشاعرے میں کیا واقعہ رونما ہوا۔ غالبؔ کے خطوط کی بنیاد پر اس کا تعین بھی میں نے خود کیا ہے۔

پہلا مشاعرہ

ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل وارن ہسٹنگز نے کلکتے میں ۱۷۸۱ء میں مدرسۂ عالیہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ ۱۸۲۰ء میں اس مدرسے کی ازسرِ نو تشکیل ہوئی۔ مدرسہ اُس عمارت میں منتقل کردیا گیا جو ڈیڑھ لاکھ روپے کی لاگت سے ویلزلی اسکوئر کی شمالی جانب تعمیر کی گئی تھی۔''[8]

سید اکبر علی ترمذی صاحب نے اطلاع دی ہے کہ غالبؔ کی آمد سے پہلے ہی مدرسۂ عالیہ علمی اور ادبی سرگرمیوں کا مرکز بن چکا تھا، کلکتے کے دانش وروں نے ایک انجمن قائم کی تھی جس کے زیرِ اہتمام ہر انگریزی مہینے کے پہلے اتوار کو اس مدرسے میں مشاعرہ منعقد ہوتا تھا۔ غالبؔ نے ادبی معرکے کے سلسلے میں جس پہلے مشاعرے میں شرکت کی تھی۔ وہ یکم جون ۱۸۲۸ء کو مدرسۂ عالیہ میں منعقد ہوا تھا۔

نواب محمد علی خاں کے نام پہلے مشاعرے کا ذکر کرتے ہوئے غالبؔ نے لکھا ہے:

''اس شہر کے نکتہ رس اور سخن ور افراد نے اس خاکسار کے ورود سے پہلے ہی ایک انجمن بنا رکھی ہے۔''[9] ہر ماہ انگریزی شمسی کے پہلے یک شنبہ کو یہ اہلِ قلم اور مدرسۂ کمپنی بہادر کے ادبا اور اہلِ علم یہاں جمع ہوتے ہیں اور ہندی و فارسی غزلیں پڑھتے ہیں۔''[10] (فارسی سے ترجمہ)

غالبؔ نے ایک خط میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

''مجھے خاص طور سے ذلیل کرنے اور نقصان پہنچانے کے لیے ایک انجمن تشکیل دی۔ ایک مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا۔ کلکتے کے شاعروں کو مدعو کیا اور مجھے بھی دعوت دی۔ ریختہ گو شعرا کو اردو کا اور فارسی گو شعرا کو فارسی کا مصرعۂ طرح بھیجا اور مجھے دونوں زبانوں کے مصرعے بھیجے۔ جون کے مہینے کے پہلے اتوار کو یہ مشاعرہ منعقد ہوا۔ میں نے دونوں زبانوں میں طرحی غزلیں پڑھیں۔ خواص اور عوام دونوں نے میرا کلام پسند کیا۔ اہل انصاف کے ایک گروہ نے کہا کہ جس کی فصاحت کا یہ حال ہو، اس کے مقابلے میں قتیلؔ کیا ہے بلکہ پچھلے شاعروں میں مثلاً اسیر اور اس مرتبے کے دوسرے شاعروں سے غالب ہم سری کا دعوی کرے تو کچھ غلط نہیں۔ بلکہ یہ دعوی غالب کو زیب دیتا ہے۔ مجھے خدا پر ناز ہے کہ جو ہنگامہ مجھے رسوا اور بے آبرو کرنے کے لیے کیا گیا تھا وہ میری شہرت اور اظہارِ کمال کا ذریعہ بن گیا۔''[11] (فارسی سے ترجمہ)

دوسرا مشاعرہ

جیسا کہ بتایا جاچکا ہے کہ پہلے مشاعرے میں عوام و خواص دونوں نے غالبؔ کا کلام پسند کیا۔ بقولِ غالب:

’’ دوسری صحبت (مشاعرہ) کے لیے حکیم ہمام کی غزل کا ایک مصرع، مصرع طرح کے طور پر دیا گیا۔اس غزل کا پہلا مطلع ہے:

درمیانِ مَن و دلدار ہمام است حجاب
دارم امید کہ آں ہم ز میاں برخیزد ‘‘ [۱۲]

(فارسی سے ترجمہ)

یہ مشاعرہ ۸ر جولائی ۱۸۲۸ء کو مدرسۂ عالیہ میں منعقد ہوا۔ بقولِ غالبؔ:

’’ دس بارہ اشعار میں نے بھی اسی ردیف قافیے میں لکھے اور مشاعرے میں پڑھے۔‘‘ [۱۳] (فارسی سے ترجمہ)

مشاعرے میں تو سامعین نے خاموشی سے غالبؔ کی غزل سن لی۔ وہاں کسی نے اعتراض نہیں کیا لیکن مخالفین تاک میں رہے۔ ایک ہفتے بعد بقول غالب:

’’ اطلاع ملی کہ کسی بے وقوف نے ان اشعار میں سے ایک شعر پر نکتہ چینی کر کے خود کو اربابِ ذوق کی نظر میں رسوا کیا ہے۔‘‘ [۱۴] (فارسی سے ترجمہ)

غالبؔ کا شعر ہے:

جزوے از عالمم و از ہمہ عالم بیشم
ہمچو مُوے کہ بتاں را ز میاں برخیزد

’’ اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ ’عالم‘ کلمۂ مفرد ہے، اس کے ساتھ لفظ ’ہمہ‘ کی ترکیب درست نہیں ہے اور وہ اس وجہ سے کہ ’عالم‘ بذاتِ خود مجموعۂ اشیا ہے اور ’چہار شربت‘ اور ’نہر الفصاحت‘ میں اس (ترکیب) کی نشان دہی نہیں کی گئی ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ لفظ ’بیش‘ تا وقتے کہ اس کے بعد ’تر‘ نہ لائیں، استعمال نہیں ہوتا۔ چناں چہ مناسب نہیں ہے کہ اس کو (تنہا) لکھا جائے ’بیش تر‘ کہنا چاہیے، ’بیش‘ تنہا نہیں کہا جا سکتا۔ مزید

یہ کہ معشوق کی کمر پر بالوں کا اگنا عقلاً اور عادتاً...... (قیاسی: محال ہے) دیگر یہ کہ بالوں کے یا سبزے کے اُگنے کو 'بر خاستن' نہیں کہا جا سکتا۔''[۱۵] (فارسی سے ترجمہ)

تیسرا مشاعرہ

غالبؔ نے لکھا ہے کہ جب میں نے ان اعتراضات پر نظر ڈالی اور معترض کی علمی حیثیت کو جانچا (قیاسی: تو مجھ پر واضح ہو گیا کہ اس نالائق کے منہ لگنا) اور اس سے گفتگو کی زحمت اُٹھانا میرے لیے جائز نہیں۔

۱۵ر جون ۱۸۲۸ء کو تیسرا مشاعرہ منعقد ہوا۔ غالبؔ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کم علم معترض کے منہ نہیں لگیں گے لیکن غالباً تیسرے مشاعرے میں بھی ان پر اعتراض کیے گئے' ہمہ عالم' کی ترکیب پر اعتراض کرتے ہوئے کسی نے کہا کہ قتیلؔ کی تصانیف' چہار شربت' اور 'نہر الفصاحت' میں یہ نہیں بتایا گیا کہ 'عالم' کلمہ مفرد ہے، اس لیے اس کے ساتھ 'ہمہ' کی ترکیب درست نہیں ہے۔

ہماری معلومات کے مطابق کسی نے غالبؔ کا قتیلؔ سے پہلی بار موازنہ کیا تھا۔ یہ بات غالبؔ کو اتنی ناگوار گزری کہ زندگی بھر دل سے نہیں نکلی۔ اس طرح کے اعتراضات سے غالب خود پر قابو نہیں رکھ سکے اور بقول غالب:

''یہ گفتگو کرتے ہوئے میرے نطق کا گھوڑا بدکا اور اس نے میدانِ حق جوئی میں فتنے کی گرد اُڑا دی۔''[۱۶] (فارسی سے ترجمہ)

پھر غالبؔ لکھتے ہیں:

''لیکن چوں کہ حق کی حمایت کرنا اور حق کے لیے جنگ کرنا ہر ایک متنفس کے لیے فطری امر ہے۔ مجھے بھی قدرے غصہ آ گیا اور میں مشاعرے کے تیسری نشست میں ان اعتراضات کا جواب دینے پر آمادہ ہو گیا۔''[۱۷] (فارسی سے ترجمہ)

غالبؔ نے کہا کہ ہمہ عالم کی ترکیب بالکل درست ہے۔اسی طرح ’بیش‘ اور ’برخاست‘ کا استعمال بھی غلط نہیں ہے۔

غالبؔ اسی خط میں لکھتے ہیں کہ:

’’چناں چہ وہ چند اشعارِ اساتذہ جو میں اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کیے تھے اب بھی مجھے یاد ہیں۔‘‘ (فارسی سے ترجمہ)

ان اشعار میں سے ایک شعر حافظ علیہ الرحمتہ کا ہے، جو لفظ ’ہمہ‘ اور ’عالم‘ کی ترکیب کی نشان دہی کرتا ہے:

گر من آلودہ دامنم چہ عجب
ہمہ عالم گواہِ عصمتِ اوست

دوسرے ایک مطلع ہے مصلح الدین سعدی علیہ الرحمتہ کا:

بہ جہاں خرم از آنم کہ جہاں خرم ازوست
عاشقم بر ہمہ عالم کہ ہمہ عالم ازوست

ایک اور شعر حضرت نورالدین جامی علیہ الرحمتہ والغفران کا ہے جو مکمل طور پر بغیر ’تر‘ کے لفظ ’بیش‘ کے استعمال کا جواز ہے:

کم از آنم کہ درِ معذرتم باید زد
بیش از آنی کہ دہی خجلتِ تقصیر مرا

ایک اور شعر بھی (کسی) استاد کا ہے، جو ’برخاستن‘ اور ’روئیدن‘ کے ہم معنی ہونے کے اثبات میں ہے چناں چہ شاعر کہتا ہے:

از رخ، خطِ مشک سود برخاست
آتش بہ نشست و دود برخاست‘‘ ۱۷

غالبؔ نے مرزا احمد بیگ طپاںؔ کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

> ''نوازش نامہ پہنچا اور اس نے میری عاجزی کی آبرو بڑھادی۔ تینوں مطلعوں کو میں نے اپنے دعوے کے جسم کی روح سمجھتے ہوئے محفوظ کرلیا ہے۔ خیال ہے کہ چند روز ٹھہر کر محفلِ مشاعرہ میں بلند آواز سے پڑھے جائیں تا کہ اہل محفل بھی سن لیں اور اعتراض کرنے والے کی رسوائی اور معترض کی گراں رنگی ان پر ظاہر ہو جائے۔''[18] (فارسی سے ترجمہ)

طپاںؔ نے غالباً اساتذہ کے ایسے تین اشعار لکھ کر بھیجے تھے، جنھیں غالبؔ مخالفین کے سامنے اپنی دِفاع میں سند کے طور پر پیش کر سکتے ہوں۔

بیشتر ماہرینِ غالبؔ نے جن میں مالک رام صاحب بھی شامل ہیں، لکھا ہے کہ' جب غالبؔ نے برخیزد والی غزل پڑھی تو کچھ سامعین نے اعتراضات کیے۔ بقول مالک رام صاحب:

> ''اس پر حاضرین میں سے کسی نے اعتراض کیا کہ مصرعِ اولیٰ میں 'بیش' کی جگہ (بیشتر) ہونا چاہیے تھا۔ برابر سے ایک دوسرے صاحب بول اُٹھے کہ مصرع ثانی میں' موے زمیاں' کی ترکیب غلط ہے بلکہ پورا شعر بے معنی ہے۔ ایک اور صاحب نے' ہمہ عالم' کی ترکیب پر فرمایا کہ' عالم مفرد ہے، اس کا ربط ہمہ کے ساتھ حسبِ اجتہادِ قتیلؔ ممنوع ہے۔

غالبؔ نے ایک اور غزل بھی پڑھی تھی۔ اس میں شعر ہے:

شورِ اشکے بہ فشارِ بُنِ مژگاں دارم
طعنہ بر بے سروسامانیِ طوفاں زدہ[19]

مالک رام صاحب بہت محتاط محقق تھے۔ اتفاقاً غالبؔ کے ایک خط کی عبارت پر اُن کی نظر نہیں گئی۔ غالب نے نواب محمد علی خاں کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ:

> ''ایک ہفتے بعد کسی نااہل یا نالائق نے میرے ایک شعر پر اعتراضات کیے۔ اس کا مطلب ہے کہ غالبؔ کی غزل پر اعتراضات اس مشاعرے (دوسرا مشاعرہ) میں نہیں کیے گئے تھے بلکہ مشاعرے کے

ایک ہفتہ بعد کیے گئے تھے' شورِ اشکے بہ فشارِ بنِ مژگاں دارم۔'' والی غزل غالب نے تیسرے مشاعرے میں پڑھی تھی۔اس کے ایک شعر پر اسی مشاعرے میں اعتراض کیا گیا تھا۔

غالب نے لکھا ہے:

'' پہلے اُنھوں نے یہ مشہور کر دیا کہ '' زدہ'' کے کسرے کو مضاف الیہ کی ضرورت ہے۔ جب انھیں جواب ملا کہ زدہ میں کسرہ اضافی نہیں بلکہ یاے وحدت ہے تو وہ دم بخود ہو گئے اور کہنے لگے (زدہ) میں 'ہمزہ' ہمیشہ مفعول میں آتا ہے لیکن یہاں مفعول کے معنی میں نہیں آیا ہے۔''

غالب نے اپنی مثنوی 'بادِ مخالف' میں بھی اس اعتراض کا جواب دیا ہے۔نواب محمد علی خاں کے نام ایک خط میں تیسرے مشاعرے کا ذکر کرتے ہوئے غالب لکھتے ہیں:

'' محفل اختتام کو پہنچی اور ہر شخص اپنے اپنے گھر چلا گیا۔اس مکان میں جو لوگ موجود تھے۔کیا شاعر اور کیا غیر شاعر، سب نے شور مچانا شروع کر دیا اور میرے خلاف ہنگامے پر اُتر آئے اور انھیں میری شکست میں اپنی فضیلت نظر آئی اور وہ میری غزل کا ایک شعر لے بیٹھے اور نکتہ چینی اور ناانصافی کی داد دینے لگے۔شعر یہ ہے:

شورِ اشکے بہ فشارِ بُنِ مژگاں دارم

طعنہ بر بے سر و سامانیٔ طوفاں زدہ''[۲۰]

غالب کے خطوط سے ہنگامہ کرنے والوں میں صرف ایک آدمی کے نام کا پتا چلتا ہے اور وہ ہیں مرزا افضل بیگ ۔قریبی رشتے دار ہونے کی وجہ سے اُنھوں نے غالب کے سامنے آکر اعتراضات نہیں کیے اور غالباً کبھی کوئی گستاخی بھی نہیں کی۔غالب کے خطوط سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ہنگامہ کرنے والوں میں کئی لوگ شامل تھے اور بقول غالب:

'' وزیر اور رُخ تو پیچھے رہے اور پیدلوں کو آگے کر دیا گیا'' (فارسی سے ترجمہ)

مولانا ابوالکلام آزاد نے ان ہنگامہ کرنے والوں کے سلسلے میں لکھا ہے:

'' کلکتہ میں یہ ہنگامہ جن لوگوں نے بپا کیا تھا، میں ان کے نام معلوم کرنا چاہتا تھا مگر بجز دو تین کے معلوم نہ ہو سکے۔ ایک صاحب احمد علی گوپاموی کے پرنس غلام محمد (میسور) کے یہاں میر منشی تھے۔ 'حملۂ حیدری' کا انھوں نے اردو ترجمہ کیا ہے۔ دوسرے صاحب ان ہی کے ہم نام مولوی احمد علی مدرسہ عالیہ میں مدرس اور ایشیاٹک سوسائٹی کی فارسی عربی مطبوعات کے مصحح تھے۔ تیسرے ایک صاحب مولوی وجاہت علی لکھنوی گورنر جنرل کے دفتر انشا میں ملازم تھے۔ ان لوگوں نے صرف اعتراضات ہی نہیں کیے تھے بلکہ تحریرات بھی لکھی تھیں اور بعض تحریرات 'جامِ جہاں نما' نے جو فارسی کا ہفتہ وار اخبار تھا، چھاپ دی تھیں، وجاہت علی، قتیل کے شاگرد اور وجاہت تخلص کرتے تھے۔''[۲۱]

مولانا آزاد کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے مالک رام صاحب نے لکھا ہے:

'' احمد علی گوپاموی اور وجاہت لکھنوی سے متعلق کچھ کہنے سے قاصر ہوں لیکن مولوی احمد علی مدرس مدرسۂ عالیہ کا نام اس سلسلے میں لینا یقیناً غلط ہے۔ یہ وہی صاحب ہیں، جنھوں نے کئی برس بعد برہانِ قاطع والے مباحثے میں، غالب کے جواب میں مؤید برہان، تالیف کی تھی۔ ان کی تاریخ ولادت ۱۷/دسمبر ۱۸۳۹ء (۱۰/شوال ۱۲۵۵ھ) ہے۔ (مظہر علی ان کا تاریخی نام تھا)، جب کہ میرزا کو یہ سفر ہی ۱۸۲۸ء ۔ ۱۸۲۹ء میں پیش آیا تھا۔''[۲۲]

دل چسپ بات یہ ہے کہ 'ہمہ عالم' کے سلسلے میں جس سند کا حوالہ پیش کیا گیا تھا۔ وہ سید اسد علی انوری فرید آبادی کی تحقیق کے مطابق قتیل کی تصنیفات میں تلاش کے باوجود نہیں ملا۔ معترض نے محض اپنے اعتراض میں وزن پیدا کرنے کے لیے قتیل کے نام سے سند پیش کی تھی، جس کا مطلب ہے کہ غالب زندگی بھر بے قصور قتیل کو اس غلطی کی بنیاد پر سزا دیتے رہے جو قتیل سے سرزد ہی نہیں ہوئی تھی۔''[۲۳]

قتیلؔ کا نام آتے ہی غالبؔ بھڑک اُٹھتے اور دشنام طرازی کی تمام مہذب حدوں کو پار کرجاتے۔

'غالب اور قتیلؔ' کے عنوان سے علاحدہ باب میں اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مخالفین نے غالبؔ پر چوطرفہ حملہ کیا تھا۔اس کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ:

> ''(مخالفوں) نے صرف اعتراضات ہی نہیں کیے تھے بلکہ تحریرات بھی لکھی تھیں اور بعض تحریرات 'جامِ جہاں نما' نے جو فارسی کا ہفتہ وار اخبار تھا، چھاپ دی تھیں۔''[۲۴]

غالبؔ نے مرزا احمد خاں تپاںؔ کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ'' اُن مخالفوں نے غالب کی زندگی اجیرن کردی تھی۔جب وہ بازار سے گزرتے تھے تو مخالفین اُن پر آوازیں کستے تھے۔''

نوبت یہاں تک آگئی تھی کہ غالبؔ کے ایک **کرمِ فرما** کو یہ شبہ ہوا کہ کہیں مخالفین غالبؔ کو جسمانی زک نہ پہنچائیں۔اس لیے انھوں نے غالب سے کہا کہ وہ اپنی قیام گاہ چھوڑ کر اُن کے گھر آجائیں۔مگر غالبؔ کو یہ منظور نہیں تھا۔

اگست تا اکتوبر ۱۸۲۸ء کے دوران غالبؔ نے کلکتے کے اپنے ایک مربی سراج الدین احمد کو خط لکھا ہے۔اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ سراج الدین احمد کو خیال تھا کہ مخالفین کی وجہ سے غالبؔ سخت ذہنی کرب کے شکار ہیں اور ممکن ہے سراج الدین احمد کو یہ ڈر بھی ہو کہ کہیں مخالفین غالب کو جسمانی زک نہ پہنچائیں۔اس لیے ایک دن اُنھوں نے غالبؔ سے کہا کہ وہ کلکتے میں شملہ بازار کا مکان چھوڑ کر اُن کے گھر منتقل ہوجائیں۔غالبؔ کو یہ منظور نہیں تھا۔اُنھوں نے دوسرے دن سراج الدین احمد کو خط لکھا، جس میں معذرت کی کہ وہ اُن کے گھر منتقل نہیں ہونا چاہتے نیز اس ادبی معرکے کی اہم تفصیلات بیان کیں۔

سراج الدین احمد کے نام غالبؔ کے فارسی خط کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو:

> ''میرے امید گاہ! کل کی صحبت کا دل پر کوئی اثر نہیں اور نہ ہی مجھے کوئی ایسی تکلیف پہنچی کہ میں سخن سازی کروں......حاشا!

میں نے جو کچھ کہا تھا، اُس کی بنیاد مکر و فریب پر نہیں تھی اور اب بھی جو کچھ عرض کر رہا ہوں، وہ منافقت یا آپ کو خوش کرنے کے لیے نہیں ہے۔ مختصر یہ ہے کہ میرا خیال ہے کہ آپ چاہتے ہیں کہ پریشان حال غالب شملہ بازار کے ویرانے کا الو بننے کے بجائے آپ کے عظیم الشان محل کی دیوار پر آشیانہ بنائے۔"۲۵ اس عنایت کے دو مقاصد ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ چاہتے ہیں کہ میں ہمیشہ آپ کے ساتھ رہوں اور دوسرا مقصد یہ ہو سکتا ہے کہ آپ کو میرے پردیسی ہونے پر رحم آ رہا ہے۔

اگر آپ کا مقصد پہلا ہے تو معافی چاہتا ہوں اور اگر دوسرا ہے تو انصاف کا طالب ہوں۔ اس لیے کہ جب اتنی مسافت کے باوجود ایسا موردِ عتاب ہوں تو قربت ہونے پر اپنی عزتِ نفس کو کیسے بچا پاؤں گا بس ایسے ہی اندیشہ ہائے دور دراز میں گرفتار ہوں۔ ایمان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں کمینوں اور ذلیلوں کی طرح شکایتوں پر مبنی طویل گفتگو نہیں کر رہا لیکن یہ کیسے کہوں کہ اہلِ علم کی ناانصافیوں سے مجھے شکایت نہیں ہے۔ پہلے تو لوگ کہنے لگے کہ فلاں (غالب) قتیل کو برا بھلا کہتا ہے۔ ایک دنیا میرے خلاف ہوگئی اور محفل میں مجھ پر اعتراضات کیے گئے۔ ایک شخص کو میرے مقابل کر دیا۔ مجھے وادیِ سخن کا ایک کمزور شکار سمجھ لیا گیا۔ جب دیکھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے اور اُن کے بازار کی رونق ختم ہوگئی تو فیل اور رُخ کو بچا کر دشمنی کی بساطِ شطرنج کو کچھ پیادوں کی چال کے لیے وقف کر دیا۔ (غالب کا مطلب غالباً یہ ہے کہ اس معرکے میں اہم شخصیتیں ایک طرف ہوگئیں اور معمولی اور کم رتبہ لوگوں کو غالب کے مقابل کر دیا اور میرے لیے ہر چال مشکل کر دی۔ خدا کا شکر ہے کہ میں داورانِ دہر سے جس چیز کا طالب ہوں وہ سلیقۂ سخنوری سے مشروط نہیں ہے، اس لیے اس

لڑائی سے مجھے کیا ڈر اور اس ہنگامے سے مجھے کیا نقصان پہنچے گا۔

کتوں کے بھونکنے سے فقیروں کا رزق کم نہیں ہوتا لیکن چوں کہ چڑیاں، عقاب کے پروں کے زور پر اڑتی ہیں اور ندیاں سمندر کے بل پر بہتی ہیں۔اس لیے میں اس شہر (کلکتے) سے بددل ہوگیا ہوں اور میرے دل کو بہت صدمہ پہنچا ہے۔ میں نے عاجزی کی خاک پر اپنی جبیں رگڑی، قبولیت نہ ملی۔ معافی اور اعتذار کا راستہ اختیار کیا۔ اُنھوں نے آفریں نہ کہا۔ حیراں ہوں کہ بزرگان و عمائدینِ انجمن کی کون سی ایسی مناسب خدمت بجا لاؤں کہ میں درخورِ تحسین ہوسکوں۔ یہ تمام میرے دل کا خون ہے جولب دکام سے ٹپک رہا ہے اور اس کا کوئی مقصد نظر نہیں آتا۔ جو مدعا محتاجِ اظہار ہے، وہ یہ ہے کہ اختر شناسوں کا عام قاعدہ ہے کہ مبارک لوگوں کی نظرِ عداوت سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا اور منحوس لوگوں کی نظرِ محبت سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ذاتِ اقدسِ الٰہی کی عظمت و جلال کی قسم کہ میں نے آپ کو بہت پاکیزہ گوہر اور نیک نہاد پایا ہے۔

اگر مرزا افضل بیگ اُس اضافی رشتے کو قطع نظر فرمادیں جو انھیں آپ سے ہے تو آپ کی نیک فطرت اور کریم النفسی کے پیشِ نظر مرزا افضل بیگ سے آپ کی دوستی اور قرابت کو ذہن میں رکھوں تو اس شہر کے بزرگوں کی دوستی کے مقابلے میں آپ کی دشمنی کو بہتر سمجھتا ہوں۔ حالاں کہ عداوت کی کیا گنجائش ہے اور دشمنی کا کیا موقع ہے۔ چوں کہ اس کا کوئی سبب نہیں ہے اور عداوت کا تعلق عرض سے ہے، جوہر سے نہیں لیکن اس ویرانے سے منتقل ہوکر آپ کی محبت کے سائے میں مقیم ہونے سے ڈر ہے کہ کہیں رنجش و آزردگی نہ پیدا ہوجائے۔ میں آپ کا عتاب تو گوارا کرسکتا ہوں لیکن ڈر یہ ہے کہ اگر مجھے اُس گروہ سے قربت ہوگئی تو کون سا صدمہ ہے جو مجھے برداشت نہیں کرنا

پڑے گا اور کون سی مصیبت ہے جو برداشت کرنی نہیں پڑے گی۔ حق بات یہ ہے کہ دوست کی دی ہوئی تکلیف دشمن کی محبت سے بہتر ہے۔ جب یہ کلیہ ثابت ہو گیا اور ایک دوسرے سے دل بھی صاف ہو گئے تو اب میں اصل مقصد پر آتا ہوں اور حالات پر سے پردہ اُٹھاتا ہوں۔ اگر ایک گھر میں ساتھ رہنے کا مقصد صحبتِ دوام ہے تو یہ ممکن نہیں ہے۔ آپ صبح دفتر چلے جائیں گے اور شام کو واپس آئیں گے۔ رات آرام اور استراحت کے لیے ہے، حرف و حکایت کے لیے نہیں۔ اگر آپ یہ سب کچھ میری غم خواری اور دل جوئی کے لیے کر رہے ہیں تو میری حالت پر غور فرمائیں۔ میرا کیا حال ہے اور میں کیا سوچ رہا ہوں۔ اس وقت میری حالت اُس قطرے کی سی ہے جو راستے کے کانٹے پر ہو اور اس کالے دانے کی طرح ہو جو انگارے پر ہو۔ اس لیے مجھے اتنی فرصت کہاں کہ یہ جانوں کہ کاتبانِ تقدیر نے میری قسمت میں کیا لکھا ہے اور میری خاک کو کیسی کیسی آرزوؤں کے خون میں گوندھا ہے۔ کلکتہ میرے سفرِ آوارگی کی انتہا نہیں ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ کن کن پہاڑوں اور بیابانوں سے گزرنا ہے اور کن کن راستوں پر قدم گھسنے ہیں۔ اگر آپ کے دیوار کے سائے میں دو تین مہینے آرام کر بھی لوں تو کیا فائدہ۔

مرا بہ بیں کہ چہ روزِ سیاہ در پیش است

مختصر یہ کہ اس سے بڑی اور کوئی عنایت نہیں ہوگی کہ مجھے اس کنجِ خرابہ میں تنہا چھوڑ دیں اور سمجھ لیں کہ مجھے اس بے کس کو پردیس میں موت آ گئی اور وہیں اُسے سپردِ خاک کر دیا۔

دوست غم خواری میں میری سعی فرماویں گے کیا
زخم کے بھرتے تلک ناخن نہ بڑھ جاویں گے کیا

اللہ بس ماسوا ہوس فقط۔"

(صفر تا ربیع الثانی ۱۲۴۴ھ مطابق اگست تا اکتوبر ۱۸۲۸ء) ۲۵؎

(فارسی سے ترجمہ)

مخالفین نے عرصے تک غالبؔ کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ بہت چھوٹی اور رکیک حرکتیں کی جاتی رہیں لیکن ایک چھوٹی حرکت یہ تھی کہ 'جامِ جہاں نما' میں غالبؔ کی پینشن کے مقدمے کے بارے میں ایسا خط چھاپا گیا جس کا مقصد غالبؔ کو نقصان پہنچانا تھا۔

'جامِ جہاں نما' کا وہ شمارہ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے ہمیں اس کا علم نہیں کہ اس اخبار میں غالب کے خلاف کیا شائع ہوا، کس کے نام سے خط چھپا اور کب؟ ہاں، غالب نے 'جامِ جہاں نما' کے اڈیٹر کو جو خط لکھا تھا، اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالبؔ کی پینشن کے مقدمے کے بارے میں لکھا گیا تھا اور بتایا گیا تھا کہ غالبؔ کا دعویٰ غلط ہے۔ غالب نے 'جامِ جہاں نما' میں اپنے خلاف شائع ہونے والی تحریر کے بارے میں ایک فارسی خط میں لکھا ہے:

> ''آج کی تازہ خبر یہ ہے کہ 'جامِ جہاں نما' دیکھا۔ (اس میں میرے خلاف جو کچھ چھپا ہے) اُس سے سوائے بے آبروئی کے اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ آپ نے بھی وہ اوراق ملاحظہ کیے ہوں گے۔ واللہ باللہ ثم تا اللہ مجھ مسکین کے بارے میں اُن اوراق میں جو کچھ مندرج ہے، وہ سب محض جھوٹ، بہتان اور الزام تراشی ہے۔'' (ترجمہ) ۲۶؎

اب وہ خط ملاحظہ کیجیے جو غالبؔ نے 'جامِ جہاں نما' کو لکھا تھا۔ خط کے پہلے فقرے سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب 'جامِ جہاں نما' کے اڈیٹر سے واقف نہیں تھے، اس لیے انھوں نے ادارے میں کام کرنے والوں کو مخاطب کیا ہے۔

> ''جامِ جہاں نما'' کے اوراق کو خوب صورت بنانے والے حضرات کے ذہن میں انصاف کے طالب اسد اللہ خاں کی یہ گزارش ذہن میں رہے کہ یہ ننگِ آفرینش کہ جو اسد اللہ خاں معروف بہ مرزا نوشہ متخلص بہ غالب سونک سونسا کے جاگیردار نصر اللہ بیگ خاں کے بھائی کا بیٹا ہے۔ سرکارِ انگریزی سے اُسے جو حق (پینشن) ملا ہے، اُسے فیروز پور کے جاگیردار سے

حاصل کرنا چاہتا ہے۔ صدر والا کے حکم کے مطابق ریذیڈنسی کے اور وہ غلط خبریں شائع ہو جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ میں پورے شہر سے جھگڑا نہیں کرسکتا اور لوگوں کو اپنے حال سے آگاہ نہیں کرسکتا۔

اس ستاروں سے بھرے آسمان کا کیا کروں کہ یہ تو میرا زبردست دشمن ہے۔ مجبور ہو کر دشمنوں کے شان و شوکت سے پناہ مانگتا ہوں اور 'جامِ جہاں نما' کے ذمے داران سے چاہتا ہوں کہ بے کسوں کی سرپرستی کریں اور 'جامِ جہاں نما' میں منسلکہ چند سطریں شائع فرمادیں اور آئندہ ہوش حواس سے اس گمنام کے بارے میں دہلی سے کوئی خبر پہنچے تو اسے نظر انداز کردیں اور اسے شائع نہ کریں۔ یہ درخواست ہمیشہ کے لیے ہے اور مجھے اس التماس میں بہت زیادہ اِصرار ہے۔''

بادِ مخالف

غالبؔ کی مثنوی 'بادِ مخالف' صرف ایک ادبی شاہکار ہی نہیں ایک عظیم فن کار کے ذہنی کرب اور قلبی وارداتوں کا آئینہ بھی ہے۔ غالبؔ نے اس مثنوی میں دکھ درد، انبساط و خوشی کی جو تصویر کشی کی ہے، اس کا سرچشمہ ان کی زندگی کے وہ ہولناک تجربات و مشاہدات بھی ہیں، جن سے غالبؔ کلکتے میں اپنے مخالفین کے سبب گزرے تھے۔

میں نے 'غالب کے خطوط' کی پہلی جلد کے مقدمے میں لکھا تھا کہ 'تہی دستی، مفلسی، ناقدری، بے عزتی، ذلت و رسوائی ناکامی اور مایوسی غالبؔ کی حسرتِ تعمیر کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔''

تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

نغمہ ہائے غم ہی کو اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

دلا یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے، نہ آہِ نیم شبی

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

یہ اشعار اور فارسی اور اردو میں اس قبیل کے بے شمار اشعار وہی شخص کہہ سکتا ہے، جو ناکامیوں اور مایوسیوں کے سامنے سینہ سپر ہو اور جو آخری لمحے تک اپنی بربادیوں سے مقابلہ کرنے کا بے پناہ حوصلہ رکھتا ہو اور جو زندہ رہنے کے لیے مسلسل جہاد کرتے رہنے کا سلیقہ بھی جانتا ہو۔ مثنوی 'بادِ مخالف' کے مطالعے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اگر غالبؔ میں غیر معمولی قوت ارادی نہ ہوتی اور غم و اندوہ اور تلخ کامیوں کا مقابلہ کرنے کی بے پناہ ہمت اور حوصلہ نہ ہوتا تو وہ کلکتے

کے سفر اور کلکتے کے قیام میں درپیش آنے والے مصائب و آلام سے جاں بر نہیں ہو سکتے تھے۔ 'بادِ مخالف' کے تین چار اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کے مخالفوں میں سماجی اعتبار سے کم رتبہ لوگوں کے ساتھ ساتھ بعض اونچے طبقے کے افراد بھی تھے، جن میں ہندوستانی ریاستوں کے وکیلوں اور سفیروں کے علاوہ کلکتہ شہر کے بعض بااقتدار رئیس بھی تھے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کہ یہ مخالفین سماجی رتبے میں غالب سے بڑے تھے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ غالب فارسی اور اردو کی اقلیمِ سخن کے بے تاج بادشاہ تھے۔ اس میدان میں خدا نے انھیں اپنے زمانے ہی کی نہیں آنے والے زمانوں کی حکمرانی بھی بخشی تھی۔

آج غالب کی شہرت اور مقبولیت جغرافیائی حدود کو پار کرتی ہوئی بہت سے ایسے ملکوں میں پھیل چکی ہے، جہاں اردو اور فارسی شناس معدودے چند ہی سہی لیکن اُن ممالک کے سخن فہم اپنی اپنی زبانوں میں ترجموں کے وسیلے سے غالب کے فکروفن تک رسائی کر رہے ہیں۔

اگر غالب نہ ہوتے تو آج مرزا افضل بیگ اور اُن کے گروہ کے لوگوں کو بھلا کون جانتا۔ ان کم مایہ مخالفین کا طرۂ امتیاز تو بس یہی ہے کہ اُنھوں نے غالب جیسے زندۂ جاوید اور عظیم فنکار سے دشمنی مول لی تھی، اُنھیں ہر طرح کی اذیتیں پہنچائیں، جس کے طفیل غالب کے سوانح میں غالب کے ساتھ ساتھ آج جیسے تیسے وہ بھی زندہ ہیں۔

اس مثنوی میں غالب کی خودداری بھی ہے اور خودنگری بھی۔ انھیں اپنی شاعرانہ عظمت کا احساس بھی ہے اور شعروادب کے میدان میں مخالفین پر فوقیت کا دعویٰ بھی حق و صداقت بھی ہے اور خوشامد اور تملق بھی، اونچے درجے کے لوگوں کے روبرو، دریوزہ گری کا لب و لہجہ بھی ہے اور مصلحت کوشی بھی اور اس سب کے ساتھ اپنی انا کے شیش محل چکناچور ہونے کی دل خراش جھنکار بھی۔ دراصل 'بادِ مخالف'، امن و صلح کا وہ علَم تھا جو شکست کے نقصانات سے محفوظ رہنے کے لیے غالب نے اپنے ایک مربّی سید علی اکبر خاں کے مشورے سے بلند کیا تھا۔

کلکتے میں یہ بات مشہور تھی کہ نواب سیّد علی اکبر خاں، غالب کے سرپرست ہیں۔ اس لیے مخالفین میں سے ایک صاحب نواب صاحب کے پاس گئے اور بقول غالب:

> ''اُس جماعت میں سے ایک بزرگ قبلہ و کعبہ نواب سیّد علی اکبر خاں صاحب کے پاس پہنچے اور اُن سے گلہ کیا کہ اسد اللہ دہلوی، جو آپ کے نیاز مندوں میں سے ہے، محفلوں میں بدتمیزی کرتا ہے اور پاسِ ادب بالکل ملحوظ نہیں رکھتا۔ جھگڑے میں زبان درازی اور غصّے میں

پیش قدمی کرتا ہے۔ مشاعرے میں اس نے ہم سب کو برا بھلا کہا ہے مگر اسی محفل میں، جس کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں، میری زبان سے یہ نکلا تھا کہ افسوس، کوئی صحیح مخاطب اور کوئی مستند پارسی دان موجود نہیں کہ معترضِ کی قیمت کو جانچ سکتا اور معترض کے دردِ دل کی تہہ کو پہنچ سکتا۔ ان ہی بزرگ نے، جو میری شکایت لے کر نواب علی اکبر خاں بہادر کے پاس گئے تھے، اس دردمندانہ بات کو خوب نمک مرچ لگا کر پیش کیا اور میری ملامت شروع کر دی۔

نواب علی اکبر خاں نے مجھے نصیحت اور سرزنش کی اور کہا، افسوس اے غالب، کیا تم یہاں سخن پروری اور شعر گوئی کے لیے آئے ہو؟ ہوشیار رہو کہ راستہ دشوار ہے اور رہزن بہت۔

میں نے کہا، میں کیا کروں کہ سزاوارِ ملامت نہ ہوں۔

انھوں نے کہا، اپنا دعویٰ چھوڑ دو اور ساتھیوں سے مصالحت کر لو۔

میں نے کہا، چلو، دعویٰ تو میں نے چھوڑ دیا لیکن میں یہ نہیں سمجھتا کہ مصالحت کس طرح ہوگی۔

انھوں نے فرمایا، اٹھو اور جلد سے جلد معذرت کر لو تا کہ لوگوں کا دل تم سے نہ دُکھے۔

میں نے کہا، معافی کے طریقے اور معذرت کی صورت کے بارے میں بھی فرما دیں (کہ کس طرح ہوگی)۔

اُنھوں نے فرمایا، بطورِ عذر کچھ لکھ دو اور اس تحریر کو میرے پاس بھیج دو کہ میں ان لوگوں کو دکھاؤں اور ان لوگوں کے دلوں سے رنگِ ملال صاف کر دوں۔

چوں کہ یہ بات تہہِ دل سے (کہی گئی) تھی، (میرے) دل میں اُتر گئی۔ میں نے ایک مثنوی لکھی اور ''آشتی نامہ'' اس کا نام رکھا اور ناصحِ محسن مدظلہ العالی کی خدمت میں بھیج دی۔''[1]

غالبؔ نے مولوی محمد علی خاں کے نام ایک فارسی خط میں لکھا ہے:

"......لیکن یہاں کے دانشور، جن میں مخدومی ومکرمی نواب علی اکبر خاں طباطبائی اور مکرمی مطائی محمد محسن شامل ہیں، ان اعتراضوں کا جواب دے رہے ہیں۔

(اس کی کوئی شہادت نہیں ہے کہ ان دونوں نے غالبؔ پر ہونے والے اعتراضوں کے جواب دیے ہوں) ہاں یہ دونوں غالب کے طرفدار اور ہمدرد ضرور تھے۔ میں تو خاموش بیٹھا ہوں لیکن ان دونوں بزرگوں کے حکم پر میں نے ایک مثنوی کہی ہے مثنوی میں عجز وانکسار کے اظہار کے بعد اعتراضات کے جواب دیے ہیں۔ یہ مثنوی لوگوں کو بہت پسند آئی ہے۔ انشاء اللہ العظیم اس کے بعد جو خط آپ کی خدمت میں ارسال کروں گا ، اُس کے ساتھ یہ اشعار (مثنوی) بھی ہوں گے۔"[۲۷] (فارسی سے ترجمہ)

ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے اس مثنوی کا بہت سادہ اور سلیس ترجمہ کیا ہے۔ میں نے خود ترجمہ کرنے کے بجائے ظ۔ صاحب ہی کا ترجمہ پیش کر دیا ہے۔

غالبؔ کو اندازہ تھا کہ اس ادبی معرکے میں ایسے صاحب اقتدار لوگ شامل ہیں، جن کی مخالفت کا اُن کی پینشن کے مقدمے پر بہت برا اثر پڑے گا۔ اس لیے اُنھوں نے مثنوی کی ابتدا میں مخالفین کی مدح سرائی کی۔ انھیں مسیحا دمانِ نادرہ فن، خوش نشینانِ بساطِ شگرف، قافلہ سالار، پہلوانانِ پہلوی داناں وغیرہ کہا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اے تماشائیانِ بزمِ سخن وی مسیحا دمانِ نادرہ فن	اَے بزمِ شعر کے تماشائیو اور اَے اہلِ کمال لوگو، جو مسیحا کی طرح (مردہ جسموں میں جان ڈالتے) ہو،
اے گراں مائگانِ عالم حرف خوش نشینانِ ایں بساط شگرف	بَیان کی دنیا کی گراں قدر شخصیتو اور اس اعلا مسند کو زینت دینے والو،

اے سخن پرورانِ کلکتہ	اے کلکتے کے شاعرو اور
دی زباں آورانِ کلکتہ	اس شہر کے زباں آورد
ہر یکے صدرِ بزم بار گہی شمعِ خلوت سرائے کارگہی	تم میں ہر ایک دربار کی محفل کا صدر نشیں ہے اور کاروبار (علم و ہنر) کی خلوت کی روشنی ہے۔
ہر یکے پیش تاز قافلۂ	تم میں ہر ایک قافلہ سالار اور
ہر یکے کد خدائے مرحلۂ	(کسی نہ کسی) مقام کا مالک ہے۔
اے بشغل وکالت آمادہ داد غم خواریِ جہاں دادہ	تم جو وکالت کے کام میں کمر بستہ اور دنیا بھر کی ہمدردی میں لگے ہوئے ہو
اے شگرفانِ عالم انصاف بسفارت رسیدہ از اطراف	تم جو انصاف کی دنیا (عدالت) کے بے مثل لوگ ہو اور ملک ملک سے یہاں سفارت کے لیے آئے ہو۔
اے سخن را طراز جاں دادہ صفحہ را سازِ گلستاں دادہ	تم ہو جنھوں نے کلام کو رُوح کا حسن دیا اور صفحے کو باغ کی سی رنگینی عطا کردی۔
عطر بر مغز گیتی افشاناں پہلوانانِ پہلوی داناں	دنیا کے دماغ پر خوشبو چھڑ کنے والو، فارسی زبان کے سُورماؤ،

اس کے بعد اردو کے اس عظیم شاعر نے اپنی بے کسی اور مالی دشواریوں سے پیدا ہونے والے ذہنی کرب کا انتہائی دردناک انداز میں ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ میں بدنصیب بے کسی کے پیچ وخم میں پھنسا ہوا ہوں۔ تمھارا بن بلایا مہمان ہوں اور تمھارے دسترخوان کا ریزہ چیں ہوں۔ اپنی پینشن کے مقدمے کا ذکر کرتے ہوئے غالب کہتے ہیں کہ میں فریاد لے کر اس شہر میں آیا ہوں۔ دو چار دن اس خستہ حال کو اپنی دیوار کے سائے میں پڑا رہنے دو۔ غالب مخالفوں کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ میں کون ہوں؟ ایک دل شکستہ اور غم زدہ انسان ایک مصائب و آلام کا مارا۔۔۔ میری روح کو بے بسی کی برق نے پھونک

دیا ہے اور آتشِ غم نے میرے گھر کو جلا دیا ہے۔ میں ناامیدی کے بیاباں میں پیاسا ہوں۔ میں ایک ایسا دردمند انسان ہوں، جس کا جگر پگھل چکا ہے اور غمِ روزگار نے جس کے حوصلے پست کردیے ہیں۔ میں بہت مصیبتیں جھیل کر یہاں تک پہنچا ہوں۔

ادبی معرکے سے پیدا ہونے والی مخالفت کو ختم کرنے کے لیے غالبؔ جیسا خوددار اور انا پرست اپنے سے بہت کم علمی اور فنی مرتبے کے لوگوں سے عاجزانہ درخواست کرتا ہے کہ مجھے پردیس میں جن مشکلات کا سامنا ہے، اس پر غور کرو میں وطن سے دور اور دوستوں سے جدا ہوں۔ غالب اپنے مصائب و آلام اور پریشان حالی کا ذکر کیسے دردانگیز انداز میں کرتے ہیں۔ کہتے ہیں اتنا ہی نہیں کہ میرے لبوں پر فریاد ہے بلکہ خدا گواہ ہے کہ میری جان لبوں پر آ گئی ہے۔ اب اس مثنوی کے متعلقہ اشعار ملاحظہ ہو:

اے گرامی فنانِ ریختہ گو نغز دریا کشانِ عربدہ جو	اردو غزل کے ممتاز اہلِ فن اور (ریختہ کا) خوشگوار دریا چڑھا کر خم ٹھونکنے والو،
اے رئیسانِ این سوادِ عظیم دی فراہم شدہ ز ہفت اقلیم	اس عظیم الشان شہر کے رئیسو، جو ساتوں ملکوں سے (تمام دنیا) آ کر یہاں جمع ہو گئے ہو۔
ہمچو من آرمیدۂ ایں شہر بہرِ کارے رسیدۂ ایں شہر	تم جو میری طرح اس شہر میں ٹھہرے ہو اور کسی نہ کسی کام سے یہاں آئے ہوئے ہو۔
اسداللہ بخت برگشتہ در خم و پیچ غیر سرگشتہ	اگرچہ بدنصیب اَسداللہ خاں (غالبؔ) جو عاجزی کی بھول بھلیّوں میں پھنسا ہوا ہے۔
گرچہ ناخواندہ میہمانِ شما ست بے سخن ریزہ چینِ خوانِ شماست	تمھارا بن بلایا مہمان ہے اور اس میں شک نہیں کہ تمھارے دسترخوان کے ٹکڑے کھا رہا ہے۔
بتظلم رسیدہ است اینجا بامید آرمیدہ است اینجا	یہاں وہ فریاد لے کر آیا ہے اور ایک اُمید سے پڑا ہوا ہے۔

آرمیدن دہید روزی چار
خستہ ای را بسایۂ دیوار

چند روز اس تھکے ہارے کو اپنی دیوار کے سائے میں آرام کر لینے دو۔

کارِ احباب ساختن رسم است
میہماں را نواختن رسم است

قاعدہ ہے کہ دوستوں کا کام بناتے ہیں اور مہمان پر عنایت کیا کرتے ہیں۔

آں رہ و رسم کار سازی کو
شیوۂ میہماں نوازی کو

تو وہ کام بنانے (مشکل میں ہاتھ بٹانے) کی رسم اب کہاں گئی؟ مہمان نوازی کا چلن کیا ہوگیا؟

کیستم دل شکستہ غمزدۂ
بیدلی خستۂ ستم زدۂ

میں کون ہوں ، ایک دل شکستہ اور غمزدہ آدمی ہوں۔ جو اداس ہے، دکھی ہے اور ستم کا مارا ہے۔

برق بے طاقتی بجاں زدۂ
آتشِ غم بخانماں زدۂ

جس کی روح کو بے بسی کی بجلی پھونک گئی اور جس کے گھر بار کو غم کی آگ نے جلا ڈالا۔

خس طوفانی محیطِ بلا
مصیبت کے طوفانی سمندر کا ایک تنکا

سَر بسر گردِ کاروانِ فنا
اور فنا کے قافلے کی گرد کا جھونکا

دردمندے جگر گداختۂ
ایک دردمند جس کا جگر پگھل چکا ہے اور

از غمِ دہر زہرہ باختۂ
زمانے کے غم نے حوصلہ پست کر دیا ہے۔

درِ آگاہی فنا زدۂ
ہمہ بر خویش پشت پا زدۂ

جو فنا (موت) کی آگاہی کا دروازہ کھٹکھٹا چکا اور خود اپنی ذات پر ٹھوکر مار چکا ہے۔

چہ بلاہا کشیدہ ام آخر
کہ بدیں جا رسیدہ ام آخر

(میں ایسا شخص ہوں) کیسی کیسی مصیبتیں جھیل کر بالآخر یہاں پہنچا ہوں

بسیہ روز غربتم بینید
میری مسافری کے دشوار دنوں اور

تیرہ شبہاے وحشتم بینید
وحشت کی سیاہ راتوں پر غور کرو

انڈہِ دوریِ وطن نگرید وطن سے دوری کا غم اور دوستوں
غمِ ہجرانِ انجمن نگرید سے جُدائی کا صدمہ۔اس پر نظر کرو
نہ ہمیں نالہ و فغاں بلبم صرف اتنا نہیں کہ لبوں پر فریاد آتی ہے
من و جاں آفریں کہ جاں بلبم بلکہ خدا گواہ، جان لبوں پر آئی ہوئی ہے
موبہ چوں موی کردہ است مرا فریاد نے مجھے (گھلاکر) بال کی طرح (دُبلا)
غصہ بدخوی کردہ است مرا کردیا اور رنج نے چڑچڑا بنادیا ہے۔

دیکھیے مصلحتوں کے پتھر سے غالبؔ کی انا اور ادب میں احساسِ برتری کا شیش محل کس طرح چکنا چور ہوا۔ غالب نے اس مثنوی میں اپنے فنِ شاعری کے بارے میں جو کچھ کہا، وہ اس ادبی معرکے میں اُن کے اعترافِ شکست کا آئینہ دار ہے۔ کہتے ہیں کہ مجھ میں شعروشاعری کا ذوق کہاں ہے اور مجھے قدرت نے شاعر ہی کب بنایا ہے۔ بس اتنا ہے کہ اپنی ہرزہ گوئی اور اپنی بے نوائی پر نوحہ پڑھ لیتا ہوں۔ اس کے بعد غالب اپنی خستہ حالی اور بے کسی کا پھر ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ میں خود اپنے زمانے کی گردش میں ہوں اور اپنے حالات پر مجھے حیرت ہے۔ میں مصیبت زدہ اور آپ مصیبت زدوں کا ساتھ دینے والے۔ کیسے افسوس کی بات ہے کہ آپ مجھ سے اتنے ناراض ہیں۔

غالبؔ اپنے نقطۂ نظر سے اس معرکے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ مہربانو! انصاف سے کہو کہ اس جھگڑے کی پہل کس کی طرف سے ہوئی۔ شراب کے سبُو میں کس نے نمک ڈالا اور چمن میں کس نے ہنگامہ برپا کیا۔ کس نے زلفِ گفتار کو پریشان کیا اور محفلِ شعر کو کس نے برہم کیا۔ پہلے کس نے کہا کہ 'ہمہ عالم' کی ترکیب غلط ہے۔ کس نے پہلے میرے شعر پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ 'بیش' نہیں 'بیشتر' ہونا چاہیے کس نے کہا کہ 'کمر پر بال' کہنا غلط ہے اور کس نے کہا کہ یہ شعر صریحاً غلط ہے۔ جب تمھیں معلوم ہوگیا کہ یہ اعتراض غلط ہے اور غالب نے جو کچھ کہا ہے، وہ صحیح ہے تو پھر باز پرس کا سلسلہ کس نے دراز کیا اور کس نے معترض کو جواب دیا؟ لازم تھا کہ اس اعتراض کو رَدّ کیا جاتا لیکن میں نے ہم نوائی کے لیے جس سے مدد مانگی، اس نے خاموشی اختیار کرلی۔ کیا وجہ ہے کہ اُس میدان (معرکے) میں آپ حضرات خاموش رہے اور آپ نے میدانِ آگہی میں قدم نہ رکھا۔ کیا وجہ ہے کہ میری تائید میں آپ لب کشا نہ ہوئے اور آپ نے مجھے بے یارومددگار چھوڑ دیا اپنی بے ہمتی سے تنگ آکر میں نے

یاوہ گوئی کے خلاف فریاد بلند کی۔ اپنے غم اور مصیبت سے تنگ آ کر میں نے ایک گروہ کی طرف رُخ کر کے مدد چاہی۔ میں نے گلہ مندانہ گفتگو کی اور گفتگو میں مبالغے سے کام لیا۔ جب میں نے سنا کہ نکتہ پروروں، قدردانوں اور محفل سجانے والوں کو میری گفتگو سے تکلیف پہنچی تو میں نے اُن کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

میں نے جو کچھ کیا تھا، اُس پر شرمندہ ہوا، مجھ پر جنوں کی کیفیت طاری ہوگئی اور میں خون کے آنسو رویا۔ میں نے جو کچھ عرض کیا، اُس کا کسی پر اثر نہیں ہوا اور میری نیاز مندی کو شرفِ قبولیت نہیں بخشا گیا۔ لوگوں نے مجھے ہی قصوروار ٹھہرایا۔ مجھ پر جو ملامتیں ہوئیں، اُن سے میں داغ داغ ہو گیا اور ندامت کی گرمی سے جل اُٹھا۔

ذوقِ شعر و سخن کجاست مرا	بھلا مجھے شعر و شاعری کا ذوق کہاں!
کی زبانِ سخن سراست مرا	اور شاعر کی زبان کب ملی ہے؟
دارم آری زِ ہرزہ لائی خویش	البتہ اتنا ہے کہ اپنی فضول گوئی سے اپنے اوپر
نوحہ بر خویش و بینوائی خویش	اور اپنی بے سروسامانی پر فریاد کر لیتا ہوں
گردشِ روزگار خویشتنم	میں خود اپنے زمانے کی گردش ہوں اور اپنے
حیرت کاروبار خویشتنم	معاملات (کے بگاڑ) پر حیرتی ہوں
بامن ایں خشم و کیں دریغ دریغ	کس قدر افسوس کی بات ہے کہ مجھ سے اتنا غصہ، اتنی عداوت؟
من چناں، تاں چناں دریغ دریغ	میں ایسا (ستم زدہ) اور آپ ویسے (کرم فرما)، افسوس!
بر غریباں کجا رواست ستم	بے وطن لوگوں پر ظلم کرنا کہاں جائز ہے،
رحم اگر نیست خود چراست ستم	رحم اگر نہیں کر سکتے تو ستم کیوں کرتے ہیں؟
در بگویند، ماجرائی رفت	اور اگر یہ کہیں کہ ایک بحث چھڑ گئی (ایک واقعہ ہو گیا)
از تو در گفتگو خطائی رفت	گفتگو میں تم سے غلطی سرزد ہو گئی۔
مہرباناں ، خدارا انصاف	مہربان لوگو، خدا کے لیے انصاف کرو،

تا نخست از کہ بود رسمِ خلاف
پہلے کس کی طرف سے جھگڑا اُٹھا؟

نمک اندر سبوئی می کہ فگند
شراب کے (خوشگوار مٹکے) میں نمک کس نے ڈالا اور

بچمن رستخیز دی کہ فگند
باغ میں خزاں کی آپا دھاپی کس نے شروع کی؟

زلف گفتار را کہ درہم کرد
گفتگو کی زلف کس نے پریشان کی اور

بزم اشعار را کہ برہم کرد
شعر کی محفل کو کس نے درہم برہم کیا؟

ہمہ عالم غلط کہ گفت نخست
یہ پہلے کس نے کہا کہ ''ہمہ عالم'' کی ترکیب غلط ہے،

پارۂ زیں نمط کہ گفت نخست
اس طرح کی بات کس نے پہلے چھیڑی؟

''بیش''، را ''بیشتر'' کہ گفت بمن
(میں نے 'بیش' لکھا تھا) کس نے کہا کہ بیش

بد زمن پیشتر کہ گفت بمن
نہیں بیشتر ہونا چاہیے، مجھ سے پہلے میری برائی کس نے کی؟

''موے را بر کمر'' کہ گفت غلط
کس نے یہ کہا کہ کمر پر بال کہنا بے جا ہے اور

شعر را سر بسر کہ گفت غلط
یہ شعر ہی اوّل سے آخر تک غلط ہے۔

چوں بدیدید کا عتراض خطاست
جب تم نے دیکھ لیا کہ اعتراض صحیح نہیں اور

ہرچہ غالبؔ نوشتہ است بجاست
غالبؔ نے جو کچھ لکھا تھا وہی درست ہے۔

رشتۂ باز پرس تاب کہ داد
تو پھر پوچھ گچھ کا سلسلہ کس نے بڑھایا؟ اور

مُعترض را زمن جواب کہ داد
کون تھا جس نے اعتراض کرنے والے کو جواب دیا؟

چوں بدیدید بے گناہیِ من
جب تم نے دیکھ لیا کہ میں بے قصور ہوں تو پھر

تاں نہ شُستید روسیاہیِ من
جو الزام مجھ پر لگایا گیا تھا اُسے تم نے دھویا کیوں نہیں؟

ہر کہ دیدم رہِ خموشی رفت
جسے بھی میں نے دیکھا اس نے چپ اختیار کی

بود لازم بر آں گرفت گرفت
حالاں کہ اس اعتراض کا رَد کرنا ضروری تھا

از چہ بود آں بعرصہ دم نزدن
(بحث کے) میدان میں (آپ لوگوں کا) دم

در رهِ آگهی قدم نزدن	نہ مارنا اور علم وخبر کی راہ میں قدم نہ رکھنا آخر اس کا سبب؟
نگشودن لبی بیاوریم	میری تائید میں لب نہ کھولنا اور انصاف طلبی
خیره بگذاشتن بیاوریم	میں مجھے بے سہارا چھوڑ دینا آخر کس وجہ سے؟
تا بشوریده دل ز بی جگری	تنگ آگیا تو بے ہمتی سے میں نے
بفغان آمدم ز خیره سری	اس بے ہودگی کے خلاف فریاد کی۔
از غمِ دل ستوه گردیدم	غم کے ہاتھوں سے عاجز آ کر ایک گروہ کی
چهره با یک گروه گردیدم	طرف میں نے منہ کیا (اور ان سے گویا توجہ چاہی)
گِله مندانه گفتگو کردم	شکایت کے لہجے میں بات کی اور (جب
پارهٔ در سخن غلو کردم	بات کی تو) کسی قدر مبالغہ کر دیا۔
چون شنیدم که نکته پردازان	جب میں نے سنا کہ نکتہ پرور
قدر دانان و انجمن سازان	قدردانوں اور محفل کا اہتمام کرنے والوں کو
از من آزرده اند زان پاسخ	میرے اس جواب سے رنج پہنچا ہے تو میں
بنیایش بخاک سودم رُخ	نے اُن کی تعریف میں سرِ تعظیم جھکا دیا۔
خجلت آوردم و جنون کردم	(اپنے کیے پر) شرمندگی ہوئی اور ہوش اُڑ
خویشتن آب و دیده خون کردم	گئے، خود شرمندہ ہوا اور خون کے آنسو رویا۔
آب گردیدم و چکیدم من	پانی ہو کر میں ٹپکا
قطره آسا بسر دویدم من	اور قطرے کی طرح سر کے بل چلا۔
نفس من بجمع در نگرفت	میرا کہنا سننا اس مجمع کی نظر میں کچھ نہ ٹھہرا اور
کس نیازم بهیچ بر نگرفت	کسی نے میری نیاز مندی کو مفت میں بھی قبول نہ کیا۔
روی دعوی بسویم آوردند	لوگوں نے مجھی پر الزام رکھا اور جو کچھ میں نے

سخنِ من بروئیم آوردند	عرض کیا تھا وہ میرے منہ پر مار دیا۔
داغ گشتم ازاں ملامتہا	میں ان ملامتوں سے تنگ آ گیا اور شرمندگی
سوختم از تفِ ، ندامتہا	کے بخار نے مجھے پھونک دیا۔
نہ امیدم ز شاعریست، نہ بیم	نہ مجھے شاعری سے کوئی اُمید، نہ خوف،
بود شائستہ سر مرا تسلیم	یہی مناسب تھا کہ میں سرِ تسلیم جھکا دوں۔
کاش با اعتراض ساختمی	اچھا ہوتا کہ میں اعتراض برداشت کر لیتا اور
نالہ در زیرِلب گداختمی	احتجاج کو لبوں سے باہر نہ جانے دیتا۔
زاں کہ آنہم رضائے یاراں بود	کیوں کہ بہر حال اس میں بھی دوستوں کی خوشی
رنگی از جوشِ ایں بہاراں بود	تھی وہ بھی اس جوشِ بہار کا ایک رنگ تھا۔
خار دامانِ دوستاں بودن	دوستوں کے دامن میں کانٹے کی طرح اُلجھ
خوشتر از باغ و بوستاں بودن	رہنا، باغ و بہار بن کر رہنے سے بہتر ہوتا ہے۔

اس کے بعد غالبؔ مثنوی میں کہتے ہیں۔ افسوس تو اس پر ہے کہ میرا شعر صاف ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ میں نے جو'زدہ' کا لفظ استعمال کیا ہے، اُس پر اعتراض کیا جائے۔ اس اعتراض نے مجھے اندر سے جلا کر رکھ دیا اور میری ہڈیوں کو سلگا دیا۔ غالب اپنی صفائی میں کہتے ہیں کہ میں نے جو لفظ ''زدہ'' استعمال کیا تھا۔ اُس میں ''ہ'' کسرۂ ظرافت نہیں ہے نہ اضافت کا زیر ہے بلکہ یائے وحدت کی جگہ ہے۔ میں اس طرز کا واضع یا موجد نہیں ہوں، اس لیے میری سرزنش نہ کی جانی چاہیے۔ ''زدہ'' کے ساتھ مرکب الفاظ لاکر دوسروں نے بھی لطف پیدا کیا ہے۔ میرے نزدیک ''مے زدہ'' اور ''غم زدہ'' قسم کی ترکیبوں میں اضافتوں کی تقلیب ہے، جس طرح شہد سے موم نکلتا ہے، اسی طرح کوشش سے 'زدۂ غم' کا مفہوم سمجھ میں آ جاتا ہے۔ بعض موقعوں پر ''زدہ'' کا مفہوم 'مارے ہوئے' ہوتا ہے لیکن ہر موقع پر نہیں ہوتا۔ اعتراض یہ تھا کہ غم زدہ اور مے زدہ مفعول ہے یہ لفظ خود فاعل کی شان ہے۔ یہ بات ٹھیک ہے، غلط نہیں۔ پھر غالب نے بیدلؔ کا یہ شعر حوالے کے طور پر پیش کیا ہے۔

'' عاشق ، بیدلے، جنوں زدہٗ ایک بے دل عاشق 'جنوں زدہ' (جنوں کا مارا) جس

قدح آرزو بہ خوں زدہٗ کی آرزو کا پیالہ ''خوں زدہٗ (خوں سے بھرا تھا)

غالبؔ نے بیدلؔ کی بہت تعریف کی ہے۔ انھیں 'محیطِ بے ساحل'، 'بحرِ ناپیدا کنار اور 'قلزمِ فیض' کہا ہے۔ اب یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

وائے باآنکہ شعرِ من صاف است '' زدہ'' رامی زند چہ انصاف است	افسوس حالانکہ میرا شعر صاف ہے (اس میں اعتراض کی گنجائش نہیں) پھر '' زدہ'' کے لفظ (مارے ہوئے) پر اعتراض کیا جائے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟
اعتراض آتشم بجاں زدہ است شعلہ در مغزِ استخواں زدہ است	اس اعتراض نے میری جان پھونک کر رکھ دی ہے اور ہڈیوں کو سلگا دیا ہے
'' زدہ'' را کسرہ از ظرافت نیست یائے وحدت بود، اضافت نیست	(میں نے جہاں زدہ لکھا تھا وہاں ''ہ'' کے نیچے) زدہ میں زیر ''کسرۂ ظرافت'' نہیں ہے (جیسا کہ معترض نے طنزاً کہا) نہ وہ اضافت کا زیر ہے بلکہ وحدت کی 'ی' کی جگہ ہے۔
واضع طرزِ ایں زمیں نہ منم در خورِ سرزنش ہمیں نہ منم	میں نے یہ طرز ایجاد نہیں کی ہے اس لیے الزام مجھ پر نہیں آتا۔
دیگراں نیز گفتہ اند چنیں گوہرِ راز سُفتہ اند چنیں	دوسروں نے بھی اسی طرح کہا ہے اور راز کے موتی اسی انداز میں پروئے ہیں۔
شورش آمادہ رفتہ اند ہمہ ہم بریں جادہ رفتہ اند ہمہ	شعر میں جوش و خروش پیدا کرنے والے سب اسی راستے پر چل کر گئے ہیں۔

در نورد گذارش زدہ ہا
کردہ انداز نشاط عربدہ ہا

''زدہ'' کے ساتھ مرکب الفاظ کو شعروں میں لاکر انھوں نے لطف پیدا کیا ہے۔

اکثر از عالم'' شباب زدہ''
'' می زدہ'' '' غمزدہ'' '' شراب زدہ''

بہت سی اس وضع کی ترکیبیں لائے ہیں۔ جیسے شباب زدہ، مے زدہ، غمزدہ، شراب زدہ

' می زدہ' ' غمزدہ' کہ ترکیب است
بقیاس فقیر تقلیب است

مے زدہ، غمزدہ قسم کی ترکیبیں فقیر کے نزدیک مقلوب اضافتیں ہیں (یعنی زدۂ مے، زدۂ غم)

چوں برآید زِ انگبیں مومش
''زدہ غم'' دمد زِ مفہومش

جس طرح شہد سے موم نکلتا ہے، اسی طرح غمزدہ ''زدہ غم'' کا مفہوم حاصل ہے (یعنی ذرا سی کاوش سے غمزدہ کا مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے)

لیک در بعض جا نہ در ہمہ اش
لفظ' مارے ہوئے' است ترجمہ اش

بعض موقعوں پر اس لفظ کا ترجمہ 'مارے ہوئے' ہوتا ہے لیکن ہر جگہ نہیں۔

دیں خود از شان فاعل است کہ ہست
حق بود نہ باطل است کہ ہست

(اعتراض یہ ہوا کہ غمزدہ و مے زدہ مفعول ہے) یہ (لفظ) خود فاعل کی شان ہے، کہ وہ ہے۔ یہ حق بات ہے باطل نہیں (یعنی جب ''غمزدہ ہست'' کہیں تو 'غمزدہ' فاعل کے مرتبے میں آگیا کہ ہست کا Subject ہے۔)

ہمچناں آں محیطِ بے ساحل
قلزمِ فیض ، میرزا بیدلؔ

اسی طرح اس بحرِ ناپیدا کنار یعنی میرزا (عبدالقادر) بیدلؔ نے جو فیض کا ایک سمندر تھا۔

از محبت حکایتی دارد
کہ بدیناں بدایتی دارد

عشق و محبت کا ایک قصہ لکھا ہے، اور اس کی ابتدائیوں کی ہے۔

اوّلش خود مضاف مقلوب است دو یمین تا کدام اسلوب است	اوّل جگہ (یعنی جنوں زدہ) مضاف مقلوب ہے لیکن دوسری جگہ (یعنی خون زدہ) کہاں تک درست اسلوب ہے۔
کردہ ام عرض ہم چناں ''زدہٗ'' طعنہ بر بحر بیکراں زدہٗ	اسی طرز سے میں ''زدہٗ'' کا لفظ لکھا اور بحرِ بے کراں (مرزا بیدلؔ) پر طعن کرتے ہوئے لکھا۔
مگر ایں شعر زاں نمط نہ بود ور بود شعر من غلط نہ بود	اب یا تو بیدلؔ کا شعر کہو کہ اس طرز پر نہیں اور اگر ہے تو پھر میرا شعر غلط نہیں ہوسکتا۔
گرچہ بیدلؔ زِ اہلِ ایران نیست لیک ہمچوں قتیلؔ ناداں نیست	اگر چہ مرزا بیدلؔ خود ایرانی نہیں ہے پھر بھی قتیلؔ (فرید آبادی) کی طرح ناداں بھی نہیں۔
صاحبِ جاہ و دستگاہی بود مرد را زین نمد کلاہی بود	وہ علم و فضل والا آدمی تھا اور یقیناً اس کی کلاہ (مرتبہ) اس نمدے (یعنی علم و فضل) کی بنی ہوئی تھی۔
نہ غلط گفتہ است ور خود گفت راست گویم در آشکار و نہفت	(''زدہٗ لفظ) اس نے کہا بھی تو کچھ غلط نہیں' (مناسب کہا) میں کھلے عام اور نجی طور پر یہ بات سچ کہتا ہوں۔
دعویِ بندہ بے سروبن نیست شعرِ بیدلؔ بجز تفنن نیست	بندے کا دعوا بے بنیاد نہیں ہے اور بیدلؔ کا (یہ) شعر تفریحِ طبع کے سوا کچھ نہیں۔

اپنی صفائی پیش کرنے کے بعد غالبؔ کو خیال آیا کہ انھیں اس معرکے کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ اُنھوں نے سوچا کہ میں نے وعدہ کیا تھا کہ خاموش رہوں گا۔ اپنا وعدہ بھول گیا اور عجز و انکساری کا طریقہ ترک کردیا۔ غالبؔ کہتے ہیں کہ میں تو سیدھا سادا آدمی ہوں۔ جاہلوں کی طرح غل غپاڑہ کرنا تو شرم کی بات ہے۔ میں ادبی معاملات کا فیصلہ کرنے والا کون اور میری کیا حیثیت کہ بزمِ شعر میں اپنا مقام بتاؤں میں تو سخنوروں کی خاکِ پا ہوں اور دوستوں کے مقابلے میں چھوٹا ہوں۔ مجھے اس پر فخر ہے کہ بزرگوں کا نیاز مند ہوں۔ غالبؔ

کہتے ہیں مجھے یہ خوف ہے کہ میں تو دہلی واپس چلا جاؤں گا لیکن برسوں تک لوگوں کی زبانوں پر یہ حکایت رہے گی کہ کلکتے میں ایک سفیہی، گستاخ اور بے شرم آیا تھا، کچھ دن یہاں رہا۔ بزرگوں سے لڑلڑا کر واپس چلا گیا۔ وہ شخص بے شرم، بدخو اور ہرزہ گو تھا۔ گستاخانہ گفتگو کرتا تھا اور خراباتی کی طرح بکواس کرتا تھا نہ اس کی کوئی دنیوی حیثیت نہ دینی۔ دہلی کی سرزمین کے لیے باعثِ ننگ تھا۔ غالب مزید کہتے ہیں کہ افسوس، میرے جانے کے بعد دہلی کی عزت و آبرو کا خون میری گردن پر ہوگا۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ جب تک کلکتے میں رہوں، دوستوں کے لیے باعثِ تکلیف رہوں اور اہلِ انجمن کے دل پر بوجھ بنا رہوں اور میرے چلے جانے سے لوگوں کا دل ٹھنڈا ہو جائے۔ اس طرح جانا تو میرے لیے باعثِ شرم ہوگا۔ غالب نے اپنی کیفیت کا ذکر ایک ایسے شکست خوردہ انسان کے دردمندانہ لہجے میں کیا ہے، جس کا قصور ناسازگاریِ حالات، بدبختی اور بدنصیبی کے سوا کچھ نہیں۔

کہتے ہیں کہ میں ایک محتاج اور خستہ حال انسان کی حیثیت سے اس دیار میں آیا تھا اور لعن و طعن اور ملامت لے کر جاؤں گا۔ آپ میں سے کوئی صاحب مجھے رخصت کرنے نہ آئیں تاکہ میرے شوق کو مژدۂ وفا نہ ملے۔ اب اس کے بعد میں شاعری کا دعویٰ نہیں کروں گا اور میری شمعِ انجمن سے دھواں نہیں نکلے گا۔ میں جرس کی طرح بے وجہ فریاد نہیں کروں گا۔ خود کو بے صدا کیے لیتا ہوں اور اب سانس بھی نہیں لوں گا۔ میرے بیان کے چہرے پر اب کوئی رنگ نہیں آئے گا اور میرے سانس سے اب کوئی آواز بلند نہیں ہوگی۔ اب غالب کے اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ، کہ دیگر ز جادہ برگشتم خیرہ بودم، سُفیہ تر گشتم	افسوس، میں پھر راستے سے ہٹ گیا، پہلے ہی غلطی پر تھا اب اور زیادہ نادانی کر بیٹھا۔
وعدۂ خامشی ز یادم رفت شیوۂ عجز از نہادم رفت	میں نے تو وعدہ کیا تھا کہ خاموش رہوں گا۔ اپنا وعدہ بھول گیا۔ عاجزی اور انکساری کا طور طریقہ طبیعت سے جاتا رہا۔
سادہ لوحم مرا چہ رنگ و چہ ریو آوخ، آوخ ز جاہلانہ غریو	میں سادہ لوح ہوں، مجھے چھل کپٹ سے کیا کام۔ جاہلوں کی طرح شور مچانا بڑے شرم کی بات ہے۔

من کہ و عزم داوری کردن
ساز بزم سخنوری کردن

میں کون کہ فیصلہ کرنے کا ارادہ کروں اور شاعری کی محفل میں اپنی جگہ بنائے رکھوں۔

خاک پاے سخن دانستم
دوستاں را، ز کہتر دانستم

میں تو شاعروں کے پاؤں کی دھول ہوں اور دوستوں کے سامنے چھوٹا ہوں۔

با بزرگاں، نیاز ہا دارم
ہم بدیں شیوہ، نازہا دارم

بزرگوں کے ساتھ نیاز مندی کے تعلقات ہیں اور اس طور پر بھی مجھے فخر ہے۔

بندہ ام بندہ مہرباناں را
رمز فہمان و نکتہ داناں را

میں تو مہربانوں، نکتہ شناسوں اور باریک بینوں کا خادم ہوں۔

نہ ز آویزش بیاں ترسم
من و ایمانِ من، کزاں ترسم

میں بیان کی بحث سے نہیں ڈرتا،
البتہ ایمان کی قسم
مجھے خوف ہے تو اس بات کا

کہ پس از من بسا لہاے دراز
بزباں ماند ایں حکایت باز

کہ میرے بعد سالہا سال تک زبانوں پر یہ کہانی رہ جائے گی۔

کہ یہاں ایک نادان، کم ظرف آدمی

کہ سفیہی رسیدہ بود اینجا
چند روز آرمیدہ بود اینجا

آیا تھا اور وہ یہاں
کچھ دن ٹھیرا رہا۔

با بزرگاں ستیزہ پیش گرفت
زحمتی داد و راہ خویش گرفت

اس نے بزرگوں سے نزاع مول لے لیا۔ ایک مصیبت کھڑی کی اور اپنا راستہ لیا۔

شوخ چشمی و زشت خوی بود بے حیائی و ہرزہ گوئی بود	وہ شخص بے حیا اور بدطینت تھا، بے شرم اور بکواسی تھا۔
ہم سفیہانہ گفتگوئی داشت ہم خراباتیانہ ہوئی داشت	چھچھوروں کی طرح کلام کرتا اور شرابیوں کی طرح ہُوحق مچاتا تھا۔
برگِ دنیا نہ ساز دینش بود ننگِ دہلی و سر زمینش بود	نہ دنیوی حیثیت رکھتا تھا نہ دین کا سامان، یہ شخص دہلی اور سرزمینِ دہلی کے لیے باعثِ شرم نکلا۔
آہ، ازاں دم کہ بعد رفتنِ من خونِ دہلی بود بگردنِ من	کیسے رنج کی بات ہے کہ میرے چلے جانے کے بعد دہلی کی (عزت و آبرو) کا خون میری گردن پر رہ جائے۔
تا بُوَم، رنجِ دوستاں باشم بر دلِ انجمن گراں باشم	جب تک رہوں دوستوں کو دکھ دیتا رہوں اور محفل کے دل کا بوجھ بنا رہوں۔
شاد گردند کزمیاں بروم آوخ، از من کہ من چناں بروم	اور چل دوں تو اُن کا جی ٹھنڈا ہو۔ میرا اس طرح جانا خود میرے لیے شرم ناک ہوگا۔
خستہ و مستمند بر گردم دژم آیم، نژند بر گردم	تھکا ہارا اور محتاج یہاں سے واپس جاؤں۔ بدبختی لے کر آؤں اور ملامت لے کر جاؤں۔
بہ وداعم، کس از شما نرسد شوق را مژدۂ وفا نرسد	آپ لوگوں میں سے کوئی مجھے رخصت کرنے نہ آئے اور میرے شوق (دوستی) کو وفا کی خوش خبری نہ پہنچے۔

زیں سپس نیست دعویِ سخنم
ندمد دودِ شمع ز انجمنم

اب اس کے بعد مجھے شاعری کا دعوا نہیں اور میری محفل میں شمع سے دھواں نہ نکلے گا۔(شمعِ محفل بجھ جائے گی)

نالہ بے صرفہ، چوں جرس نزنم
بی صدا گردم و نفس نزنم

میں جرس کی طرح خواہ مخواہ شور و فریاد نہ کروں گا۔آواز بند کیے دیتا ہوں اور دم سادھے لیتا ہوں۔

نہ شکنم بر رُخ بیاں رنگے
بر نخیزد ز سازم آہنگے

بَیان کے چہرے پر کوئی رنگ نہیں آنے دوں گا اور میرے ساز سے کوئی آواز بلند نہ ہوگی۔

دیکھیے اس شعر میں غالبؔ نے اپنی بے کسی، مجبوری اور پریشاں حالی کا کیسے دردناک انداز میں ذکر کیا ہے۔

کہتے ہیں کہ خدا گواہ ہے کہ مجھ میں ہنگامہ آرائیوں کی تاب نہیں ہے۔اے مہربانو! میرا دل پتھر تو نہیں ہے

تابِ ہنگامہ ام، خدارا نیست
مہرباناں دلست، خارا انیست

خدا گواہ کہ مجھے ہنگامہ پسندی کی تاب نہیں۔مہربان لوگو، آخر دل ہی تو ہے، پتھر تو نہیں ہے۔

غالبؔ کو یہ احساس تھا کہ وہ حالات کے شکنجے میں پھنس گئے ہیں۔اُن کی مجبوری پنشن کا مقدمہ ہے اور مخالف اسی کا فائدہ اُٹھا رہے ہیں ورنہ علم وفضل اور فنِ شاعری میں وہ کسی سے کم نہیں ہیں۔یہاں مثنوی کا صرف وہ حصہ پیش کیا گیا ہے، جو قتیلؔ سے متعلق ہے۔اپنے کرم فرما کے مشورے پر اُنھوں نے یہ مثنوی تو لکھنی شروع کر دی اور اس میں معذرت خواہی کا انداز بھی اختیار کیا لیکن مثنوی کے آخر میں ان کی اَنا، خودداری اور احساسِ برتری پھر جاگ اُٹھا۔ کہتے ہیں کہ میرے متعلق مشاعروں کی محفل میں لوگوں کی زبان پر چڑھ گیا ہے کہ قتیلؔ کے متعلق غالب کی رائے اچھی نہیں ہے اور وہ اس کے خوانِ نعمت کی مکھی نہیں بنتا۔یہ غالب کی اَنا ہی ہے جو اُن سے کہلواتی ہے کہ مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں کسی کے دسترخوان کا زلہ بردار بنوں۔میں خود "ہما" ہوں۔مکھی کیسے بن سکتا ہوں۔غالبؔ کہتے ہیں کہ میں نے قتیلؔ کی صحبت سے استفادہ نہیں کیا۔مجھے اس کی شہرت پر رشک بھی نہیں۔ ہم دونوں ہم فن ضرور ہیں لیکن نہ

ہم ایک دوسرے کے دوست ہیں اور نہ دشمن۔ پھر غالبؔ کو احساس ہوا کہ وہ جس مقصد یعنی معذرت کے لیے یہ مثنوی لکھ رہے ہیں، وہ فوت ہوا جارہا ہے، اس لیے غالبؔ گفتگو کا انداز بدل کر کہتے ہیں۔ حَاشَ لِلّٰہ میں کیوں بُرا بھلا کہنے لگا ہوں اور اپنی طرف سے کیوں ابتدا کرنے لگا ہوں۔ ہاں! اتنا ضرور کہوں گا کہ جن لوگوں کو فارسی پر قدرت حاصل ہے، اُن کی یہ رائے ہے کہ قتیلؔ اہلِ زبان نہیں تھا اور اصفہان کا رہنے والا نہیں تھا، اس لیے اُس کی فارسی دانی پر ہرگز اعتماد نہیں کیا جاسکتا اور وہ جو کچھ کہے اُسے سند نہیں مانا جاسکتا۔ فارسی تو اہلِ ایران کی زبان ہے، اُن کے لیے آسان اور ہمارے لیے مشکل ہے۔ یہ ڈھکی چھپی نہیں بلکہ کھلی بات ہے کہ دہلی اور لکھنؤ ایران کے شہر نہیں ہیں۔ ہم سب قتیلؔ کے پیچھے چل رہے ہیں اور ہم نے اس کو اپنا رہبر بنالیا ہے۔ اس کے بعد کئی اشعار میں غالبؔ نے بتایا ہے کہ وہ علی حزیں، جلال اسیر، طالب، عرفیؔ، نظیریؔ اور ظہوریؔ کے معنی، مضمون اور زبان کے دل سے اس لیے قائل ہیں کہ یہ سب اہلِ زبان ہیں۔ غالبؔ کہتے ہیں کہ میں ان سب اہلِ زبان کی شاعری کا عاشق و دل دادہ ہوں۔ ان سب کے سبو کی تلچھٹ نے مجھے مست کررکھا ہے۔ جس شخص نے ان سب کی شاعری کو حرزِ جاں بنایا ہو، وہ قتیلؔ کو کیسے نظر میں لاسکتا ہے۔ قتیلؔ کے بارے میں دل کی بھڑاس نکال کر غالبؔ معذرت پر اُتر آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سرمایے کے باوجود جو میرے پاس ہے اور جو گنجِ معانی میں اپنے آستین میں رکھتا ہوں۔ میں دوستوں پر دل و جان قربان کرتا ہوں اور اپنے شوق کو احباب کی مرضی پر صَرف کیے دیتا ہوں۔ میں صُلح صفائی پر آمادہ ہوں اور قتیلؔ کی تعریف کرتا ہوں تاکہ مجھ سے کسی کو شکایت باقی نہ رہے اور قتیلؔ کے ماننے والوں سے مجھے انعام ملے۔ دراصل اس منزل میں غالبؔ عجب پس و پیش میں ہیں۔ کبھی قتیلؔ کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ اہلِ زبان نہیں ہے۔ کبھی اس کی تعریف کرتے ہیں اور کبھی معذرت کا لہجہ اختیار کرلیتے ہیں۔ قتیلؔ کی زباں دانی سے انکار کے بعد پھر غالبؔ، قتیلؔ کی مدح سرائی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اگرچہ میں قتیلؔ کو ایرانی نہیں کہوں گا اور نہ ہی اُسے دوسرا سعدیؔ کہوں گا لیکن قتیلؔ مجھ سے تو ہزار درجے بہتر ہے۔ مجھ جیسے ہزاروں لوگوں سے ہزار درجے بہتر ہے۔ میں تو ایک مُشتِ خاک ہوں اور قتیلؔ بلند آسمان۔ مٹی آسمان پر کیسے کمند ڈال سکتی ہے۔ غالبؔ قتیلؔ کی مدح سرائی میں زمین آسمان ایک کردیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ قتیلؔ کی تعریف کرنا میرے بس سے باہر ہے۔ سورج ایک سوراخ میں نہیں آسکتا۔ قتیلؔ کا سازِ خوش بیانی۔۔ مرحبا! اور اس کی نکتہ دانی کی شہرت واہ واہ! اس کی نظم آبِ حیات ہے، جو روانی میں دریائے فرات ہے۔ اس کی نثر میں مور

کے پیروں کی طرح مختلف خوشنما رنگ ہیں، جس میں صراح وقاموس جیسی لغتوں کے منتخب الفاظ موجود ہیں۔

ملکِ سخن کے اس بادشاہ نے کیسے کیسے عجیب نکتے ایجاد کیے ہیں۔ ہندوستانیوں نے اس کے آگے سر جھکا لیا ہے۔ غالبؔ اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ میں ایک ناپختہ اور ہیچ مداں انساں ہوں۔ دوستوں کی خدمت میں معذرت نامہ پیش کر رہا ہوں۔ میری عذر خواہی اور بے گناہی پر، مجھے امید ہے کہ آپ کو رحم آئے گا۔ دوستی کے پیغام پر مشتمل یہ صلح نامہ ختم ہوا۔ والسلام و الاکرام۔

اب غالبؔ کے فارسی شعر ملاحظہ کیجیے۔

دیں کہ در پیشگاہِ بزم سخن بزبانہا فتادہ است زمن	اور یہ جو محفلِ مشاعرہ میں میرے متعلق زبانوں میں چڑھ گیا ہے کہ۔۔۔
کہ فلاں با قتیلؔ نیکو نیست مگسِ خوانِ نعمتِ او نیست	فلاں شخص (غالبؔ) قتیلؔ کے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتا اس کے خوانِ نعمت کی مکھی نہیں بنتا۔
زلّہ بردارِ کس چرا باشم من ہمایم مگس چرا باشم	تو مجھے کیا ضرورت کہ کسی کے بچے کھچے ٹکڑے اُٹھاؤں، میں خود ہما ہوں مجھے مکھی بننے کی کیا ضرورت!
خود کسے ناسزا چرا گوید ناسزا آنکہ، نا سزا گوید	کوئی کسی کو بُرا کیوں کہے، نالائق وہ ہے جو بے جابات زبان سے نکالتا ہو۔
فیضے از صحبت قتیلم نیست رشک بر شہرت قتیلم نیست	میں نے قتیلؔ کی صحبت سے فیض نہیں اُٹھایا اور نہ مجھے اس کی شہرت پر رشک آتا ہے۔
نہ ہوا خواہی نہ دشمنی درمیانست پائی ہمفنی	نہ اس سے میری کوئی دوستی، نہ دشمنی، دونوں میں صرف ہمفنی کا تعلق ہے (یعنی میں بھی شاعر وہ بھی شاعر)

حاشَ لِلّٰہ، کہ بد نمی گویم
وانہم از پیش خود نمی گویم

خدا نہ کرے، میں کیوں بُرا لفظ منہ سے نکالتا۔ وہ بھی اپنی طرف سے چھیڑخانی کرتے ہوئے۔۔ ہرگز نہیں۔

مگر آناں کہ پارسی دانند
ہم بریں عہد ورائے و پیمانند

البتہ وہ لوگ جو فارسی زبان سے واقف ہیں وہ یہی پختہ رائے رکھتے ہیں کہ

کہ ز اہل زباں نبود قتیل
ہرگز از اصفہاں نبود قتیل

قتیل اہلِ زبان نہیں تھا،
نہ اصفہان کا باشندہ تھا۔

لا جرم اعتماد را نسزد
گفتہ اش استناد را نسزد

لازمی بات ہے کہ اُس (کی فارسی زبان) پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا، اُس کا کہا ہوا سند نہیں ہوسکتا۔

کایں زبان خاص اہل ایران است
مشکل ماد سہلِ ایران است

کیوں کہ یہ (فارسی) خاص اہلِ ایران کی زبان ہے۔ ہمارے لیے مشکل اور اُن کے لیے آسان ہے۔

سخن است آشکار و پنہاں نیست
دہلی و لکھنؤ ز ایراں نیست

کھلی بات ہے کوئی راز نہیں کہ دہلی اور لکھنؤ
ایران کے شہر نہیں ہیں۔

دوستاں را اگر زمن گلہ است
کہ خرامت خلاف قافلہ است

اب اگر دوستوں کو مجھ سے یہ شکایت ہے کہ تمھاری چال اوروں سے الٹی ہے۔

می رویم از پے قتیل ہمہ
ساختہ مرد را دلیل ہمہ

ہم سب تو قتیل کے پیچھے چل رہے ہیں اور اُسے ہم نے اپنا رہنما بنالیا ہے۔

تو ازیں حلقہ، چوں بدر زدۂ
گام بر جادۂ دگر زدۂ

تم اس حلقے سے نکل گئے اور
دوسرے راستے پر چلنے لگے۔

اے تماشائیانِ ژرف نگاہ	اے گہری نظر رکھنے والو تماشائیو،
ہاں بگوئید حسبۃً لِلّٰہ	تم ہی خدا لگتی کہنا۔
کہ چساں از حزیںؔ بہ پیچم سر؟ آں بجادو دمی ، بہ دہر سمر	کہ میں علی حزیں کی مخالفت کیسے کروں؟ وہ جس کے کلام میں جادو ہے اور زمانے بھر میں شہرت رکھتا ہے۔
دل دہد ، کز اسیرؔ بر گردم زاں نو آئیں صفیر بر گردم	دل کب اس کی اجازت دیتا ہے کہ جلال آل اسیر سے پھر جاؤں، وہ جس کی آواز کا طرز نرالا ہے، اس کو نہ مانوں؟
دامن از کف کنم چگونہ رہا طالبؔ و عرفیؔ و نظیریؔ را	طالبؔ (آملی) عرفیؔ (شیرازی) اور نظیریؔ (نیشاپوری) کا دامن ہاتھ سے کیوں چھوڑ دوں۔
خاصہ روح و روانِ معنی را آں ظہوریؔ جہانِ معنی را	خاص کر معنی و مضمون کی زندہ روح ظہوریؔ کو کیسے ترک کروں (جس کے کلام میں) معانی کی ایک دنیا (آباد) ہے؟
آنکہ از سرفرازیِ قلمش آسماں ساست پرچمِ علمش	ظہوریؔ کے قلم کو وہ سربلندی حاصل ہے کہ اس کے علَم کا پھریرا آسمان تک پہنچتا ہے۔
طرز اندیشہ آفریدۂ اوست	فکر و تخیل کی طرز اس نے پیدا کی اور
در تنِ لفظ جان دمیدہ اوست	لفظ کے بدن میں اس نے جان ڈالی۔
پشتِ معنی قوی، ز پہلویش خامہ را فربہی ز بازویش	ظہوریؔ نے معنی و مضمون کی کمر مضبوط کر دی اور اس کے دست و بازو نے قلم کو طاقت ور کر دیا۔

طرزِ تحریر را نوی از وے
صفحہ ارتنگِ مانوی از وے

اُس کی بدولت طرزِ تحریر میں جدّت پیدا ہوئی اور صفحہ ایسا رنگارنگ ہوا جیسے مانی مصوّر کا البم۔

فتنۂ گفتگوے اینانم
مست لائی سبوے اینانم

میں ان شاعروں کا کلام کا شوریدہ سر ہوں، ان کی مٹکی کی تلچھٹ نے مجھے مست کر رکھا ہے

آں کہ طے کردہ ایں مواقف را
چہ شناسد قتیلؔ و واقفؔ را

جس آدمی نے یہ مقامات طے کیے ہوں وہ قتیلؔ اور واقفؔ (جیسے شاعروں) کو کیا خاطر میں لائے گا۔

لیک با آن ہمہ کہ ایں دارم
گنجِ معنی در آستیں دارم

لیکن باوجود اس سرمائے کے جو میرے پاس ہے اور معنی کا خزانہ میری آستین میں بھرا ہے۔

دل و جانم فدائے احباب است
شوق وقفِ رضائے احباب است

میں دل و جان دوستوں پر قربان کرتا ہوں اور اُن کی خوشی میں اپنی خوشی گم کیے دیتا ہوں۔

میشوم خوشی را بصلح دلیل
میسرایم نوائے مدح قتیل

صلح صفائی کی راہ خود کو دکھاتا ہوں اور قتیلؔ کے کلام کی تعریف پر آمادہ ہوں۔

تا نماند، زمن دگر گلۂ
رسد از پیروانِ وی صلۂ

تاکہ اس کے بعد مجھ سے شکایت نہ رہ جائے اور قتیلؔ کے ماننے والوں سے انعام ملے۔

گفتن آئینِ ہوشیاری نیست
لیک دانستن اختیاری نیست

بات کہہ بیٹھنا کوئی عقل مندی کا طریقہ نہیں۔ گو بات کا علم ہونا انسان کے اختیار سے باہر ہے۔

گرچہ ایانیش نخواہم گفت
سعدیِ ثانیش نخواہم گفت

اگرچہ میں قتیلؔ کو ایرانی نہیں کہہ سکتا اور نہ دوسرا سعدی مانوں گا۔

لیک از من ہزار بار بہ است از من و ہمچو من ہزار بہ است	لیکن مجھ سے تو ہزار درجہ بہتر ہے، مجھ سے اور مجھ جیسے ہزاروں سے بڑھ کر ہے۔
من کفِ خاک و او سپہر بلند خاک را کی رسد بہ چرخ کمند	میں ایک مٹھی بھر خاک، وہ بلند آسمان۔ مٹی کی کمند آسمان پر کیسے پہنچ سکتی ہے!
وصفِ او حدِّ چوں منے نبود مہر در خورد روزنے نبود	اس کی تعریف کرنا مجھ جیسے آدمی کے بس سے باہر ہے، سورج ایک سوراخ کی گرفت میں نہیں آسکتا۔
مرحبا ساز خوش بیانیِ او حبذا شور نکتہ دانیِ او	اس کی خوش بیانی کا ساز سبحان اللہ اور اس کی نکتہ دانی کی شہرت واہ وا۔
نظمش ، آبِ حیات را ماند در روانی، فرات را ماند	اُس کی نظم آبِ حیات کے مثل ہے اور روانی میں دریائے فرات کی مانند۔
نثر او نقش بال طاؤس است انتخابِ صراح و قاموس است	اور اس کی نثر مور کے پروں کی طرح رنگا رنگ جس میں صُراح اور قاموس (جیسے جامع لغتوں) کا انتخاب موجود ہے۔
پادشاہی کہ در قلمروِ حرف کردہ ایجاد نکتہ ہائے شگرف	یہ وہ بادشاہ ہے کہ جس نے ملک سخن میں عجیب عجیب نکتے ایجاد کیے۔
خامۂ ہندی پارسی دانش ہندیاں سر بخطِ فرمانش	اس کا قلم وہ فارسی داں ہندی ہے جس کے آگے ہندوستانیوں نے سر جھکا دیا ہے۔
این رقمہا کہ ریخت کلکِ خیال بود سطرے ز نامۂ اعمال	خیال کے قلم سے جو تحریر (کاغذ پر) بکھری، یہ میرے نامۂ اعمال کی ایک سطر تھی۔

از من نارسائے ہیچ مداں معذرت نامہ ایست زی یاراں	مجھ جیسے ناپختہ اور بے علم آدمی کی طرف سے یہ دوستوں کی خدمت میں معذرت نامہ ہے۔
بو کہ آید ز عذر خواہیِ ما رحم بر ما و بے گناہیِ ما	امید ہے کہ اب تو آپ کو ہماری عذرخواہی پر اور ہماری بے گناہی پر رحم آئے گا۔
آشتی نامۂ وِداد پیام	دوستی کا پیغام دینے والا یہ صلح نامہ تمام ہوا،
ختم شد والسلام وَ الاکرام	وَالسلام وَالاکرام!

اس مثنوی کے بارے میں چند اہم باتوں پر روشنی ڈالنی ضروری ہے۔ جیسا کہ بتایا جاچکا ہے کہ غالب نے اپنے مربی نواب سید علی اکبر خاں کے مشورے پر لکھی تھی۔ چوں کہ غالب مخالفوں سے صلح کرنا چاہتے تھے، اس لیے اُنھوں نے مثنوی کا نام 'آشتی نامہ' رکھا تھا۔ جب پندرہ بیس سال بعد غالب نے اپنا وہ فارسی دیوان مرتب کیا جو ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا تھا تو یہ مثنوی بھی اس دیوان میں شامل کی۔ اب چوں کہ نہ مرزا افضل بیگ حیات تھے نہ کلکتے کے مخالف باقی، اس لیے غالب نے مثنوی کا نام 'بادِ مخالف' رکھ دیا۔ اسی نام سے یہ مثنوی مشہور ہے۔

چودھری عبدالغفور سرور کے نام ایک خط مورخہ مارچ ۱۸۵۹ء میں 'حاشا و حاش للہ' کے مفہوم پر روشنی ڈالتے ہوئے غالب لکھتے ہیں:

''یہ مثنوی جس میں یہ مصرع ہے

حاش لِلہ کہ بدنمی گویم

کلکتے میں، میں نے لکھی ہے۔ پانچ ہزار آدمی فراہم تھے...... غرض اس تحریر سے یہ ہے کہ یہ مثنوی وہاں لکھی گئی اور ایک ایک نقل مولوی کرم حسین بلگرامی اور مولوی عبدالقادر رام پوری اور مولوی نعمت علی عظیم آبادی اور اُن کے امثال و نظائر کے پاس بھیجی گئی۔ اگر یہ لوگ جگہ پاتے (یعنی حاشَ لِلہ کے استعمال پر اعتراض ہوتا) تو میری کھال اُدھیڑ ڈالتے''[۳]

غالب نے اِس خط میں لکھا ہے کہ یہ مثنوی میں نے کلکتے میں لکھی۔ پانچ ہزار آدمی فراہم تھے۔ اگر غالب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اُنھوں نے یہ مثنوی ایک ایسے جلسے میں پڑھی تو یہ بیان درست نہیں ہے اور اگر اُن کا مطلب ہے کہ کلکتے کے پانچ ہزار اہلِ علم کے پاس یہ مثنوی بھیجی

تھی تو یہ بھی مبالغہ ہے۔

غالبؔ نے اس مثنوی کی ایک نقل جن مولوی عبدالقادر کو بھیجی تھی، ان کے بارے میں میرا خیال تھا کہ یہ وہی بزرگ ہیں جنھیں ہم مولوی عبدالقادر رام پوری کے نام سے جانتے ہیں۔ قاضی عبدالودود کا بھی یہی خیال تھا۔ اُنھوں نے ڈاکٹر مختار الدین احمد اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی رضا لائبریری میں محفوظ مولوی عبدالقادر رام پوری کے روزنامچہ کے قلمی نسخے میں اس واقعے کی چھان بین کرائی لیکن کہیں کوئی ذکر نہیں ملا۔[۴] مالک رام صاحب نے ماہانہ 'نگار' (رام پور۔ فروری ۱۹۶۳ء سے درج ذیل اقتباس نقل کرکے یہ گتھی سلجھائی۔

"اس مخالفت کا باعث مولوی عبدالقادر صاحب نام اور مفتی کبیر احمد صاحب نام دو بزرگِ کلکتے کے تھے اور یہ دونوں آدمی گورنمنٹ کالج میں معلم اور 'مشاہیر میں سے تھے۔' مفتی کبیر احمد سے مراد غالباً حافظ احمد کبیر ہیں۔ یہ رام پور کے رہنے والے اور اس زمانے میں مدرسۂ عالیہ کلکتہ میں مدرس تھے ممکن ہے کہ اُنھوں نے مناقشے میں حصّہ لیا ہو۔ مولوی عبدالقادر کے متعلق میں فی الحال تحقیق نہیں کر سکا۔ [۵]

غالبؔ کے مرّوجہ فارسی دیوان میں شامل مثنوی 'بادِ مخالف' میں ایک شعر ہے :

آں کہ طے کردہ ایں مواقف را
چہ شناسد قتیلؔ و واقفؔ را

(جس شخص نے (شاعری میں) یہ منزلیں طے کی ہوں وہ قتیلؔ اور واقف کو کیا گردانے گا۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ 'بادِ مخالف' کی اوّلین روایت میں یہ شعر نہیں ہے۔[۶]
اس کا مطلب ہے کہ غالب نے کلکتے سے آنے کے بعد مثنوی میں اس شعر کا اضافہ کیا۔ قاضی عبدالودود نے لکھا ہے کہ اس شعر کو دیکھ کو شاد عظیم آبادی نے لکھ دیا ہے کہ غالبؔ نے کلکتہ میں بداخلاقی کا کوئی جملہ ایسا نہ تھا جو ان باکمالوں (قتیلؔ و واقفؔ) وغیرہ کے حق میں اپنی زبان سے نہ نکالا ہو......وہاں...... اکثر قتیلؔ کے بالواسطہ و بلاواسطہ تلامذہ اور واقف کے معتقدین موجود تھے۔ ان کے خلاف شورش شروع ہوئی تو علی اکبر خاں کے پاس ہوگلی جاکر شکایت کی، وہ بولے کہ

"آپ کوضرورت ہی کیا تھی جو قتیؔل و واقفؔ کو سخت وسُست کلمات سے...... یاد کیا۔"

(حیات فریاد" ص ۹۱)"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا مطلقاً ثبوت موجود نہیں کہ غالبؔ نے کلکتہ میں قتیؔل کے ساتھ واقف کو بھی سخت وست کہا تھا۔ 'باد مخالف' کی اولیں روایت میں ان کا نام تک نہیں آیا اور وہ شعر جو مرّوجہ روایت میں ہے، یقین ہے کہ کلکتہ سے واپسی کے بعد بڑھایا گیا ہے۔"

سفیرِ ہرات

کلکتے میں غالبؔ کو درپیش آنے والے ادبی معرکے کے ایک اہم کردار سفیرِ ہرات ہیں۔ سفیرِ ہرات کے بارے میں اب تک ہماری معلومات بہت محدود تھیں۔ اُن کے بارے میں ہمیں غالب ہی کے حوالے سے اتنا معلوم تھا کہ جب کلکتے کے ایک مشاعرے میں مرزا افضل بیگ کے چڑھائے ہوئے کچھ نااہل اور کم رُتبہ لوگوں نے غالب کے دو شعروں پر اعتراض کیے تو اس موقع پر سفیرِ ہرات نے غالبؔ کی حمایت کی تھی۔

سفیرِ ہرات کے بارے میں غالبؔ کے بیانات اتنے متضاد ہیں کہ غالبؔ کے ایک محقق سید لطف الرحمٰن اس نتیجے پر پہنچنے پر مجبور ہوئے کہ شاید سفیرِ ہرات بھی عبدالصمد کی طرح غالب کے ذہن کی اختراع ہیں اور حقیقت میں ان کا کوئی خارجی وجود نہیں۔

غالبؔ نے اپنے کم سے کم چار خطوں میں کلکتے کے ادبی معرکے سے متعلق تین مشاعروں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے تین خط فارسی میں نواب محمد علی خاں کے نام اور ایک خط غالبؔ کے شاگرد مولوی عبدالرزاق شاکر کے نام اردو میں ہے۔

نواب محمد علی خاں کے نام اپنے خطوں میں غالبؔ نے کلکتے کے مشاعرے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''مولوی عبدالکریم کے ایک رشتہ دار نے مجھے ذلیل کرنے کے لیے ایک انجمن قائم کی اور مشاعرہ منعقد کیا۔ کلکتے کے شاعروں کو مدعو کیا اور مجھے بھی بلایا۔ ریختہ گو شاعروں کو ریختے کا مصرع طرح اور فارسی گو شاعروں کو فارسی کا مصرع طرح بھیجا۔ مجھے دونوں مصرعے دیے۔ چناں چہ گزشتہ ۸ر جون بروز اتوار مشاعرہ منعقد ہوا۔ میں بھی گیا اور میں نے دونوں زبانوں میں غزلیں پڑھیں۔ عوام و خواص نے (میری غزلیں) پسند کیں۔ کچھ منصف مزاجوں نے کہا کہ جس کے کلام میں ایسی فصاحت ہو، اس کے سامنے قتیلؔ کی کیا حیثیت ہے

بلکہ اگر ہم (غالبؔ کو) اسیرؔ و بیدلؔ کا ہم پلہ قرار دیں تو زیب دیتا ہے۔ خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مجھے رسوا و بے آبرو کرنے کے لیے جو ہنگامہ برپا کیا گیا تھا وہ میری شہرت اور اظہارِ کمال کا ذریعہ بن گیا۔'' [1] (فارسی سے ترجمہ)

نواب محمد علی خاں کے نام غالبؔ کے ایک اور خط میں منصف مزاجوں کے ایک گروہ کی جگہ سفیرِ ہرات نے لے لی۔ غالب لکھتے ہیں:

''اہم خبر یہ ہے اس شہر کے سخن فہموں اور نکتہ رسوں نے میرے اس شہر میں آنے کے بعد ایک بزمِ سخن ترتیب دی۔ ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو تمام شاعر اور سخن فہم سرکار کمپنی کے مدرسے میں جمع ہو کر غزلیں پڑھتے اور سنتے۔ اتفاقاً بادشاہِ ہرات کے سفیر، خدا اُسے ہر مصیبت سے محفوظ رکھے، اس محفل میں موجود تھے۔ اس نے اس عالی مقام (کلکتہ) کے فارسی گو شاعروں کا کلام سنا۔ میری اس نے بہت بلند آواز میں تعریف کی اور کہا کہ ہندوستان میں کون ہے جو اس کلام کی قدر کرے گا۔ یہ کلام تو ایسا ہے کہ ایران کے فصحا سنتے اور لطف اُٹھاتے۔ پھر اس نے لوگوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ دوستو! یہ شخص تم میں غنیمت ہے۔ قطع نظر شعر و شاعری کے فارسی کا عالم ہے۔ چوں کہ انسان فطرتاً خود پسند ہوتا ہے، انھیں حسد ہوا اور مشاعرے میں حاضر بزرگ اور گراں مایہ حضرات نے میرے دو اشعار پر اعتراضات کیے۔'' [2]

ایک اور خط میں غالبؔ نے تیسرے مشاعرے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''سفیرِ ہرات نے سب کا کلام سنا اور جب میری باری آئی تو...... کہنے لگے۔ تیرے (غالبؔ) کلام میں بہت زور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تو سب لوگوں پر غالب ہے اور اسمِ بامسمّٰی ہے۔ یہ کہہ کر اس نے اہلِ بزم کی طرف رُخ کیا اور کہا دوستو! تم لوگوں کے درمیان یہ نفس گداختہ اور خونیں نوا غنیمت ہے۔ اس شخص کی قدر کرو کہ شعر و شاعری سے قطع نظر یہ (شخص) فارسی زبان کا عالم (بھی) ہے)۔'' [3]

غالبؔ نے سفیرِ ہرات سے اپنے بارے میں جو توصیفی کلمات منسوب کیے ہیں۔ وہ تینوں خطوں میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اب اس طرح کے کچھ اور اختلافات ملاحظہ ہوں:

ان مشاعروں میں سفیرِ ہرات کی شرکت کے بارے میں غالبؔ کے دو خطوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے مشاعرے میں شریک تھے۔ جب کہ ایک اور خط سے واضح طور پر کہا گیا ہے کہ وہ تیسرے مشاعرے میں شریک تھے۔ البتہ غالب کے مختلف بیانات سے کہا گیا ہے کہ سفیرِ ہرات صرف ایک ہی مشاعرے میں شریک ہوئے تھے۔ اسی طرح غالبؔ نے اپنے ایک خط میں، جس کے مکتوب الیہ کا پتا نہیں چلتا، لکھا ہے:

> ''اُن دنوں میں خاصانِ عجم میں سے ایک مقتدر شخص، جو سفارت پر ایران سے آیا ہوا تھا، بانیانِ مشاعرہ کی دعوت پر اس محفل میں موجود تھا۔''[۴]

اس سے پہلے ایک اور خط میں غالبؔ نے لکھا ہے کہ سفیرِ ہرات اتفاقاً مشاعرے میں آ گئے تھے اور دوسرے خط میں اطلاع دی ہے کہ مشاعرے کے منتظمین نے انھیں مدعو کیا تھا۔

غالبؔ کے بیانات میں ایک اور تضاد ملاحظہ ہو۔

غالبؔ نے مولوی عبدالرزاق شاکرؔ کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

> ''قضا را اس زمانے میں شاہزادہ کامران درانی کا سفیر گورنمنٹ میں آیا تھا۔ کفایت خاں اس کا نام تھا اس تک یہ قصہ پہنچا۔ اس نے اساتذہ کے اشعار پانچ سات ایسے پڑھے، جن میں ''ہمہ عالم'' و ''ہمہ روز'' و ''ہمہ جا'' مرقوم تھا اور وہ اشعار 'قاطع برہان' میں مندرج ہیں۔'' (فارسی سے ترجمہ)[۴الف]

غالبؔ کے اس خط سے پتا چلتا ہے کہ سفیرِ ہرات اور بقول غالبؔ کفایت خاں کسی بھی مشاعرے میں موجود نہیں تھے۔ اس ادبی معرکے کی تفصیلات سفیر ہرات کو کسی اور نے کہیں سنائی تھیں۔ اس کا مطلب ہے کہ غالب نے اپنے فارسی خطوں میں جو سفیرِ ہرات کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ مشاعروں میں موجود تھے اور اپنے بارے میں جو تعریفی اور توصیفی کلمات اُن سے منسوب کیے ہیں، ان سب کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ (فارسی سے ترجمہ)[۶]

غالبؔ نے نواب محمد علی خاں کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

''چناں چہ چند اشعارِ اساتذہ جو میں نے (جن سے ''ہمہ'' اور'' عالم '' کی ترکیب کی نشان دہی ہوتی ہے) اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کیے تھے، جو آج بھی مجھے یاد ہیں۔اس کے بعد غالب نے حافظ، سعدی، جامی اور کسی ایک استاد کے چار اشعار پیش کیے ہیں۔ [۷]

غالبؔ نے کم سے کم دو خطوں میں لکھا ہے کہ اُنھوں نے سند کے طور پر اساتذہ کے چار اشعار پیش کیے۔

نواب محمد علی خاں کے نام غالبؔ نے ایک خط میں لکھا ہے:

''چناں چہ چند اشعار اساتذہ جو میں نے (جن سے 'ہمہ' اور 'عالم' کی ترکیب کی نشان دہی ہوتی ہے) اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کیے تھے، جو مجھے آج بھی یاد ہیں۔ [۷](الف)

لیکن مولوی عبدالرزاق شاکرؔ کے نام خط میں لکھتے ہیں:

''سفیرِ ہرات نے اساتذہ کے پانچ سات شعر پڑھے، جن میں 'ہمہ عالم' و 'ہمہ روز' و 'ہمہ جا' مرقوم تھا۔

غالبؔ کے قول کے مطابق اُنھوں نے ادبی معرکے میں جو پڑھے تھے، وہ تعداد میں چار تھے۔ 'قاطعِ برہان' میں 'ہمہ' کی بحث کے تحت تین اشعار نقل ہوئے ہیں۔ حافظ اور سعدی کے دو اشعار وہ ہیں، جن کا ذکر غالبؔ نے نواب محمد علی خاں کے خط میں کیا تھا اور نظیریؔ نیشاپوری کا یہ شعر ہے:

چوں سگاں ازاں بکویت ہمہ شب قلادہ خایم

کہ ہوائے سید دارم نہ خیالِ پاسبانی [۸]

غالبؔ نے 'قاطعِ برہان' میں سند کے طور پر یہ اشعار اپنی طرف سے پیش کیے ہیں، سفیرِ ہرات کا کہیں نام نہیں لیا۔ جب کہ عبدالرزاق شاکرؔ کے نام خط میں لکھا ہے کہ 'قاطعِ برہان' میں جو اشعار درج ہیں وہ وہی ہیں جو سفیرِ ہرات نے سند کے طور پر پیش کیے تھے۔ 'قاطعِ برہان' میں وہی اشعار درج ہیں، جن کے بارے میں غالب نے لکھا تھا کہ اُنھوں نے سند کے طور پر پیش

کیے تھے۔

مختصر یہ ہے کہ غالبؔ نے دو تین خطوں میں لکھا ہے کہ اُنھوں نے سند کے طور پر چار اشعار پیش کیے اور کم سے کم دو خطوں میں لکھا ہے کہ سند کے طور پر یہ اشعار غالبؔ نے جس طرح سفیرِ ہرات کی زبانی اپنی تعریف کرائی ہے اور سفیرِ ہرات کے بارے میں اُن کے بیانات میں جو اختلاف بلکہ تضاد ہے، اُس کی روشنی میں مختلف شبہات کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ غالبؔ کے اس قسم کے بیانات پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ عبدالصمد کی طرح سفیرِ ہرات بھی غالبؔ کے ذہن کی اختراع ہیں۔

غالبؔ نے سفیرِ ہرات سے اپنے بارے میں جو توصیفی اور تعریفی کلمات منسوب کیے ہیں اُن کے مطالعے سے سید لطیف الرحمٰن کا اس نتیجے پر پہنچنا غلط نہیں تھا۔ وہ غالبؔ کے بارے میں سفیرِ ہرات کے تاثرات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''غالبؔ نے اپنے اور دوسرے شعرائے ہند کے بارے میں کفایت خاں کے تاثرات کو جس مبالغہ آرائی کے ساتھ بیان کیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کفایت خانی تاثرات غالب صاحب کی ذہنی تخلیقات ہیں اور خود کفایت خاں عبدالصمد نمبر ۲ ہے۔ اس فقرے سے کہ ''یہ شخص پارسی زبان کا عالم ہے، تخلیق کا راز فارش ہو جاتا ہے۔''[۹]

مجھے سید لطیف الرحمٰن صاحب کے اس خیال سے بالکل اتفاق تھا۔

غالبؔ نے تین مشاعروں میں سے کم سے کم ایک مشاعرے میں سفیرِ ہرات کی موجودگی بتائی ہے جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ مولوی عبدالرزاق شاکر کے نام خط میں غالب لکھتے ہیں:

> ''قضارا اس زمانے میں شاہزادہ کامران درانی کا سفیر گورنمنٹ میں آیا تھا۔ کفایت خاں اس کا نام تھا۔ اس تک یہ قصہ پہنچا۔ اس نے اساتذہ کے اشعار پانچ سات ایسے پڑھے۔''[۱۰]

غالبؔ کے اس بیان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سفیرِ ہرات کسی بھی مشاعرے میں شریک نہیں ہوئے بلکہ کسی نے اُن کو یہ قصہ سنایا تھا۔

غالبؔ نے تینوں فارسی خطوط میں سفیرِ ہرات لکھا ہے۔ اس سلسلے کا پہلا اور آخری اردو خط

مولوی عبدالرزاق شاکر کے نام ہے۔ اس میں پہلی بار ان کا نام کفایت خاں بتایا ہے۔

میں نے سفیرِ ہرات کے بارے میں بہت تحقیق کی لیکن ان کے بارے میں کچھ بھی معلومات حاصل نہیں ہوئیں۔ میرا یہ شبہ یقین میں بدل گیا کہ سفیرِ ہرات بھی عبدالصمد کی طرح غالب کی تخلیق ہیں۔

میں سید اکبر علی ترمذی صاحب کا شکرگزار ہوں، جنھوں نے نیشنل آرکائیوز میں محفوظ دو دستاویزوں کے حوالے سے بتایا کہ سفیرِ ہرات کا پورا نام 'سید حسین علی خاں معروف بہ کفایت خاں' وکیلِ والیِ ہرات تھا اور وہ کلکتے میں گورنر جنرل کے ۱۶ر جولائی کے دربار میں موجود تھے۔ [11]

اس ادبی معرکے کے بارے میں غالبؔ کے فارسی اور اردو خطوط کا کئی کئی بار مطالعہ کرکے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ معمولی اور کم علم لوگوں کے ہاتھوں اردو اور فارسی کے اس عظیم شاعر کی جو رسوائی اور بے حرمتی ہوئی، اس کا چارہ غالب کے پاس اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ وہ کبھی منصف مزاج لوگوں کے حوالے سے اور کبھی سفیرِ ہرات کی زبانی اپنی تعریف اور توصیف کراتے۔

غالبؔ نے ادبی معرکے سے متعلق کسی ایک مشاعرے میں سفیرِ ہرات کی موجودگی کی تفصیل بیان کی ہے۔ ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ادبی معرکے کے پہلے مشاعرے میں سفیرِ ہرات شریک تھے اور کہیں پتا چلتا ہے کہ وہ تیسرے مشاعرے میں موجود تھے۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ اس معرکے کے اڑتیس سال بعد غالبؔ نے مولوی عبدالرزاق شاکر کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ سفیرِ ہرات مشاعرے میں شریک نہیں تھے بلکہ کسی نے انھیں اس معرکے کی تفصیل بیان کی تھی۔ سفیرِ ہرات نے سند کے طور پر پانچ سات اشعار پڑھے جو بقول غالب 'قاطعِ برہان' میں مندرج ہیں۔

سفیرِ ہرات کے بارے میں غالبؔ کے مختلف بیانات پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ سفیرِ ہرات کا پورا نام سید حسین علی خاں معروف بہ کفایت خاں تھا۔ یہ اس دربار میں موجود تھے، جس میں غالب شریک ہوئے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ غالبؔ کی اُن سے دعا سلام بھی ہوئی ہو لیکن ان ادبی معرکوں کے کسی بھی مشاعرے میں وہ شریک نہیں تھے۔ اس لیے غالبؔ کی تعریف و توصیف میں جو کلمات اُن سے منسوب کیے ہیں وہ خود غالبؔ کے ذہن کی اختراع ہیں۔

سفرِ کلکتہ میں غالبؔ کی صحت

غالبؔ جب دہلی سے روانہ ہوئے ہیں تو اُن کے سر میں شدید درد تھا اور جسمانی طور پر وہ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ کان پور پہنچتے ہی غالب بیمار پڑ گئے۔ وہاں کوئی معقول معالج نہیں ملا تو غالب پینس کرائے پر لے کر لکھنؤ پہنچ گئے۔ وہاں کیسے ممکن ہے کہ ایک سے ایک اچھا حکیم نہ ہو لیکن غالب کی بدنصیبی کہ وہ ایسے بیمار پڑے کہ ہلنے جلنے کی بھی طاقت نہیں رہی اور اچھے اچھے حکیم بھی ناکام ہو گئے۔ اس کے بارے میں خود غالب کا بیان ہے۔ 'یہاں لکھنؤ میں پانچ مہینے سے کچھ دن اوپر، بستر پر پڑا رہا۔'[1] میرا خیال ہے کہ جب تک غالبؔ لکھنؤ میں رہے، بیمار ہی رہے۔ لکھنؤ سے کان پور ہوتے ہوئے وہ بیماری ہی کی حالت میں باندے پہنچے۔ یہاں نواب ذوالفقار علی خاں نے اُن کا علاج کرایا۔

اس زمانے میں غالبؔ نے باندے میں جو اشعار کہے تھے۔ ان کا تجزیہ کر کے صالحہ بیگم قریشی اس نتیجے پر پہنچی ہیں کہ غالب کو 'بوالدم' کا مرض تھا۔ بقول صالحہ یہ ایک ایسا مرض ہے کہ جس میں پیشاب کے ساتھ خون قطرہ قطرہ کر کے آتا ہے اور جب یہ قطرۂ خون آتا ہے تو بے حد سوزش اور جلن کا احساس ہوتا ہے، جس سے تکلیف بڑھتی ہے۔'[2]

غالبؔ باندے سے روانہ ہوئے تو صحت مند تھے۔ اُنھوں نے چلّہ تارا سے کشتی کے ذریعے الہ آباد کے لیے روانگی کے دوران محمد علی خاں کو خط میں لکھا:

> "خدا کا شکر ہے کہ بخار اور سر درد کے اثرات باندہ ہی سے رفع ہو گئے تھے (البتہ) کمزوری باقی ہے۔ (جس کی) فکر نہیں کہ یہی تو مجھ خستہ حال کا وہ رفیق ہے جو میری رفاقت پر وطن سے یہاں تک کمر بستہ ہے۔"[3]

غالبؔ جب کلکتے پہنچے تو انھیں اس شہر کی آب و ہوا راس آ گئی۔ کلکتے کی شدید گرمیوں میں، وہ شکر اور مصری کے ساتھ ناریل کا تازہ پانی پیتے رہے، جس سے اُن کو بہت فائدہ ہوا۔ برسات آنے پر اُنھوں نے ناریل کا پانی پینا بند کر دیا۔ غالب نے ناریل کے پانی کا ذکر کرتے ہوئے نواب محمد علی خاں کو ایک خط میں لکھا ہے، 'خدا کی رحمت کے حیرت انگیز آثار میں سے ایک یہ ہے کہ میں کلکتے کی آب و ہوا کا احسان مند ہوں جو مجھے خوب راس آ گئی ہے...... مختصر یہ کہ مجھے جسمانی امراض کی کوئی شکایت نہیں بلکہ کلکتے سے دہلی کے لیے روانہ ہونے سے چند روز پہلے

غالبؔ کو نزلہ زکام ہوگیا۔ اُنھوں نے ۷/اگست ۱۸۲۹ء کے ایک فارسی خط میں مرزا احمد بیگ طپاں کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

''آپ نے وعدہ فرمایا تھا کہ تم جب کبھی نزلہ اور زکام میں مبتلا ہو تو بر شعشا کہ جو برش کے نام سے معروف ہے (اُس کی) چاشنی میں تمھارا حصّہ بھی ہوگا۔ سو نزلہ اور زکام بھی ہوگیا اب کم سے کم ایک تولہ اس مرکب میں سے عنایت فرمائیے تاکہ دو تین روز میں اس کا استعمال شروع کردوں۔''[۴]

غالبؔ نواب محمد علی خاں کے نام ایک اور خط میں لکھتے ہیں کہ:

'کلکتے کی آب و ہوا بھی مجھے اپنے وطن کی آب و ہوا کے مقابلے میں زیادہ راس آئی ہے۔'[۵]

غالبؔ کلکتے میں تقریباً ایک سال چھ مہینے رہے۔ اس دوران اُنھوں نے نواب محمد علی خاں، مرزا احمد بیگ طپاں اور بعض دوسرے حضرات کو جو خطوط لکھے۔ اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالبؔ کو کلکتے کی آب و ہوا ایسی راس آئی کہ اس طویل عرصے میں انھیں کوئی بڑی بیماری نہیں ہوئی۔ غالبؔ نے نواب محمد علی خاں کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

''رحمتِ الٰہی کے حیران کُن آثار میں سے (یہ) ہے کہ کلکتے کی آب و ہوا مجھے راس آگئی ہے۔ اس جگہ میں اپنے وطن کے مقابلے میں زیادہ آرام سے ہوں:

ہر پردۂ زندگی[۶] نوائے دارد
ہر گوشہ از دہر قضائے دارد
برچید یبوست از دماغم یکسر
بنگالہ شگرف آب و ہوائے دارد

(زندگی کے ہر پردے میں ایک آہنگ ہوتا ہے۔ زمانے میں ہر گوشے میں ایک فضا ہوتی ہے۔)

میرے دماغ کی ساری یبوست (خشکی) چُن کر نکال دی۔ بنگالہ کی عجیب آب و ہوا ہے)۔[۷]

سفرِ کلکتہ میں غالبؔ کی مالی حالت

غالبؔ ابھی آگرے سے دہلی منتقل نہیں ہوئے تھے کہ اُن کی مالی حالت خراب ہوگئی اور اُن پر اتنا قرض ہوگیا کہ دہلی آکر بقول اُن کے:

> "بالآخر ضرورت سے مجبور ہوکر میں دہلی گیا جو آباؤاجداد کا اصل زاد بوم ہے۔ یہاں میں نے اپنے نانا اور والد کے تمام اثاثے جو میرے پاس بچ رہے تھے بیچ ڈالے اور قرض خواہوں سے قرض چکانے کے لیے رابطہ قائم کیا اور اس آمدنی سے قرض چکانے کے باوجود اس وقت بھی میں بیس ہزار روپے کا مقروض ہوں۔"[1]

یہ اقتباس غالبؔ کی اس عرض داشت کا جو اُنھوں نے ۲۸ راپریل ۱۸۲۸ء کو کلکتے میں حکومت کو پیش کیا تھا، جس کا مطلب ہے کہ ۱۸۲۸ء میں جب غالبؔ کلکتے میں تھے تو بقول اُن کے بیس ہزار روپے کے مقروض تھے۔ اگر اپنے مقدمے کو مضبوط کرنے کے لیے غالبؔ نے مبالغے سے کام لیا ہے تب بھی غالبؔ کے حالات دیکھتے ہوئے یہ رقم آٹھ دس ہزار سے کم نہ ہوگی۔ غالبؔ نے دہلی سے تین دفعہ فیروز پور، فیروز پور سے کان پور، کان پور سے لکھنؤ اور لکھنؤ سے کان پور اور پھر وہاں سے باندے کا سفر کیا۔ اس دوران تقریباً پانچ مہینے لکھنؤ میں ایسے بیمار رہے کہ بیماری کے شروع میں وہ صاحب فراش اور اُٹھنے بیٹھنے کی بھی سکت نہیں رہی۔ غالبؔ نے اس سفر کا خرچ کیسے برداشت کیا اور لکھنؤ میں علاج کے لیے رقم کہاں سے آئی، اس کا ہمیں قطعی علم نہیں۔

قیاس ہی سے کہا جاسکتا ہے کہ دہلی سے لکھنؤ تک سفر کے اخراجات غالبؔ دہلی سے لے کر چلے تھے، جو ظاہر ہے کہ قرض لیے ہوں گے اور لکھنؤ میں اُن کے علاج کے اخراجات اُن کے لکھنؤ کے نئے دوستوں نے برداشت کیے ہوں گے۔ اس کا امکان کم ہے کہ اُن کے پاس لکھنؤ سے کان پور اور کان پور سے باندے کے سفر کے اخراجات بھی لکھنؤ کے ان ہی نئے دوستوں نے دیے ہوں۔ باندے پہنچ کر اخراجات کی طرف سے غالبؔ خاصے مطمئن ہوگئے۔ کیوں کہ غالبؔ کی حقیقی خالہ کے بیٹے باندے کے حکمران تھے۔ نواب ذوالفقار علی بہادر بھی باندے میں موجود تھے پھر باندے کے صدر امین محمد علی خاں سے غالبؔ کے ایسے تعلقات ہوگئے تھے کہ نواب صاحب غالبؔ کے مربی بن گئے اور کلکتے تک میں اُنھوں نے غالبؔ کی مالی مدد کی۔ دو دفعہ دو دو سو روپے بھیجے۔ اس لیے یہ سوچنا غلط نہ ہوگا کہ ان تینوں حضرات نے غالبؔ

کی دیکھ بھال میں کوئی کسر چھوڑی ہوگی۔

غالبؔ نے ایک خط میں لکھا ہے کہ 'نواب ذوالفقار علی خاں نے چھ مہینے تک میرا علاج کرایا، جب غالبؔ صحت یاب ہو گئے اور کلکتے کے سفر کے لیے تیار ہوئے تو زادِ سفر کا مسئلہ تھا۔ اتنے طویل سفر کے لیے خاصی بڑی رقم درکار تھی۔ غالبؔ نے نواب ذوالفقار علی خاں سے دو ہزار روپے قرض مانگے۔ نواب صاحب نے ایک مہاجن امی کرن سے دو ہزار روپے قرض دلوا دیے۔ غالبؔ نے کلکتے سے نواب محمد علی خاں کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ

''میں نے نواب صاحب ذوالفقار علی خاں سے دو ہزار روپے قرض مانگے، اُنھوں نے دے دیے۔''[۲]

دو تین خطوں میں غالبؔ نے لکھا ہے کہ 'نواب صاحب نے امی کرن نامی ایک مہاجن سے دو ہزار روپے قرض دلوائے۔ یہ مشکل نظر آتا ہے کہ مہاجن ایک مسافر کو اتنی بڑی رقم قرض دے دے۔ اگر نواب صاحب کے دباؤ اور اُن کی ضمانت پر یہ رقم دے دی ہو تو بات اور ہے ورنہ میرا خیال ہے کہ نواب صاحب نے یہ رقم اپنی جیب سے دی تھی اور واپسی کو یقینی کرنے کے لیے یہ رقم مہاجن کے ہاتھ سے دلوائی۔

بہر حال غالبؔ نے اس رقم سے کلکتے کے سفر کی تیاری کی۔ ایک گھوڑا خریدا اور دو تین آدمیوں کے ساتھ کلکتے کے لیے روانہ ہو گئے۔ غالب جب کلکتے پہنچے ہیں تو اُن کے پاس چھ سو روپے باقی تھے گویا باندے سے کلکتے تک کے سفر پر ان کے چودہ سو روپے خرچ ہوئے۔ نواب محمد علی خاں کے نام اسی خط میں جس کا اقتباس پہلے بھی پیش کیا جا چکا ہے۔ غالب لکھتے ہیں:

''شعبان اور رمضان اور شوال اور ذی قعدہ گزر چکے ہیں۔ یہ ذی الحجہ کا مہینہ ہے۔ اگر کوئی ناگہانی مصیبت نہ آ گئی تو اگلے دو مہینے تک خرچ کی طرف سے بے نیاز ہوں۔''[۳] (فارسی سے ترجمہ)

غالبؔ نے کلکتے سے نواب ذوالفقار علی، باندے کے اپنے ایک نئے دوست میر کرم علی اور دوسرے لوگوں کو مسلسل پانچ خطوط لکھے مگر کسی نے جواب تک نہیں دیا۔ نواب محمد علی خاں کے نام اقتباسات اوپر نقل کیے جا چکے ہیں۔ اس خط میں غالب نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''میں نواب (ذوالفقار علی خاں) سے پھر مدد کی درخواست کروں گا اور ایک ہزار روپے مزید قرض مانگوں گا۔ آپ ایک کام کریں۔ میر کرم علی سے اکیلے میں بات

کر کے ٹٹولیں کہ اُن کے دل میں کیا ہے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ نواب صاحب اور اُن کے مقرّبین میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ میں نے نواب صاحب اور اُن کے مقرّبین کو بھی اس مقدمے کی تمام تفصیلات بتادی تھیں۔ میں نے ہر خط میں انھیں لکھا ہے کہ پرچم عالی جناب! پہاڑ کے مقابلے پر ایک تنکا آگیا ہے۔ اگر آپ میری اعانت فرماتے رہیں گے تو آپ کی پشت پناہی اور دشمن کو برباد کردینے والی آپ کی دست گیری کے زور پر میں نواب احمد بخش خاں اور اُن کے بہی خواہوں کو مزہ چکھادوں گا مگر اُنھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میری درخواست پر کوئی مثبت یا منفی جواب نہیں ملا۔ میں دوستوں کی دوستی سے نکل کر دشمنوں کی دشمنی میں گرفتار ہوگیا ہوں۔''[۳۴] (فارسی سے ترجمہ)

خط کی عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالبؔ نواب ذوالفقار علی خاں سے مزید قرض مانگ رہے تھے۔ نواب صاحب نے مزید قرض دینا تو کجا کسی خط کا جواب تک نہیں دیا۔

غالبؔ جب نواب صاحب سے ناامید ہوگئے تو اُنھوں نے نواب محمد علی خاں سے قرض مانگا۔ ان دنوں نواب صاحب کا معاملہ یہ تھا کہ انھیں ایک ٹھیکے میں نقصان ہوگیا تھا، جس کی وجہ سے وہ بہت پریشان تھے پھر بھی اُنھوں نے غالب کو دوسو روپے بھیج دیے، جس سے غالبؔ کو تھوڑا بہت سہارا ہوگیا۔ سات آٹھ مہینے بعد نواب محمد علی خاں نے دوسو روپے کی ایک شاہ جوگ ہنڈوی بھیجی۔ کلکتے میں غالبؔ کے پاس ایک گھوڑا تھا۔ یہ وہی گھوڑا تھا جو باندے سے کلکتے تک کے سفر کے لیے غالب نے باندے میں خریدا تھا۔

جب تک غالبؔ اس کشمکش میں رہے کہ انھیں دہلی کے لیے سفر کرنا ہے یا ابھی کلکتے ہی میں قیام کرنا ہے۔ اُنھوں نے گھوڑا اپنے پاس ہی رکھا لیکن جب غالبؔ نے فیصلہ کرلیا کہ ابھی بہت دن تک انھیں اسی شہر میں رہنا ہے اس کے لیے وقت اور روپے دونوں کی ضرورت ہے۔ چوں کہ اُن کی مالی حالت خاصی خراب تھی، اس لیے اُن کے لیے گھوڑے کی دیکھ بھال ممکن نہیں ہوگی۔ غالب نے ڈیڑھ سو روپے میں گھوڑا فروخت کردیا اور سائیس کو برطرف کردیا۔ گھوڑے کی فروخت کے بعد پچاس روپے تو فوراً خرچ ہوگئے اور غالبؔ کے پاس سو روپے رہ گئے اور غالبؔ کو روپوں کی طرف سے تھوڑا بہت اطمینان ہوگیا۔ اُنھوں نے نواب محمد علی خاں کو لکھا کہ گھوڑا فروخت کرنے کے بعد میرے پاس سو روپے باقی تھے۔ جاڑے آرہے تھے۔ میں نے سوچا کہ اگر کچھ بھی نہ خریدوں گا تب بھی ایک گدڑی ایک توشک اور ایک کمبل تو خریدنا ہی ہوگا۔ اس رقم سے یہ سامان خریدلوں گا اور آپ نے مولوی ولایت حسن

کی معرفت جو دو سو روپے ارسال فرمائے ہیں، اُن سے جمادی الاول سے رمضان کی پہلی تک کا (یعنی پانچ مہینے کا) خرچ نکل آئے گا۔''[5]

جون ۱۸۲۹ء میں غالبؔ نے نواب محمد علی خاں کے نام خط میں لکھا ہے کہ انھیں چار سو پچھتّر روپے کی ہنڈی اکبرآباد سے موصول ہوئی ہے۔ غالب نے یہ نہیں بتایا کہ اس ہنڈی کا بھیجنے والا کون تھا۔ ممکن ہے کہ یہ ہنڈی اُن کی والدہ نے بھیجی ہو۔

کلکتے سے دہلی واپس آنے کے لیے غالبؔ کو خاصی بڑی رقم درکار تھی۔ جب غالبؔ نے باندے سے کلکتے کا سفر کیا تھا تو اُن کے تقریباً چودہ سو روپے خرچ ہوئے تھے۔ وہ بھی اس حالت میں جب کہ اُنھوں نے گھوڑے پر سفر کیا تھا۔ اب وہ گھوڑا بھی فروخت کر چکے تھے اور انھیں کشتی کے ذریعے سفر کرنا تھا تو ظاہر ہے اب سفر پہلے سے زیادہ مہنگا تھا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق غالب کو دہلی پہنچنے کے لیے ڈیڑھ پونے دو ہزار روپوں کی ضرورت تھی۔ کلکتے میں رہ کر اس رقم کا حاصل کرنا بہت مشکل تھا پھر بھی غالب نے ایک راستہ ڈھونڈ نکالا۔

غالبؔ مہاجنوں سے قرض لینے میں ماہر تھے۔ دہلی اور پھر باندے کے مہاجنوں سے تو رقم قرض لی تھی۔ اُنھوں نے کلکتے میں بھی یہ سلسلہ جاری رکھا۔ اُنھوں نے کلکتے کے دورانِ قیام مرزا احمد بیگ طپاںؔ کو ایک فارسی خط میں لکھا تھا:

> ''میرے دل میں ایک لطیف بات آئی ہے۔ چاہتا تھا کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کے ساتھ راؤ شیورام والا صفات کے دولت کدے پر حاضر ہوں لیکن فکر نے شوق کی باگ پکڑ لی۔ (خیال یہ آیا) کہ اُن دو جگہوں پر جیسی خلوت کہ چاہیے نہیں مل سکے گی۔ چناں چہ عرض یہ ہے کہ اس رقعے کو راؤ صاحب کی خدمت میں پہنچا کر اور میری درخواست سے اُن کو مطلع کر کے سرِ شام یا ابتدائے شب جب آپ چاہیں راؤ صاحب کے ہمراہ میرے غریب خانے پر آنے کی زحمت گوارا کریں۔ اس ضمن میں کسی قسم کی غفلت درمیان نہیں آنی چاہیے۔''[6] (فارسی سے ترجمہ)

اس خط میں تاریخِ تحریر درج نہیں ہے۔ صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ قیامِ کلکتہ کے دوران لکھا گیا ہے اور غالباً اُن دنوں میں جب کہ غالب دہلی کے سفر کی تیاری کر رہے تھے۔ اس خط کے متن اور غالبؔ کے لب و لہجے سے اندازہ ہوتا ہے کہ راؤ شیورام کلکتے کے کوئی بڑے مہاجن تھے اور غالب اُن سے سفرِ دہلی کے لیے قرض لینا چاہتے تھے۔ چوں کہ غالبؔ قرض حاصل کرنے کے فن میں ماہر تھے، اس لیے امکان ہے کہ انھیں کچھ نہ کچھ رقم مل گئی ہوگی۔

سفرِ کلکتہ کے دوران غالبؔ کی تخلیقی سرگرمیاں

سفرِ کلکتہ کے دوران اگرچہ غالبؔ 'رہینِ ستم ہائے روزگار' رہے، طرح طرح کے ذہنی کرب اور جسمانی دشواریوں سے گزرتے رہے، پھر بھی اُن کی تخلیقی سرگرمیاں جاری رہیں۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعرگوئی کا سلسلہ جاری رہا۔

ایک دل چسپ حقیقت ہے کہ غالبؔ نے سفرِ کلکتہ کے آغاز سے پہلے اردو میں زیادہ شعر کہے، فارسی کی طرف اُن کی توجہ بہت کم بلکہ نہیں کے برابر رہی۔ کلکتے کے سفر اور قیامِ کلکتہ کے دوران اُنھوں نے اردو میں شعر کہے مگر بہت کم۔ جب کہ اردو کے مقابلے میں فارسی میں بہت زیادہ شعر کہے۔

فارسی کلام

غالبؔ نے اپنی اردو اور فارسی تحریروں میں کئی مقامات پر بتایا ہے کہ اُنھوں نے کس عمر میں شعر کہنا شروع کیا تھا۔

سلطان محمد میسوری کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ دس سال کی عمر میں مجھ میں موزونیِ طبع کے آثار پیدا ہوگئے تھے۔ (کلیاتِ نثر، صفحہ ۲۴۹) کلیاتِ فارسی (مکتوبہ ۱۲۵۳ھ) کے خاتمے میں بتایا ہے کہ گیارہ سال کی عمر سے میں نے شعرگوئی کا آغاز کیا۔[1]

قدرؔ بلگرامی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

> "بارہ برس کی عمر سے کاغذ نظم و نثر میں مانند اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں۔"[2]

غالبؔ کے ان مختلف بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُنھوں نے بارہ سال سے پندرہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا تھا۔ ابتدا میں وہ اردو ہی میں شعر کہتے تھے۔

سفرِ کلکتہ سے پہلے غالبؔ کا اردو دیوان تو موجود تھا جو ۱۸۲۱ء میں مرتب ہوا تھا لیکن فارسی میں

اردو دیوان تو دور کی بات ہے، اُن کا کلام بھی بہت کم ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ غالبؔ نے لڑکپن میں فارسی میں ایک غزل کہی تھی، جس کی تفصیل مالک رام صاحب نے بیان کی ہے۔[۳]

دیوانِ اردو مکتوبہ ۱۸۱۶ء میں غالبؔ کی بارہ فارسی رباعیاں شامل ہیں۔ اب تک کا دستیاب غالب کا سب سے پہلا فارسی کلام یہ رباعیاں ہی ہیں۔ ان رباعیوں کے بعد غالب کا ایک فارسی قصیدہ ملتا ہے، جو حضرت علیؑ کی منقبت میں ہے۔ ساٹھ اشعار کا یہ قصیدہ اردو دیوانِ غالب مکتوبہ ۱۸۲۱ء میں شامل ہے۔ دیوان کا آغاز ہی اُس قصیدے سے ہوتا ہے، جس کا مطلع ہے:

بہرِ ترویجِ جنابِ والیِ یوم الحساب
ضامنِ تعمیرِ قصرستانِ دلہاے خراب

اس قصیدے کے اکثر اشعار کلیات فارسی مطبوعہ نول کشور کے قطعہ نمبر ۶۰ میں شامل ہیں۔''[۴]

غالبؔ جب سفرِ کلکتہ کے دوران فیروز پور میں نواب احمد بخش خاں کے ہاں مقیم تھے تو اُنھوں نے اپنے دوست مولوی فضل حق خیر آبادی کے نام صنعتِ تعطیل میں ایک خط لکھا تھا۔ اس خط میں یہ چار اشعار بھی شامل ہیں:

صرصرِ صد دمِ سرد آمد دل
ہمہ درد و (ہمہ) گرد آمد دل
گہ کرم کامِ دلِ ما گردد
گہ درم دامِ دلِ ما گردد
ہوسِ طرّۂ طراز او را
حرصِ وصل و سرِ دلدار او را
سادہ دلِ گردِ ہوسہا گردد
کہ عسل دامِ مگسہا گردد[۵]

یہ اشعار بظاہر کسی مثنوی کے معلوم ہوتے ہیں۔

غالبؔ نے معتمد الدولہ کو پیش کرنے کے لیے جو عرض داشت تیار کی تھی، اس میں درجِ ذیل پانچ فارسی اشعار بھی شامل ہیں:

اکرمِ اہلِ کرم اسعدِ اولادِ رسول
داورِ دادرس و سرورِ عالم آرا
درِ او مصدرِ عدل و کرم و سور و سرور
دلِ او مطلعِ علم و عمل و مہر و عطا
عدل را راہ درِ در گہِ او کردہ طلوع
ملک را گردِ رہِ عسکرِ او دادہ لِوا
گر دَوَدَ گردِ سُمِ ادہمِ او در عالم
ہر مسِ دہر طلا گردد و ہر صعوہ ہُما
درِ او آمدہ درگاہِ ملوکِ عالم
کہ گدا آمدہ کاؤس و دعاگو دارا [6]

غالبؔ نے قیامِ لکھنؤ کے دوران آغا میر معتمد الدولہ کی مدح میں ایک سو دس اشعار کا قصیدہ کہا تھا۔ بعض وجوہ سے غالبؔ کی معتمد الدولہ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اس لیے وہ عرض داشت ،جس کا ذکر کیا جا چکا ہے اور قصیدہ دونوں پیش نہیں کیے جا سکے۔ معتمد الدولہ کی مدح میں اس قصیدے کا مطلع ہے:

گر بہ سنبل کدۂ روضۂ رضواں رفتم
ہوسِ زلفِ ترا سلسلۂ جنباں رفتم

چوں کہ غالبؔ معتمد الدولہ سے اُن کی خودسری کی وجہ سے ناراض ہو گئے تھے، اس لیے بعد میں اس قصیدے کا ممدوح نصیر الدین حیدر کو کر دیا۔ اس قصیدے کے بارے میں غالب نے کلکتے سے محمد علی خاں کے نام ایک خط میں لکھا:

''قصیدہ جو میں نے آغا میر کی مدح میں کہا تھا، خدا جانتا ہے کہ وہ میرے خاندان کے لیے بدنامی کا سبب ہے۔ اب لطف یہ ہے کہ قصیدے کے ایک سو دس اشعار کاغذ پر سے مٹائے بھی نہیں جا سکتے۔ چوں کہ نواب مرشد آباد میں سیدزادے ہیں۔ میں اس قصیدے کو ان کے نام سے شہرت دے

رہا ہوں۔حالاں کہ میں اب تک اُن کی خدمت میں باریاب
نہیں ہوا لیکن ہمایوں جاہ کی مدح مجھے ناگوار نہیں ہے۔امید
ہے کہ جب تک ممدوح سے متعلق اشعار اس قصیدے میں شامل
نہ کرلوں۔آپ یہ قصیدہ کسی کو نہ دکھائیں۔(فارسی سے
ترجمہ)۵

کلکتے میں غالبؔ نے ادبی معرکے کے سلسلے میں آشتی نامہ(بعد میں اس کا نام بدل کر'بادِ مخالف' کر دیا تھا)، لکھی تھی۔اس مثنوی پر'ادبی معرکے' کے عنوان کے تحت تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔

غالبؔ لکھنؤ سے باندے آئے۔لکھنؤ میں اُنھوں نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہے تھے لیکن باندے میں صرف اردو میں طبع آزمائی کی۔باندے سے جب وہ الہ آباد آئے تو الہ آباد کی ہجو میں ایک شعر کہا جو اسی بات میں'متفرق اشعار' کے عنوان کے تحت نقل کیا گیا ہے۔

غالبؔ بنارس بہت کم وقت کے لیے گئے تھے لیکن انھیں یہ شہر اتنا پسند آیا کہ نہ صرف ایک مہینے اس شہر میں قیام کیا بلکہ بنارس کی مدح میں'چراغِ دیر' کے نام سے ایک سو آٹھ اشعار پر مشتمل ایک شاہکار مثنوی تخلیق کی، جس کا تفصیلی ذکر قیامِ بنارس کے عنوان کے تحت کر دیا گیا ہے۔

گلِ رعنا

غالبؔ کے قیامِ کلکتہ کی سب سے بڑی دین'گلِ رعنا' کے نام سے غالبؔ کے فارسی اور اردو کلام کا وہ انتخاب ہے جو اُنھوں نے کلکتے کے اپنے ایک دوست سراج الدین احمد خاں کی فرمائش پر تیار کیا تھا۔اس انتخاب سے غالبؔ کے اُس بیشتر فارسی اور اردو کلام کی نشان دہی ہو جاتی ہے، جو اُنھوں نے سفرِ کلکتہ اور قیامِ کلکتہ کے دوران کہا تھا۔'گلِ رعنا' نایاب تھی، اس لیے عام خیال تھا کہ اس کا مخطوطہ ضائع ہو چکا ہے لیکن ہماری خوش نصیبی ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں'گلِ رعنا' کے ایک نہیں چار مخطوطات دریافت ہو گئے، جس کی وجہ سے غالب کے کلام کے بارے میں ہماری معلومات میں بہت زیادہ اضافہ ہوا۔یہاں'گلِ رعنا' کی مختصر تفصیلات بیان کی جاتی ہیں۔

۱-نسخۂ حسرت موہانی: بقول مالک رام 'گل رعنا' کا یہ مخطوطہ ناقص تھا۔ حسرت موہانی نے اس مخطوطے سے وہ اردو اشعار لے لیے تھے، جو متداول دیوان میں شامل نہیں تھے۔ سید قدرت نقوی نے اس نسخے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "مولوی غلام رسول مہر نے اسے کتاب کا ایک حصہ اور مالک رام نے ناقص نسخہ بتایا ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ فارسی کا حصہ نہ ہو اور اردو کا کلام مکمل ہو۔"[۹]

۲-نسخۂ معین الرحمٰن: 'گل رعنا' کا ایک مخطوطہ ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب کو ملا تھا۔ یہ مخطوطہ لاہور کے خواجہ محمد حسن کی ملکیت تھا۔ خواجہ صاحب کو یہ نسخہ اپنے نانا خواجہ احمد اللہ امرتسری سے ملا تھا۔ اس نسخے کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ مخطوطے کے آخر میں تاریخِ کتابت غرہ الاول ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۱ر ستمبر ۱۸۲۸ء درج ہے۔

معین الرحمٰن صاحب نے پہلی بار اس نسخے کا تعارف نقوش، لاہور میں کرایا تھا۔[۱۰]

۳-نسخۂ مالک رام: مالک رام جب سرکاری ملازمت میں تھے تو عماد الملک سید حسین بلگرامی کے صاحب زادے سید نقی بلگرامی اُن کے افسرِ اعلا تھے۔ نقی صاحب کو غالب سے مالک رام کی غیر معمولی دل چسپی کا علم تھا۔ اُن کے پاس 'گل رعنا' کا ایک نسخہ تھا، جو اُنھوں نے مالک رام کو تحفتہً دے دیا۔ مالک رام نے یہ نسخہ بہت سلیقے سے مرتب کر کے علمی مجلس دہلی سے مئی ۱۹۷۰ء میں شائع کر دیا۔

۴-نسخۂ سید قدرت نقوی: خاندانِ شریفی کے حکیم اجمل خاں کے پوتے حکیم محمد نبی خاں جمالِ سویدا کے ذاتی کتب میں 'گل رعنا' کا ایک مخطوطہ محفوظ تھا۔ سید قدرت نقوی نے 'گل رعنا' کے اس نسخے کا بہت سائنٹی فک انداز میں تنقیدی اڈیشن تیار کیا جو انجمن ترقی اردو (کراچی) سے ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔

گل رعنا میں غالب کی ۱۱۶ اردو اور ۲۷ فارسی غزلوں کا انتخاب شامل ہے۔ ان میں فارسی کی ۱۶ غزلیں پوری اور باقی غزلوں کے منتخب اشعار دیے گئے ہیں۔ فارسی کی یہ ۲۷ غزلیں وہ ہیں جو غالب نے سفرِ کلکتہ کے دوران کہی تھیں۔ بقول مالک رام ان میں سے غزلیں نمبر ۳، ۴، ۵، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۲۰، ۲۶، ۲۷ اور غزل نمبر ۶ عظیم آباد میں کہی گئی تھی۔[۱۱]

ان غزلوں کے علاوہ 'گلِ رعنا' میں فارسی کا ایک قصیدہ، دو قطعے، اور ایک مثنوی بھی شامل ہیں۔ سفرِ کلکتہ کے دوران غالب نے جو فارسی اشعار کہے تھے، وہ اُس کلام سے بہت زیادہ ہے جو 'گلِ رعنا' میں شامل ہے۔ غالب نے کلکتے کے سفر اور کلکتے کے قیام کے دوران فارسی میں مختلف اصناف میں جو شعر کہے تھے، یہاں اُن کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

گورنر جنرل کے پرشین سکریٹری اینڈریو اسٹرلنگ کی مدح میں غالب نے ایک قصیدہ کہا تھا، جس کا مطلع ہے:

فغاں کہ نیست سرو برگِ دامن افشانی
بہ بندِ خویش فرو ماندہ ام از عریانی

یہ قصیدہ ۲۶/ذی قعدہ ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۶/جون ۱۸۲۸ء سے قبل پیش کیا گیا تھا۔[۱۲]

غالب نے نواب محمد علی خاں کے نام ایک خط میں فرانس ہاکنس کی مدح میں کہے گئے اٹھائیس اشعار کا ایک قصیدہ نقل کیا ہے۔ قصیدے کا مطلع ہے:

یافت آئینۂ بختِ تو ز دولت پرواز[۱۳]
جلوہ ہا سازکن اے دہلی و برخویش بناز

کلیاتِ فارسی میں اس شعر کا دوسرا مصرع اس طرح ہے:

ھلہ کلکتہ بدیں حسن خدا ساز بناز

غالب نے کلکتے میں بائیس شعر کا ایک اور قطعہ تھا، جس کا پہلا شعر ہے:

نہ چنانم کہ دانا نا بستہ
مزرع خویش وقفِ داس کنم

بعد میں اس میں ایک شعر کا اضافہ کر دیا۔ ممکن ہے کہ قطعے کے دیگر اشعار کے ساتھ ہی یہ شعر کہا ہو، لیکن اسے 'گلِ رعنا' میں شامل نہیں کیا۔ شعر ہے:

لیک ناید زمن کہ در گفتار
مدحت لالہ سُورداس کنم[۱۴]

اس شعر میں واضح طور پر قتیل کی طرف اشارہ ہے۔

غالبؔ نے کلکتے میں بائیس اشعار کا ایک قطعہ کہا تھا، جس کا پہلا شعر ہے:

ساقیِ بزمِ آگہی روزے
راوقی ریخت در پیالۂ من

'گلِ رعنا' میں غالبؔ کی ستائیس فارسی غزلیں شامل ہیں۔ یہ تمام غزلیں سفرِ کلکتہ اور قیامِ کلکتہ کے دوران کہی گئی ہیں۔ غزلوں کے مطلعے درجِ ذیل ہیں:

(۱)

جنوں مستم، بفصلِ نو بہارم میتواں کشتن
صراحی بر کف و گُل در کنارم میتواں کشتن

....

(۲)

نمی بینیم در عالم نشاطے کا سماں مارا
چو نور از چشمِ نابینا، ز ساغر رُفت صہبارا

....

(۳)

باہمہ گُم گشتگی، خالی بُوَد جایم ہنوز
گاہ گاہی، در خیالِ خویش می آیم ہنوز

....

(۴)

اے بصدمۂ آہے بردلت زبا باری
ایں قدر گراں نَبوَد نالۂ ز بیماری[15]

....

(۵)

شبہائے غم کہ چہرہ بخوناب شستہ ایم
از دیدہ نقش وسوسۂ خواب شستہ ایم[16]

....

(۶)

ایں چہ شور است کہ از عشقِ تو در سر دارم
ذوقِ پروانہ و تمکینِ سمندر دارم

....

(۷)

گویم سخنے، گرچہ شنیدن نشناسد
صبح است شبم را کہ دمیدن نشناسد

....

(۸)

بہ عشق از دو جہاں بے نیاز باید بود
مجاز سوزِ حقیقت گداز باید بود

....

(۹)

از وہمِ قطرگیست کہ در خود گمیم ما
امّا چو دار سیم، ہماں قُلزمیم ما

....

(۱۰)

آناں کہ وصلِ یار ہمی آرزو کنند
باید کہ خویش را بگدازند و اُو کنند

(۱۱)

بگیتی شد عیاں از شیوۂ عجز اضطرارِ ما
ز پشتِ دستِ ما باشد قماشِ رُوے کارِ ما

....

(۱۲)

گاہی بچشمِ دشمن و گاہی در آئنہ
پَرکارِ عیب جوئیِ خویشم ہر آئنہ

....

(۱۳)

جیبِ مرا مدوز کہ، بُودش نماندہ است
تارش زہم گسستہ و پُودش نماندہ است

....

(۱۴)

نگاہش ار بسرِ نامۂ وفا ریزد
سوادِ صفحہ ز کاغذ چو توتیا ریزد

....

(۱۵)

بخود رسیدنش از ناز بسکہ دشوار است
چو ما، بدامِ تمنائے خود گرفتار است

....

(۱۶)

امشب آتشیں روے ، گرمِ ژندہ خوانیہاست
کز لبش، نوا ہردم ، در شرر فشانیہاست

....

(۱۷)

ز گرمیِ نکہت ، خونِ دل بجوش آمد
ز شادیِ ستمت، سینہ در خروش آمد

....

(۱۸)

طاق شد طاقت زمشقت ، برگراں خواہم شدن
مہرباں شو، ورنہ برخود، مہرباں خواہم شدن

....

(۱۹)

خوش بود ، فارغ ز بندِ کفروایماں ، زیستن
حیف ، کافر مردن و آوخ مسلماں زیستن!

....

(۲۰)

تا کیم دُودِ شکایت، ز بیاں بر خیزد
بزن آتش کہ شنیدن زمیاں برخیزد[۱۷]

....

(۲۱)

بشغلِ انتظارِ مہوشاں، در خلوتِ شب ہا
سرِ تارِ نظر، شد رشتۂ تسبیحِ کوکب ہا

....

(۲۲)

خوش وقتِ اسیری کہ بر آمد ہوسِ ما
شد روزِ نخستین سبدِ گل قفسِ ما

....

(۲۳)

از تُست ، اگر ساختہ پر داختۂ ما
کفرے نَبُوَد مطلبِ بے ساختۂ ما
(۲۴)

....

جنوں، از بس بصحرائے تحیّر راندہ است امشب
نگہ در چشم و آہم در جگر، وا ماندہ است امشب

....

(۲۵)

چہ فتنہ ہا کہ در اندازۂ گمانِ تو نیست
قیامت است دلِ دیر مہربانِ تو نیست

....

(۲۶)

داغم از پردۂ دل رُو بقفا می آید
تا بہ بینم کہ ازیں پردہ چہا می آید

....

بیا و جوشِ تمنّاے دیدنم بنگر
چو اشک، از سرِ مژگاں چکیدنم بنگر

غالبؔ نے بنارس سے نواب محمد علی خاں کے نام ایک خط میں درج ذیل قطعہ لکھا ہے۔ قطعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بنارس میں تخلیق ہوا تھا۔

مغلوبِ سطوتِ شرکاء غالبؔ حزیں
کاندر تنش ز ضعف، تواں گفت، جاں نہ بود
گویند زندہ تا بہ بنارس رسیدہ است
مارا بہ ایں گیاہِ ضعیف ایں گماں نہ بود[۱۸]

کلکتے میں نواب محمد علی خاں کے بھائی سراج الدین علی خاں کے مزار کے قریب ایک امام باڑہ تعمیر کیا گیا تھا۔ امام باڑے کے صحن میں ایک مسجد بنائی گئی تھی۔ غالبؔ نے اس مسجد کی تعمیر کا درجِ ذیل قطعۂ تاریخ کہا تھا:

صحنِ امامِ باڑہ و مسجد ہر آں کہ دید
در کربلا زیارتِ بیت الحرام کرد
مفتیِ عقل از پَے تاریخِ آں بِنا
ایما بہ سُوے من ز رہِ احترام کرو
گفتم بہ یَوے بدیہہ، ''خوشا خانۂ خدا''
شد خشمگیں دمے کہ نظر در کلام کرد
خاشاک رُفت و پاے ادب در شکنجہ ریخت
ایہام را بہ تخرجہ معنی تمام کرد[۱۹]

سراج الدین علی خاں کے مزار کے قریب امام باڑے کی سنگِ بنیاد رکھنے کے موقع پر غالبؔ نے درج ذیل قطعۂ تاریخ کہا تھا۔

چوں شد بہ صحنِ مدفنِ خانِ بزرگوار
طرحِ امام باڑۂ حالی سپہر سا
رضواں ز خلد نور بر آں (بام و در) فشاند
تا گشت خشت و سنگ چو آئینہ رُونما

رحمت پئے بساط در آں بزمِ تعزیت
آورد اطلسِ سیہ از سایۂ ہما
رفتم نیاز مند بہ پیشِ سروشِ فیض
گفتم کہ پردہ از رُخِ تاریخ برکشا
در ''تعزیت سرائے'' بزد نالہ'' و بگفت
۸۶+ ۱۱۵۸
این است ساز نغمۂ تاریخِ ایں بنا[۲۰]

کلکتے میں غالب کے ایک دوست تھے مرزا ابوالقاسم خاں انھیں ہاضمے کے شکایت ہوگئی تو غالب نے انھیں مسہل کا مشورہ دیا، جس سے انھیں مرض میں افاقہ ہوا۔ اُنھوں نے شکریے کے طور پر غالب کو فارسی میں ایک مختصر قطعہ کہہ کر بھیجا۔ اپنے ملازم کے ہاتھ قطعے کے ساتھ ہی دال اور اچار بھی بھیجا۔ غالب نے اسی زمین میں فی البدیہہ ایک قطعہ کہہ کر مرزا ابوالقاسم کے ملازم کے ہاتھ بھیج دیا، جس میں دال اور اچار کی تعریف کی گئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کلکتے کے کچھ شاعروں سے غالب کا ادبی معرکہ ہو رہا تھا۔ مرزا ابوالقاسم خاں کے آدمی کے چلے جانے کے بعد غالب کو خیال آیا کہ اُنھوں نے یہ قطعہ بغیر کسی غور و فکر کے فی البدیہہ کہا ہے اگر اس میں زبان و بیان کی کوئی غلطی ہوگئی اور یہ مخالفوں کے ہاتھ آگیا تو اور بھی فضیحتہ ہوگا۔ اس لیے غالب نے غور و فکر کے بعد ایک اور قطعہ کہہ کر اپنے ملازم کے ہاتھ مرزا ابوالقاسم خاں کو بھیجا۔ قطعے کے ساتھ ایک خط بھی تھا، جس میں غالب نے لکھا تھا:

'' میں نے صبح آپ کے قطعے کے جواب میں ایک قطعہ لکھا تھا۔ آپ کا آدمی گواہ ہے کہ کیسی سراسیمگی اور جلدی میں یہ خط لکھا گیا تھا۔ حاشا وہ آپ کے قطعے کا جواب نہیں تھا۔ اس قطعے کی تحریر سے مقصد دال اور اچار کی محض رسید لکھنا تھا۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس قطعے کو دھو دیں گے یا نذرِ آتش کر دیں گے (یعنی ضائع کر دیں گے) ایسا نہ ہو اس میں کوئی سُقم ہو اور وہ مخالفین کے ہاتھ آجائے .... اس ورق پر جو قطعہ درج ہے وہ آپ کے ارسال کردہ قطعے کا جواب ہے۔''[۲۱]

یہ دونوں قطعے صرف متفرقاتِ غالب (مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب میں نقل ہوئے ہیں، اس

لیے دونوں قطعے ملاحظہ ہوں۔

قطعہ

"اسداللہ خاں بقاسم"

ای گرامی نژاد والا جاہ
کہ درت باب سجدۂ امراست
دود مان تو مفخر آفاق
بتو نازد اگر زمانہ رواست
فرق خرشید را بود افسر
ہر غبارے کہ از درت برخاست
امرا زادگانِ ہندستاں
ہمسری با تو گر کنند، خطاست
نسبتِ دیگراں بہ شوکتِ تو
ذرہ با مہر و قطرہ با دریاست
دال و آچار سرکہ را نازم
کہ دلِ زار ہر دو را می خواست
مرحبا، مرحبا، تعال ، تعال
این چہ جودو چہ فیض عطاست
نازم آچار را کہ از ترشی
چینِ پیشانیِ بتِ رعناست
آفتابی ز دانہ دانۂ دال
بر سپہرِ خیال حلوہ نماست
از عطاے تو بیش ، ہم زیں دال

قدرے الطاف کردۂ آغاست

اینک ان را بذوق نی پختم

کردہ ہر گونہ از مصالح راست

کہ نوازش رقم صحیفۂ تو

برسید و دلم زجا برخاست

گفتم: اول جواب بنویسم

زانکہ مکتوب قبلۂ جانہاست

سوے دال است ایں زماں جانم

دیدنِ قطعہ را دماغ کجاست

سرسری چند شعر بنوشتم

تا نگوئی ، اسد خموش نواست

تادریں کارگاہِ شام و سحر

شام تاریک و صبح وقفِ ضیاست

شامِ عیش تو آں چناں روشن

کہ بگویند: صبح عشر تہاست

روزِ خصمِ تو آں چناں تاریک

کہ بدانند: ایں شب یلداست

قطعہ

''دوم در جوابِ قطعۂ قاسم''

قدر دانا، لطیفۂ دارم

بپزیری اگر ز بندہ ، روا است

کلک اندیشہ ام ازیں تحریر

آب و رنگِ نشاطِ طبع تو خواست
بندہ را از کرم ستو دستی
مشتِ خاشاک را چہ قدر و بہاست!
بوعلی و مسیح و افلاطوں
ہرچہ گفتی بگو کہ از تو سزاست
بے ادب باشم ، او کنم تکذیب
بے خرد باشم ، ار شمارم راست
نسبتِ من بہ بوعلی سینا
صاف ہمچوں سراب با دریاست
بو کہ در چار سوے کلکتہ
کہ چنیں قحطِ حکمت و حکماست
بو علی گفتنم روا باشد
خرس در کوہ بو علی سیناست
سپس از شوخی، نہ بہانہ
گویم احوالِ قطعۂ کہ تراست
لفظش آئینہ دارِ حسن ادا
معنیش بود و تارِ فکر رساست
نقطۂ حرف اشعارش
مردمِ چشمِ مردمِ بیناست
اے روانم فدای ہر سخت!
مرحبا ایں چہ طبع معنی زاست!
تو کلیمی بر اوج طور سخن
پنجہ برساعدت یدِ بیضا ست

در صفِ دشمناں زبہہ نہیب
خامہ را در کفِ تو حکم عصاست
از من اصلاحِ آرزو کردن
سر بسر ہیچ کس نوازیہاست
لیکن ایں بیت ز آنہہ ابیات
خللے دارد ، ار بگویم راست
"مسہل دادی و بفرمودی
بعمل آر بیگان کہ شفاست"
آخرِ لفظِ مسہل از سرِ سہو
کرہ بنوشتۂ و موقع یاست
یاے توحید بر نگار ایں جا
کرہ خود بے مضاف الیہ خطاست
فنِ انشا زیاں نکرد ازین
لیک عیبِ طریقۂ املاست
بدعا ختم می کنم نامہ
زانکہ سرمایۂ فقیر دعاست
وقف تو باد از خزانۂ غیب
ہرچہ در دین و ہرچہ در دنیاست
شاد و خرم بزی کہ در دوجہاں
دستگیر تو سید الشہدا ست[۲۲]

رباعیاں

غالبؔ کی ایک رباعی ہے۔

ہر پردۂ زندگی نواے دارد
ہر گوشہ از دہر قضاے دارد
ہرچید یبوست از دماغم یکسر
بنگالہ شگرف آب و ہواے دارد

یہ رباعی نواب محمد علی خاں کے نام اس خط میں نقل ہوئی ہے جو کلکتے سے لکھا گیا تھا۔[۲۳]

نواب محمد علی خاں کے نام ایک خط میں غالبؔ نے درج ذیل رباعی لکھی ہے۔ یہ رباعی ''گل رعنا'' میں شامل نہیں کی گئی۔ البتہ 'کلیات فارسی' میں شامل ہے۔

سر تا سرِ دہر باغ و بستانِ تو باد
صد رنگ گلِ (طرب بہ دامانِ تو باد)
عید است و بہارِ خوش دلی ہا دارد
جان من و صد چو من بہ قربانِ تو باد[۲۴]

غالبؔ نے نواب محمد علی خاں کے نام کلکتے سے خط لکھا تھا، جس میں یہ رباعی لکھی ہے:

غالبؔ چو ز دا مگہ بدر جستم من
آخر ز چہ بودہ ایں چنین برگشتن
باید کہ کنم ہزار نفریں بر خویش
اما بہ زبانِ جادۂ راہِ وطن[۲۴ الف]

متفرق اشعار:

غالبؔ نے 'نامہ ہاے فارسی غالب' کے خطوط میں خاصی تعداد میں متفرق اشعار لکھے ہیں۔ یہاں وہ اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔

یاد باد آں روزگاراں کا اعتبارے داشتیم
آہِ آتشناک و چشمِ اشکبارے داشتیم[۲۵]

اے بصدمہ ای آہے بر دلت زما بارے
ایں قدر گراں بنود نالہ ای ز بیا رے [۲۶]

تا فصلے از حقیقتِ اشیا نوشتہ ایم
آفاق را مرادفِ عنقا نوشتہ ایم [۲۷]

با سراج الدین احمد چارہ جز تسلیم نیست
ورنہ غالب ! نیست آہنگِ غزل خوانی مرا [۲۸]

اشعار:

غالب رسیدہ ایم بہ کلکتہ و بہ مے
از سینہ داغِ دوریِ احباب شستہ ایم [۲۹]

'گل رعنا' میں اس غزل کے سات اور 'کلیاتِ فارسی' میں نو شعر ہیں۔ مقطع سے پتا چلتا ہے کہ یہ غزل کلکتے میں کہی گئی۔

میرود خندہ بہ سامانِ بہاراں زدہ ای
خونِ گل ریختہ و مے، بہ گلستاں زدہ ای [۳۰]

غالب نے بنارس پہنچ کر نواب محمد علی خاں کو جو خط لکھا تھا۔ اس کی ابتدا اس نثر اور شعر سے ہوتی ہے۔

مشتملِ برہجو الہٰ آباد و صنعتِ بنارس
ایں شکایت نامۂ آوارگی ہاے من است
قصۂ دردِ جدائی ہا ، جدا خواہم نوشت [۳۱]

''نامہ ہاے فارسی غالب'' میں ایسے کچھ اشعار ہیں، جن کی غزلیں 'گل رعنا' اور 'کلیاتِ فارسی' میں شامل نہیں ہوئیں۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ ان اشعار کے مصنف غالب ہیں یا اُنھوں نے دوسروں کے اشعار نقل کیے ہیں۔ یہ اشعار ہیں:

گر کسے شکرِ حق فزوں گوید
شکرِ توفیقِ شکر چوں گوید

قبلہ خوانم، یا پیمبر، یا خدا، یا کعبہ ات
اصطلاح بسیار است و من یکے دیوانہ ام

....

گلویم تشنہ و جان و دلم افسردہ اے ساقی
بدہ نو سینہ دارو ے کہ آتش ہم آب استی

....

ایں شکایت نامۂ آوارگی ہاے من است
قصۂ دردِ جدائی ہا، جدا خواہم نوشت

....

پیشانیِ عفوِ ترا پرچیں نہ سازد جرمِ ما
آئینہ کے برہم خورد از زشتیِ تمثالہا

....

ہمہ را ماتمی حسرتِ دنیا دیدم
چوں بہ عشرت کدۂ گبر و مسلماں رفتم

....

گر تو مرا نہ خواہی ، من خویش را بسوزم
جاے کہ آب بنود، روزے کہ باد باشد

....

اردو کلام

پہلے بتایا جاچکا ہے کہ غالب نے سفرِ کلکتہ اور قیام کلکتہ کے دوران اردو میں بہت کم شعر کہے ہیں اور جو اشعار کہے ہیں، اُن سب کی نشان دہی کرنا مشکل ہے۔ کیوں کہ کلکتے میں غالب کی ادبی سرگرمیوں کا واحد مآخذ 'نامہ ہاے فارسی غالب' ہے اور اس مجموعے کے سب خطوط فارسی میں ہیں۔ غالب نے اپنی فارسی تخلیقات کا ذکر کیا ہے اور بہت سے فارسی اشعار نقل کیے ہیں۔ اس کے برعکس اردو کا ایک شعر بھی نقل نہیں کیا۔

'گل رعنا' میں غالب کی ایک سو سولہ غزلوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ 'گل رعنا' کا انتخاب

۱۸۲۸ء میں ہوا۔اس سے پہلے غالبؔ کے اردو دیوان کی ۱۸۲۱ء میں کتابت ہوئی تھی۔اس دوران ایک اور دیوان مرتب ہوا، جو نسخۂ شیرانی کے نام سے مشہور ہوا ہے مگر اس پر سنہِ کتابت نہیں ہے۔اس لیے یہ پتا چل جاتا ہے کہ ۱۸۲۱ء اور ۱۸۲۸ء کے دوران غالب نے کون سی غزلیں کہی تھیں۔ ان دونوں سنین کے درمیان غالبؔ نے چونتیس غزلیں کہی تھیں۔ 'گل رعنا' ۱۱رستمبر ۱۸۲۸ء کو مکمل ہوئی تھی اور غالبؔ نومبر ۱۸۲۹ء کو دہلی روانہ ہوئے تھے۔ یہ ممکن نہیں کہ ان تیرہ چودہ مہینوں میں غالب نے فارسی اور اردو میں شعر نہ کہے ہوں۔ ہمارے پاس اس عرصے میں کہے گئے کلام کی نشان دہی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔اردو کی کچھ غزلوں کے بارے میں حتمی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ وہ سفرِ کلکتہ کے دوران کہی گئی تھیں۔ اس سلسلے میں ہمیں نسخۂ شیرانی سے کچھ مدد ملتی ہے۔ یہ نسخہ بقول مالک رام غالبؔ کے کسی قریبی دوست، غالباً نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں یا ناظر حسین مرزا کی ملکیت تھا۔ غالب نے سفرِ کلکتہ کے دوران کہی جانے والی کچھ غزلیں اپنے دوست کو بھیجی تھیں۔ انھوں نے یہ غزلیں دیوان کے حاشیے پر درج کردیں۔ان غزلوں کے مطلعے ہیں:

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا

وہ ایک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا

اس غزل کے شروع میں لکھا ہوا ہے۔'از باندہ فرستادند'۔

ایک اور غزل سے پہلے لکھا ہوا ہے۔'از باندہ رسید'۔اس غزل کا مطلع ہے۔

آبرو کیا خاک اُس گل کی کہ گلشن میں نہیں

ہے گریباں ننگِ پیراہن، جو دامن میں نہیں

اس کے بعد دیوان کے حاشیے پر جو غزلیں نقل کی گئی ہیں، اُن کے مطلعے ہیں:

ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں

غیر کی بات بگڑ جائے، تو کچھ دور نہیں

نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں

ہے تقاضائے جفا، شکوۂ بیداد نہیں

دیر کی یہ تینوں غزلیں یکے بعد دیگرے لکھی گئی ہیں۔ اس کے بعد جو غزلیں نقل ہوئی ہیں، اُن کے مطلعے ہیں۔

واں پہنچ کر جو غش آتا پے، ہم ہے ہم کو
صدرہ آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو۳۲

....

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
ایک شمع ہے دلیلِ سحر، سو خموش ہے

....

کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

اس دیوان کے ص ۹ الف کے حاشیے پر غالبؔ کے ہاتھ سے لکھی ہوئی یہ غزلیں ملتی ہیں۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا، تو جینے کا مزا کیا

....

رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

غالبؔ کا تیرہ اشعار کا ایک قطعہ ہے جو اُنھوں نے کلکتے میں کہا تھا۔ قطعے کا پہلا شعر ہے:

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈالی
زیب دیتا ہے، اِسے جس قدر اچھا کہیے۳۳

بقول مالک رام ''یہ غزل بھی شاید کلکتے میں کہی گئی تھی۔

دیکھنے میں ہیں گرچہ دو، پر ہیں یہ دونوں یار ایک
وضع میں گو ہوئی دو سر، تیغ ہے ذوالفقار ایک۳۴

دوسرا باب

غالبؔ اور ہندوستانی فارسی شاعر اور فارسی فرہنگ نویس

۲۰رفروری ۱۸۲۸ء کو غالبؔ کلکتے پہنچے تھے۔اس وقت غالبؔ کی عمر تقریباً اکتیس [۳۱] سال تھی۔اس تاریخ سے پہلے غالبؔ کی کسی تحریر میں کسی بھی ہندستانی فارسی شاعر یا فرہنگ نویس کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں ملتا۔

'ادبی معرکے کے تین مشاعرے' کے تحت اُس معرکے کی پوری تفصیل بیان کی جا چکی ہے جس کی وجہ سے ہندوستان کے فارسی دانوں کے بارے میں غالبؔ کے رویّے میں بہت اہم تبدیلی آئی تھی۔اسی معرکے میں مرزا محمد حسن قتیلؔ سے غالبؔ کی دشمنی کا آغاز ہوا تھا۔قتیلؔ کی ولادت ۱۷۵۸ء۔۱۷۵۹ء میں ہوئی تھی اور غالبؔ ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔اس کا مطلب ہے کہ عمر میں غالبؔ قتیلؔ سے تقریباً اڑتیس سال چھوٹے تھے۔۱۸۱۸ء میں قتیلؔ کا انتقال ہوا تھا اور یہ ادبی معرکہ دس سال بعد یعنی ۱۸۲۸ء میں ہوا۔اسی معرکے ہی سے قتیلؔ سے غالبؔ کی دشمنی کا آغاز ہوا اور زندگی کے آخری دنوں تک غالبؔ قتیلؔ کے مخالف رہے۔غالبؔ نے کلکتے کے ایک مشاعرے میں فارسی کی غزل پڑھی تھی،جس کے ایک شعر میں 'ہمہ عالم' کی ترکیب استعمال کی تھی۔سامعین میں سے کسی نے غالبؔ کے اس شعر پر اعتراض کیا کہ 'ہمہ عالم' کی ترکیب غلط ہے۔کسی نے یہ بھی کہا کہ قتیلؔ کی تصنیفات 'چہار شربت' اور 'نہر الفصاحت' سے اس ترکیب کی سند نہیں ملتی۔یہیں سے اور غالباً معترض کے اسی فقرے سے قتیلؔ سے غالبؔ کی دشمنی کا آغاز ہوا اور بات یہاں تک پہنچ گئی کہ غالبؔ قتیلؔ کو زندگی بھر گالیاں دیتے رہے اور امیر خسروؒ کے علاوہ ہندستان کے تمام فارسی شاعروں کو غیر مستند کہتے رہے۔

غالبؔ عبدالقادر بیدلؔ کے بہت مداح تھے۔بیدلؔ کے انداز میں شعر کہنے اور اُن کا تتبع کرنے پر فخر کرتے تھے لیکن کلکتے کے ادبی معرکے کے بعد غالبؔ بیدلؔ سے بھی منحرف ہو گئے اور انھیں بھی غیر مستند کہنے لگے۔

غالبؔ غلام غوث خاں بےخبرؔ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''آپ جب تک کلامِ اہلِ زبان میں نہ دیکھ لیں۔اس کو جائز نہ جانیے گا مگر کلام سعدی و نظامی و حزیں اور اُن کے امثال اور نظائر کا

معتمد علیہ ہے نہ آرزو اور واقف اور قتیل وغیرہم کا۔"[۱۰]

ہندوستان کے اہم فارسی شاعروں میں غالب اپنے علاوہ صرف امیر خسروؒ کی شاعرانہ صلاحیتوں اور زباں دانی کے قائل تھے۔ غالب عبدالقادر بیدل کے بہت مدّاح تھے۔ بیدل کے انداز میں شعر کہنے اور اُن کا تتبع کرنے پر فخر کرتے تھے لیکن کلکتے کے ادبی معرکے کے بعد غالب بیدل سے بھی منحرف ہوگئے اور انھیں بھی غیر مستند کہنے لگے۔ بیدل سے غالب کا ذہنی رشتہ دل چسپ تھا۔ غالب نے اپنے اردو اشعار میں کم سے کم تیرہ بار بیدل کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ اس کے برعکس امیر خسروؒ کا ذکر ان کے کلام میں صرف ایک دو بار آیا ہے۔ غالب نے اپنے اردو خطوں میں مختلف موقعوں پر بیدل کے بارہ شعر اور ایک مصرع نقل کیا جب کہ خسرو کا ایک مصرع بھی اپنی کسی تحریر میں نقل نہیں کیا۔ غالب کے اردو اور فارسی کلام پر امیر خسروؒ کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔

شیخ ناسخ نے غالب کو مشورہ دیا تھا کہ وہ مہاراجا چندولال کے پاس چلے جائیں تو اُن کی مالی دشواریاں دور ہوسکتی ہیں۔ غالب کو معلوم ہو چکا تھا کہ مہاراجا چندولال فارسی میں قتیل اور اردو میں شاہ نصیر کے مداح ہیں، اس لیے قدرے تلخ لہجے میں ناسخ کو جواب دیتے ہیں:

> "چندولال میرے زمزموں (شاعری) سے کیا واقف اور میرے طرز اور روش کو کیا جانتے ہیں جو فارسی میں قتیل کو استاد سمجھتے ہوں۔ وہ غالب کو کیا سمجھیں اور جو اردو میں نصیر (شاہ نصیر) کے مداح ہوں، اُن کی نظر میں ناسخ کیا ہیں۔ اس وقت اُن کی عمر اسّی سال سے زائد ہے، میں جب تک اُن کے پاس پہنچوں گا وہ جہنم رسید ہو چکے ہوں گے۔"[۱۱الف] (فارسی سے ترجمہ)

اس دوران میری معلومات کے مطابق، غالب نے قتیل کے خلاف کچھ نہیں کہا لیکن بعد میں غالباً ۱۸۴۸ء کے بعد سے غالب نے اپنے بعض شاگردوں اور دوستوں کے خطوط میں قتیل پر بے وجہ اس طرح لعن طعن کی ہے، جس کا کوئی موقع نہیں تھا۔ مثلاً مئی ۱۸۴۸ء کے ایک خط میں مرزا ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:

> "ظاہر تم خود فکر نہیں کرتے اور حضرات کے بہکانے میں آجاتے ہو۔ وہ صاحب تو بیش تر اس نظم و نثر کو مہمل کہیں گے، کس واسطے کہ اُن کے کان اس آواز سے آشنا نہیں، جو لوگ قتیل کو اچھا لکھنے والوں میں

جانیں گے، وہ نظم ونثر کی خوبی کو کیا پہچانیں گے۔''[۲]

ناسخ اور مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام ان دونوں خطوط میں قتیل کے بارے میں غالب نے صرف یہ کہا ہے کہ لوگ قتیل کو اچھا لکھنے والوں میں شمار نہیں کرتے۔

غالباً مارچ/اپریل ۱۸۵۹ء میں پہلی بار بیدل کے بارے میں تحقیر آمیز رویہ اختیار کیا ہے۔ ایک خط میں چودھری عبدالغفور سرور کو لکھتے ہیں:

''آرزو، فقیر اور شیدا اور بہار وغیرہم انھیں میں آ گئے۔ ناصر علی اور بیدل اور غنیمت، ان کی فارسی کیا؟ ہر ایک کا کلام بہ نظرِ انصاف دیکھیے، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا؟ منت اور مکین اور واقف اور قتیل تو اس قابل بھی نہیں کہ ان کا نام لیجیے''۔[۳]

اگست ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں غالب مرزا تفتہ کو ان کی غزل پر اصلاح دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وہ شعر کس واسطے کاٹا گیا؟ سمجھو پہلا مصرع لغو، دوسرے مصرع میں ''نبرد'' کا فاعل معدول۔ ''حلقۂ زا'' کی زے پر نقطہ نہ تھا۔ میں نے غصے میں لکھا کہ نہ ''حلقۂ چہرا'' درست نہ ''حلقۂ زا'' درست۔ مگر یہ فارسی بیدلانہ ہے، خیر رہنے دو''۔[۴]

۱۸۵۷ء میں 'دستنبو' کی تصنیف کے دوران غالب کو کچھ ایسی فارسی لغات کے مطالعے کا اتفاق ہوا، جن میں اُن کے خیال کے مطابق بہت سی غلطیاں تھیں۔ اب تک وہ فارسی شاعروں ہی کو غیر مستند سمجھتے تھے لیکن اب اُنھوں نے فارسی فرہنگ نویسوں کو بھی غیر مستند کہنا شروع کر دیا۔ ۴/اکتوبر ۱۸۶۱ء کو غالب نے مرزا تفتہ کو جو خط لکھا ہے اس میں پہلی بار ہندستان کے فارسی دانوں کے بارے میں دشنام طرازی سے کام لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں برہان کا خاکہ اُڑا رہا ہوں۔ 'چہار شربت' اور 'غیاث اللغات' کو حیض کا لتہ سمجھتا ہوں۔ ایسے گمنام چھوکروں سے کیا مقابلہ کروں گا۔''[۵]

مولوی ضیاء الدین خاں ضیا دہلوی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''۸۰۰ یا ۹۰۰ ہجری میں ہوسناک لوگ فارسی کے فرہنگ لکھنے پر متوجہ

ہوئے۔ نہ ایک نہ دو بلکہ ہزار دو ہزار فرہنگیں فراہم ہوگئیں۔ یہاں
تک کہ قتیلؔ نومسلم لکھنوی اور غیاث الدین ملائے مکتب دار رام پوری
اور کوئی روشن علی جون پوری اور کہاں تک کہوں کون کون جس جس کے
جی میں آئی وہ متصدیِ تحریر قواعدِ انشا ہوگیا۔"[٦]

عبدالواسع ہانسوی نے رسالہ عبدالواسع ہانسوی میں لکھ دیا کہ 'بے مراد' صحیح اور نامراد غلط ہے جو واقعی غلط تھا۔ جب غالبؔ کی نظر عبدالواسع کی اس غلطی پر پڑی تو انھوں نے آسمان سر پر اُٹھالیا۔ صاحب عالم مارہروی کے نام اپریل ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"بے مراد" صحیح اور "نامراد" غلط۔ ارے تیراستیاناس جائے "بے مراد" اور "نامراد" میں وہ فرق ہے جو زمین و آسمان میں ہے۔ "نامراد" وہ کہ جس کو کوئی مراد، کوئی خواہش، کوئی آرزو بر نہ آوے۔ "بے مراد" وہ کہ جس کا صفحۂ ضمیر نقوشِ مدعا سادہ ہو، از قسم "بے مدعا" و "بے غرض" و "بے مطلب" حَسبَةً لِلّٰہ۔ ان دونوں امروں میں کتنا فرق ہے۔ "ناپروا" اور "ناکام" اور نادرست" اور "ناچار" کہ یہ "مخفف" ناچارہ اور "ناہار" کہ یہ مخفف نہ "اہار" ہے اور "نامراد" اور "ناانصاف" یہ سب درست ہیں، ہاں کہاں گئے ہانسی والے معلّم؟"[٧]

یہی نہیں مرزا تفتہؔ کے نام ۲۷/اگست ۱۸۶۲ء کے خط میں غالبؔ نے عبدالواسع ہانسوی اور قتیلؔ کو گالیوں سے نوازا ہے۔ غالبؔ لکھتے ہیں:

"سنو میاں! میرے ہم وطن یعنی ہندی لوگ جو وادیِ فارسی دانی میں دم مارتے ہیں، وہ اپنے قیاس کو دخل دے کر ضوابط ایجاد کرتے ہیں۔ جیسا وہ گھاگھس، اُلّو عبدالواسع ہانسوی لفظ "نامراد" کو غلط کہتا ہے اور یہ اُلّو کا پٹھا قتیلؔ "صفوت کدہ و شفقت کدہ" و "نشتر کدہ" کو اور "ہمہ عالم" و "ہمہ جا" کو غلط کہتا ہے۔ کیا میں بھی ویسا ہی ہوں جو "یک زبان" کو غلط کہوں گا؟ فارسی کی میزان یعنی ترازو میرے ہاتھ میں ہے۔"[٨]

مولوی غیاث الدین نے اپنی لغت میں قتیلؔ کے کچھ حوالے دیے تھے۔ یہی بات غالبؔ کو سخت ناگوار گزری۔ اُنھوں نے نواب انورالدولہ شفقؔ کے نام غالبًا پہلی بار ۱۸۵۳ء کے خط میں قتیلؔ اور مولوی غیاث الدین کے خلاف اپنی شدید نفرت کا اظہار کیا ہے پھر پانچ سال تک

مولوی غیاث الدین کے خلاف غالبؔ کی کوئی تحریر میری نظر سے نہیں گزری۔ ۱۸۵۷ء میں جب غالبؔ 'دستنبو' لکھ رہے تھے اور اس سلسلے میں اُنھوں نے کچھ لغتیں دیکھیں تو ہندوستانی فرہنگ نویسوں کی بعض غلطیاں اُن کی نظر میں آئیں اور وہ ہندوستانی فرہنگ نویسوں کو بھی گالیاں دینے لگے۔ غالبؔ ۲۰؍ستمبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں تفتہؔ کو لکھتے ہیں:

''کاتب ان اجزا کا، جن کی رو سے کاپی لکھی جاتی ہے، فارسی کا عالم ہے۔ علم اس کا غیاث الدین رام پوری اور حکیم محمد حسین دکنی سے زیادہ ہے۔''[9]

چودھری عبدالغفور سرورؔ کے نام ایک خط میں مورخہ مارچ ۱۸۵۹ء میں غالبؔ لکھتے ہیں۔

''اصل فارسی کو اس کھتری بچے قتیلؔ علیہ ما علیہ نے تباہ کیا۔ رہا سہا غیاث الدین رام پوری نے کھودیا...... غور کرو کہ وہ خرانِ نامشخص کیا کہتے ہیں اور میں خستہ و دردمند کیا بکتا ہوں۔''[10]

غالبؔ نے جتنے فارسی شاعروں اور فرہنگ نویسوں کو برا بھلا کہا ہے بلکہ بعض کو گالیاں بھی دی ہیں، وہ سب وہ ہیں جن کا بہت پہلے انتقال ہو چکا تھا اور جن سے غالبؔ کی ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی۔ کلکتے کے ادبی معرکے کے دوران غالبؔ کے ذہن میں ایک اور اہم تبدیلی آئی اور وہ یہ کہ غالبؔ خود کو ہندوستان کا واحد مستند فارسی داں سمجھنے لگے۔ امیرِ خسرو کی فارسی دانی کا بھی اُنھوں نے اعتراف کیا ہے لیکن یہ محض ادبی مصلحت تھی ورنہ غالبؔ امیرِ خسرو کے دل سے معترف نہیں تھے۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ کلکتے کے ادبی معرکے کے دوران غالبؔ نے باندے کے اپنے دوست محمد علی خاں کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ جب مشاعرے میں سفیرِ ہرات کفایت خاں نے اُن کا کلام سن کر بلند آواز سے داد دی اور کہا 'اُس کے کلام کی قدر ہندوستان میں کون کرے گا۔ وہ تو اس لائق ہے کہ ایران کے فصحا اس کا کلام سن کر لطف اندوز ہوں پھر اہلِ محفل سے مخاطب ہو کر سفیرِ ہرات نے کہا کہ غالبؔ تم لوگوں میں مغتنم ہے شعر و شاعری سے قطع نظر، فارسی زبان کا عالم ہے۔ 'سفیرِ ہرات' کے عنوان سے اس کتاب میں جو باب شامل ہے، اس میں ثابت کیا گیا ہے کہ سفیرِ ہرات نے غالبؔ کی وہ تعریف و توصیف نہیں کی جو غالبؔ اُن سے منسوب کرتے ہیں۔ دراصل سفیرِ ہرات اس مشاعرے میں موجود ہی نہیں تھے۔ غالبؔ نے اپنے ذہنی سکون کے لیے محمد علی خاں کے نام خط میں سفیرِ ہرات سے منسوب کر کے اپنی

تعریف وتوصیف لکھی تھی اور کچھ عرصے بعد انھیں یقین ہوگیا کہ اُن میں واقعی یہ خوبیاں ہیں اور کوئی ہندستانی فارسی داں اُن کے مقابلے کا نہیں۔

اس کتاب کے اس دوسرے حصے ہیں۔اُن دو فارسی شاعروں بیدلؔ اور قتیلؔ اور دو فرہنگ نویسوں عبدالواسع ہانسوی اور مولوی غیاث الدین کے مختصر سوانح اور اُن حضرات سے غالب کے اختلاف کے وجوہ بیان کیے گئے ہیں۔

اس باب میں جو اقتباسات پیش کیے گئے ہیں وہ آگے بھی پیش کیے جائیں گے۔''غالب در مدح خود'' کے تحت بتایا گیا ہے کہ غالب اپنے فن کی کس کس طرح تعریف کرتے ہیں اور کس طرح ہندوستان کے بیشتر فارسی شاعروں اور فرہنگ نویسوں سے خود کو برتر ثابت کرتے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ غالبؔ نے تمام ہندوستانی فارسی شاعروں اور فرہنگ نویسوں کو غیر مستند ثابت کیا ہے۔''غالب کی ہندوستانی فارسی دانوں کی مدح سرائی'' کے تحت میں نے بتایا ہے کہ غالب نے اگر فارسی کے کچھ شاعروں اور فرہنگ نویسوں کو برا بھلا کہا ہے تو اپنے بعض شاگردوں، دوستوں، مداحوں اور سرپرستوں کی نظم ونثر کی تعریف میں مبالغے کی تمام حدیں پار کردی ہیں۔ایک الگ باب میں اس حقیقت میں بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

غالبؔ کی ہندوستانی فارسی دانوں کی مدح سرائی

غالبؔ نے ہندوستانی فارسی شاعروں اور فرہنگ نویسوں کو بڑی حقارت سے غیر مستند کہا ہے۔ اُن کے بہت سے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کے کسی بھی فارسی شاعر یا فرہنگ نویس کو مستند نہیں سمجھتے۔ اُن کی نظر میں تمام 'فارسی دانانِ ہند' نااہل ہیں لیکن اُنھوں نے اپنے بعض سرپرستوں، دوستوں اور شاگردوں کی زبان دانی اور ان کی شاعری کی مدح میں زمین آسمان کے قلابے ملادیے ہیں۔ کچھ لوگوں کو سلمانِ ساوَجی، ظہیرِ فاریابی، محمد شوکت بخاری، مرزا جلالائی اور طاہر وحید کے ہم پلہ اور کچھ کو امیر خسرو، سعدی، جامی، صائب، کلیم اور قدسی سے بھی بہتر بتایا ہے۔ اب چند مثالیں ملاحظہ ہو:

۴رجنوری ۱۸۵۲ء کے ایک خط میں غالبؔ اپنے شاگرد مرزا تفتہؔ کی ان الفاظ میں تعریف کرتے ہیں:

> ''یہ مصرع جو تم کو بہم پہنچا ہے، فنِ تاریخ گوئی میں اس کو کرامت اور اعجاز کہتے ہیں۔ یہ مصرع سلمان ساوَجی وظہیر کا سا ہے۔ چار لفظ اور چاروں واقعے کے مناسب۔ یہ مصرع کہہ کر اور مصرع کی فکر کرنی کس واسطے؟ واہ واہ سبحان اللہ۔''[۱]

ایک اور خط مورخہ ۹رستمبر ۱۸۶۱ء میں غالبؔ تفتہؔ کی فارسی شاعری کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میاں مرزا تفتہ۔ ہزار آفریں کیا اچھا قصیدہ لکھا ہے۔ واہ واہ چشمِ بددور، تسلسلِ معنی، سلاستِ الفاظ، ایک مصرع میں تم کو محمد اسحٰق شوکت بخاری سے توارد ہوا۔ یہ بھی محلِ فخر و شرف ہے کہ جہاں شوکت پہنچا، وہاں تم پہنچے، وہ مصرع یہ ہے:
>
> چاک گردیدم و از جیب بہ داماں رفتم[۲]

ایک اور خط میں غالبؔ تفتہؔ کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

صاحب!

تمھارا خط مع رقعۂ مردِ سخن فہم پہنچا۔ تمھاری خوشامد نہیں کرتا، سچ کہتا ہوں کہ تمھارے کلام کی تحسین کرنے والا فی الحقیقت اپنے فہم کی تعریف کرتا ہے:

کہا جاسکتا ہے کہ غالبؔ نے مرزا تفتہؔ کے خطوط میں جو کچھ لکھا، ایک شاگرد کی حوصلہ افزائی کے لیے تھا لیکن غالبؔ نے بعض ایسے لوگوں کی بھی تعریف کی ہے، جسے پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ محض خوشامد اور تملّق کے طور پر ہے۔ غالب نے مولوی نجف علی کی مرتبہ 'فرہنگِ دساتیر' پر جو تقریظ لکھی ہے، اس میں نجف علی کی غیر معمولی تعریف کی ہے۔ حالاں کہ نجف بھی ایک ہندوستانی فرہنگ نگار تھے۔

نواب انورالدولہ شفقؔ کے نام ایک خط میں غالبؔ لکھتے ہیں:

''غزلوں کو پرسوں سے پڑھ رہا ہوں اور وجد کر رہا ہوں۔ خوشامد میرا شیوہ نہیں ہے جو ان غزلوں کی حقیقت میری نظر میں ہے، وہ مجھ سے سن لیجیے اور میرے داد دینے کی داد دیجیے۔ مولانا قلقؔ نے متقدِمین یعنی امیر خسرو و سعدی و جامی کی روش کو سرحد کمال کو پہنچایا ہے اور میرے قبلہ و کعبہ مولانا شفقؔ اور مولانا ہاشمی اور مولانا عسکری، متاخرین یعنی صائبؔ و کلیمؔ و قدسیؔ کے انداز کو آسمان پر لے گئے ہیں۔ اگر تکلف اور تملّق سے کہتا ہوں تو مجھ کو ایمان نصیب نہ ہو۔ یہ جو آپ اپنے کلام کے حکّ و اصلاح کے واسطے مجھ سے فرماتے ہیں آپ میری آبرو بڑھاتے ہیں۔''[۳]

غالبؔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہؔ کی غزل کی تعریف (جو غالباً فارسی میں تھی) ایک فارسی خط میں ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''سبحان اللہ! کیا غزل فرمائی ہے کہ زمینِ شعر کو آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ بلا شبہ سخن سرائی آپ ہی کا حصّہ ہے۔ آپ کے شعر کی ستائش کا اہل ہونا ہی میرے لیے باعثِ مسرّت ہے۔''[۴]

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے نام ایک فارسی خط میں غالب نے شیفتہ کی ایک اور فارسی غزل کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر دیا ہے:

> ''واہ کیا غزل فرمائی ہے۔ شعر کی زمین کو آسمان تک پہنچا دیا ہے۔ زمین والوں پر نوازش کے مقصد سے شاعری کو آسمان سے زمین پر اُتار لائے ہیں۔ سخن دری آپ ہی کا حق ہے۔ اگر ہم آپ کی شاعری سے عہدہ برآ ہو جائیں تو ہمیں خود پر ناز کرنا چاہیے۔'' (ترجمہ) ۵؎

شیفتہ کے نام ایک فارسی خط میں شیفتہ کی ایک اور فارسی غزل کی تعریف میں غالب نے حد کر دی۔ خط کے القاب ہی سے مدح سرائی شروع کر دی ہے۔ القاب کو' رشکِ طالب و فخر غالب' خط میں لکھتے ہیں:

> '' قصیدہ گریستن میرے دل سے زبان تک پہنچ گیا اور پھر زبان سے ادا ہوا اور دل میں جگہ پائی لیکن آپ کی اس غزل کو دیکھ کر جو آج مجھے موصول ہوئی، میں وہ قصیدہ بھول گیا اور میری نظر سے گر گیا۔
>
> مجھے زبان و بیان پر قدرت نہیں ہے۔ اپنے عجزِ بیان کے باوجود اگر (آپ کے) ایک ایک شعر کی مدح میں ایک ایک قصیدہ کہوں تو میں ایسا کر سکتا ہوں۔ واہ کیا مقطع ہے۔ اس مقطع کی تعریف کن الفاظ میں کروں۔ میں آپ کا خیر خواہ اور مداح ہوں۔ مجھے آپ پر رشک آتا ہے۔ خدا کرے آپ ہمیشہ سلامت رہیں۔ کیوں کہ آپ پیکرِ سخن ہیں۔'' ۶؎ (فارسی سے ترجمہ)

شیفتہ کے نام ایک فارسی خط میں غالب زین العابدین خاں عارف اور جواہر سنگھ کی فارسی شاعری کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> '' میرے دوستوں میں سے زین العابدین خاں عارف اور جواہر سنگھ جوہر نے زمینِ طرح میں دو غزلیں پڑھیں اور دلوں

پر اپنی نغز گوئی کا نقش بٹھا دیا۔'' ۷

اس طرح کے فقرے تو غالبؔ بہت سے فارسی شاعروں کے بارے میں لکھے ہیں۔

غالبؔ نے انور الدولہ سعد الدین شفقؔ کے نام ایک فارسی خط میں شفقؔ کے فارسی کلام کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''سبحان اللہ! ساز کے ہر پردے کو جو آواز اور ہر قلم کو رفتار اور زبان کو گفتار دیتا ہے وہ یہی سخن تو ہے، اس میں کسی سخن کی گنجائش نہیں ہے۔ چوں کہ دیدہ وری دادگری ہے۔ جو سخن کی گراں مائیگی سے واقف ہے، وہ اسے پایگاہِ فرزانہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے...... ایک ایسا سفینۂ نظم و نثر اس کی طرف بصورتِ ارمغاں روانہ فرمایا ہے کہ جس کا ایک ایک لفظ تسنیم و کوثر سے دھلا ہوا ہے۔ اس نظم و نثر کی تعریف تو وہی کر سکتا ہے جو کلیم سے خراجِ نطق لے سکتا ہو اور مسیح کے لیے باعثِ رشک ہو۔'' ۸ (آزاد ترجمہ)

ولایت علی خاں ولایت و عزیم صفی پوری نے ''پنج واقعہ'' کے نام سے ایک فارسی تحریر غالبؔ کو بھیجی۔ غالبؔ اس تحریر کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اوراقِ پنج رقعہ نظر فروز ہوئے۔ خوشامد فقیر کا شیوہ نہیں۔ نگارش تمھاری (ارادت خاں واضح کی) ''پنج رقعہ'' سابق کی تحریر سے لفظاً و معناً بڑھ کر ہے...... موجد سے مقلد بہتر نکلا۔ یعنی تم نے خوب کہا۔
>
> نقاش، نقش ثانی بہتر کشد اوّل'' ۹

غالبؔ نے ایک خط میں مصطفےٰ خاں شیفتہ کی ایک غزل کی ایسے الفاظ میں تعریف کی ہے کہ اس سے زیادہ توصیف مشکل ہے۔ ایک فارسی خط میں غالبؔ شیفتہ کو لکھتے ہیں:

> ''سحابی اور فتاح آئے...... آپ کا خط دے کر واپس چلے گئے۔ بارش شروع ہوگئی۔ ابر سے قطرے برس رہے تھے اور میں آپ

کے خط سے موتی چن رہا تھا۔ یہاں تک کہ میرا گھر پانی سے اور
میرا دامن نایاب موتیوں سے بھر گیا۔ کیا غزل ہے۔ آپ نے
اس زمین کو آسماں تک پہنچا دیا اور زمین والوں پر نوازش کا یہ
طریقہ نکالا کہ شاعروں کو آسمان سے زمین پر اُتار لائے۔ سخن
سرائی آپ کا حق ہے۔ اگر ہم آپ کی شاعری کی تعریف کا حق
ادا کردیں تو ہمیں خود پر ناز ہوگا۔''[۱۰] (فارسی سے ترجمہ)

نواب کلب علی خاں کی نثر کی تعریف میں غالبؔ مبالغے سے کام لیتے ہوئے اُسے جلالای طباطبائی اور طاہر وحید کی نثر کے ہم پلّہ قرار دیا ہے:

''واقعی افتتاحِ کلام بطرزِ میرزا وحید اور پھر نگارش مطالب بیشوۂ
میرزا جلالای طباطبائی ہے، لیکن دونوں صورتوں میں دیباچۂ
اعجازِ خسروی کا رنگ جلوہ گر ہے۔ پس ناقدِ بصیر کے نزدیک یہ
نگارش طاہر وحید اور جلالای کی عبارت سے بہتر ہے۔''[۱۱]

غالبؔ کے دو فارسی شعر ملاحظہ ہوں:

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود
باد در خلوتِ شاں مشک فشاں از دمِ شاں
مومنؔ و نیرؔ و صہبائیؔ و علویؔ و انگاہ
حسرتیؔ، اشرفؔ و آزردہؔ بود اعظمِ شاں

غالبؔ نے مفتی صدرالدین آزردہؔ اور ضیاء الدین نیرؔ دونوں کی مدح میں قصیدے کہے ہیں۔ اُنھوں نے صہبائیؔ کے بعض اشعار کی تعریف بھی ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں بہادر شیفتہؔ کو ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں:

''طرحی زمین میں مولانا صہبائی کے دو تین شعر دلنشیں
تھے۔''[۱۲] (فارسی سے ترجمہ)

غالبؔ نے اپنے بہت سے سرپرستوں، دوستوں اور شاگردوں کے نظم و نثر کی تعریف کی ہے۔ تعریف و توصیف میں مبالغہ آرائی کرتے ہوئے انھیں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ وہ ہندوستانی

فارسی شاعروں اور نثر نگاروں کو طویل عرصے سے غیر مستند قرار دیتے رہے ہیں۔ میں نے اس باب میں تعریف و توصیف کی بہت کم مثالیں دی ہیں۔ ورنہ غالب کی تحریروں سے اس طرح کی مثالیں بہت زیادہ پیش کی جاسکتی ہیں۔

غالبؔ کی ان تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالبؔ ہندستان کے فارسی شاعروں اور فرہنگ نویسوں کے دل سے مخالف نہیں تھے۔ اُنھوں نے ہندستان کے فارسی شاعروں اور فرہنگ نویسوں کے خلاف جو کچھ کہا ہے، وہ قتیلؔ کی ضد میں ہے اور کلکتے میں ادبی معرکے کے اثرات کا نتیجہ ہے۔

غالبؔ اور قتیلؔ

مرزا محمد حسن قتیلؔ سے غالبؔ کی ناراضگی کے اسباب 'ادبی معرکے کے تین مشاعرے' کے عنوان کے تحت تفصیل سے بیان کیے جا چکے ہیں۔

قتیلؔ طویل عرصے تک لکھنؤ میں رہے تھے اور وہیں اُن کی وفات ہوئی تھی۔ اس شہر میں اُن کے شاگردوں اور مداحوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ جب غالبؔ کلکتے کے سفر کے دوران لکھنؤ پہنچے اور کئی مہینے وہاں قیام کیا تو ممکن نہیں کہ اُن کو اس شہر میں قتیلؔ کی شہرت اور مقبولیت کا اندازہ نہ ہو گیا ہو۔

اگر مرزا محمد قتیلؔ کے عہد کی کتابوں اور تذکروں وغیرہ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ قتیلؔ کا شمار اپنے عہد کے مقبول اور ممتاز فارسی دانوں میں ہوتا۔ پورے ہندوستان میں ان کے مداح اور معتقد اور شاگرد بہت بڑی تعداد میں تھے۔ اس عہد کا صاحبِ اقتدار طبقہ بھی قتیلؔ کے علم و فضل اور فارسی دانی کا معترف تھا اور ان کی عزت کرتا تھا۔ قتیلؔ کو فارسی سے بہت شغف تھا۔ جب وہ لکھنؤ میں تھے تو ایرانیوں سے اُن کے گہرے مراسم تھے، جن سے وہ فارسی زبان سیکھتے تھے۔ اہلِ زبان سے فارسی سیکھنے کا اُنھیں اس حد تک جنون تھا کہ زبان پر قدرت حاصل کرنے کے لیے وہ ایران بھی گئے اور اُنھوں نے وہاں کے اہلِ علم کی صحبتیں اُٹھائیں۔ اُن کے بارے میں سرسیّد کے صاحب زادے سیّد محمود کا ایک لیکچر 'سید محمود خلفِ سید احمد خاں کا لیکچر' در بارۂ اعلا مسلمانان، ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا تھا۔ اس لیکچر میں سید محمود نے مرزا قتیلؔ کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

> "فارسی دانی میں کون ...... انکار کر سکتا ہے کہ مرزا قتیل ...... نہایت اعلیٰ مرتبے کے شعرائے فارسی میں اپنے زمانے میں شمار ہوتے تھے اور ان کا نام اور...... کلام اب تک شہرۂ آفاق ہے، گو کہ مجھ کو معلوم ہے کہ اپنے زمانے کے ملک الشعرائے دہلی، مرزا غالب جن کو میرے والد ماجد بوجہ موروثی روابط خاندانی چچا کہتے تھے اور میں ان کو دادا کے لقب سے مخاطب کرتا تھا۔ انھوں نے...... قتیلؔ کے کلام پر اعتراض کیے مگر

اس قسم کے مباحث کی نقادی...... صرف عالی مرتبت فارسی ...... کے اساتذہ کا کام ہے...... یہ اظہر من الشمس ہے کہ...... جب تک ہندوستان کی فارسی دانی کی تاریخ زندہ ہے...... قتیل کا نام صفحۂ روزگار سے نہیں مٹ سکتا''۔[1]

امام بخش ناسخ سے قتیل کے بہت دوستانہ مراسم تھے۔ ناسخ بھی قتیل کے علم وفضل کے مداح تھے۔ قتیل کی وفات پر ناسخ نے ایک قطعۂ تاریخ کہا تھا، جس میں 'سعدیٔ شیرازیٔ ثانی' سے مادۂ تاریخ نکالا۔ یہ قطعہ قتیل کی وفات کے ذکر میں نقل کیا گیا ہے۔ اس مادۂ تاریخ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناسخ قتیل کو کس مرتبے کا سمجھتے تھے۔

معرکۂ کلکتہ کے سلسلے میں کچھ اور کہنے سے پہلے مناسب ہے کہ قتیل کا سوانحی خاکہ پیش کردیا جائے۔

یہ بتایا جاچکا ہے کہ قتیل کو اپنے عہد میں بہت زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل تھی۔ ہندوستان کے مختلف شہروں میں ہزاروں کی تعداد میں اُن کے شاگرد اور معتقد تھے۔ اس کے باوجود اُن کے سوانحی حالات بہت کم ملتے ہیں۔ پتا نہیں اہل ادب نے اس طرف توجہ کیوں نہیں کی۔

قتیل کا پورا نام مرزا محمد حسن قتیل تھا۔ اُن کے آباواجداد غیر مسلم تھے۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے قتیل کا نام دیوانی سنگھ، والد کا نام درگاہی مل اور دادا کا نام رائے لال جی مل تھا۔ مالک رام مرحوم کا تحقیقی کارنامہ ہے کہ اُنھوں نے بٹالہ کے بھنڈاری خاندان کے ایک بزرگ رائے بھوانی سنگھ بھنڈاری کو ڈھونڈ نکالا اور اُن سے قتیل کا شجرۂ نسب حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس شجرۂ نسب سے قتیل کا اصل نام، آباواجداد کے نام اور دیگر اہم تفصیلات معلوم ہوگئیں''۔[2]

غالب اور بعض دوسرے حضرات نے قتیل کے مسلمان ہونے سے پہلے کا نام دلوالی سنگھ لکھا ہے۔ مالک رام نے قتیل کا اصل نام دیوانی سنگھ بتایا ہے جو درست ہے۔

قتیل کے وطن پر بھی خاصا اختلاف ہے۔ تذکروں میں اُن کے وطن کے مختلف نام ملتے ہیں۔ مصحفی کو قتیل سے بہت قربت حاصل تھی۔ اُنھوں نے قتیل کے وطن کے بارے میں لکھا ہے:

''مرزا محمد حسن قتیل دراصل بزرگانش قومِ کھتری بھنڈاری پٹالی بودہ اند''۔[3]

پہلی بار مشیر احمد علوی نے مصحفی کے نام سے منسوب ایک تذکرہ 'ید بیضا' کے حوالے سے قتیل کا آبائی وطن بٹالہ بتایا ہے۔[4] مشیر احمد علوی کے اس بیان نے مالک رام صاحب کی رہنمائی کی اور اُنھوں نے نہ صرف اس کی تصدیق کی کہ قتیل کا آبائی وطن بٹالہ تھا بلکہ قتیل کے شجرۂ نسب سے پانچ پُشتوں تک اُن کے آباواجداد کا نام معلوم ہوگیا۔ مالک رام صاحب کے قول کے مطابق 'قتیل کے والد کا نام درگاہی مل ۔۔۔ دادا کا نام رائے جی مل ۔۔۔ پردادا کا نام دیوان فتح چند ۔۔۔۔۔۔۔ فتح چند کے والد کا نام صورت سنگھ اور اُن کے دادا کا نام اچنت رائے تھا۔[5]

مالک رام صاحب نے قتیل کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"قتیل کے جدِ سوئم (صورت سنگھ) بٹالہ سے ہجرت کرکے چلے گئے۔ کہاں گئے یہ نہیں معلوم ہوسکا۔ ہاں! قتیل کے والد درگاہی مل اور دادا رائے لال جی مل دونوں کی ولادت میرٹھ کے پاس باغپت میں ہوئی۔ رائے لال جی مل نے ۱۱۳۷ھ مطابق ۲۵-۱۷۲۴ء میں وفات پائی۔ قتیل کی ولادت ۱۱۷۲ھ مطابق ۵۹-۱۷۵۸ء میں دہلی میں ہوئی۔ غالب اُنھیں فریدآبادی کہتے ہیں۔ بقول مالک رام اس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ انشاء اللہ خاں انشا نے فریدآباد کو دہلی کے بازاروں اور محلوں میں شمار کیا ہے۔ قتیل فریدآباد میں رہتے تھے۔"[6]

غالب قتیل کو فریدآبادی کہہ کر اُن کی تضحیک کرتے تھے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ چوں کہ قتیل فریدآباد کے رہنے والے تھے[7] اس لیے علم وفضل اور خاص طور سے فارسی دانی سے اُنھیں کیا واسطہ ہوسکتا ہے۔

قتیل مشہور شاعر مرزا محمد باقر شہید کے شاگرد تھے۔ اُستاد کے تخلص کی نسبت ہی سے اُنھوں نے اپنا تخلص قتیل رکھا تھا۔ ممکن ہے کہ خود شہید نے یہ تخلص تجویز کیا ہو۔ قتیل کے مصحفی سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ ان ہی کی ترغیب پر مصحفی نے فارسی تذکرہ "عقدِ ثریا" مرتب کیا۔[8]

سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے کہ "واسطے دریافت کرنے محاورات اہل زبان کے برسوں ملک اصفہان میں رہا اور خوب اُسے دریافت اور معلوم کیا۔" ۸۔ (الف)

مصحفی نے لکھا ہے کہ قتیل کو عروض، قوافی، عربی اور علمِ حساب میں دستگاہ حاصل تھی۔

قتیلؔ نوجوانی ہی میں مسلمان ہو گئے تھے۔ مصحفیؔ کا قول ہے کہ قتیلؔ اٹھارہ سال کی عمر میں مسلمان ہوئے تھے۔[9]

قتیلؔ کے بارے میں بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ بہت خوددار انسان تھے۔

سعادت خاں ناصرؔ نے ان کی خودداری کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''نواب یمین الدولہ وزیر الممالک سعادت علی خاں بہادر نے معرفت میر انشاءاللہ خاں کے اسے یاد فرمایا۔ اس نے کہا'' پگڑی باندھ کر نہ جاؤں گا۔'' اس قدر شناس نے عذر اس کا قبول اور ترکِ ادب کو معاف فرمایا۔ دو ایک ساعت اس سے صحبت رکھی، وقت رخصت لبادہ ملبوس خاص تھا، عطا فرمایا۔ وقت برآمد ہونے کے سائل کو وہ ملبوس خاص اس نے ایثار کیا۔ نواب نام دار کو بے قدریِ ملبوس خاص ناگوار ہوئی۔ دوسری بار حکم اس نے حاضر ہونے کا دیا۔ میر انشاءاللہ خاں بہ منت و خوشامد اسے لے گئے۔ نواب صاحب نے خلعت گراں بہا اس کے دینے کو منگوایا۔ جب تحویل دار مع خلعت حاضر ہوا، فرمایا'' جتنے کا یہ خلعت ہو قیمت اس کی مشخص کر کے زر نقد لاؤ۔'' جب زر نقد حاضر ہوا، کہا'' نہیں خلعت بھی لاؤ۔'' اس عقیل نے یعنی قتیلؔ نے دریافت کیا کہ'' یہ عوض اس کا ہے جو پہلے مجھ سے سرزد ہوا ہے کہ ملبوسِ خاص کو تلف کیا اور سائل کو دیا۔'' عرض کی'' خداوند نعمت جو بندہ طلب کرے وہ عنایت ہو۔'' فرمایا'' کہو۔'' اس نے کہا'' پھر بندہ حضور پرنور میں طلب نہ ہو۔'' حضور سرگراں، میر انشاءاللہ خاں انگشت بہ دنداں، یہ اپنی آمد و رفت سے نہایت پشیماں، آداب بجالا کر روانہ ہوا۔''[10]

مصحفیؔ کے ایک شاگرد محمد عیسیٰ خاں تنہاؔ کا ایک شعر تھا:

گیا نہانے جو وہ بے نقاب در تہہِ آب
تو رنگِ رخ سے کھلا اک گلاب در تہہ آب

اس شعر کے بارے میں سعادت خاں ناصرؔ نے ایک دل چسپ واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"یہ طرح مرزا جعفر صاحب کے مشاعرے کی تھی، مرزا حاجی قمر اور میر مظفر حسین ضمیر کو یہ منظور ہوا کہ موجی رام کو مرزا قتیل کی زبان سے ذلت دلوایئے۔ مرزا صاحب نے (سر مشاعرہ) یہ اعتراض (اُس پر) کیے کہ گل کو گلاب کہنا غیر مستعمل اور چشمہ بیرون آب ہے اور سراب محض ریگستان ہے، ریگ سے اور موج سے کیا نسبت۔ جب مرزا صاحب نے سر مشاعرہ اس پر یہ اعتراض کیے، شیخ امام بخش ناسخ کو دلیری مرزا (صاحب) کی نہایت ناگوار گزری۔ موجی رام میاں مصحفی کے پاس التجا لے گیا۔ میاں صاحب نے کہا شاگرد کے واسطے آشنا سے بگڑنا نہ چاہیے، ایسے شاگرد بہت بن سکتے ہیں۔ جب ناسخ نے سنا کہ مصحفی حمایت موجی کی نہیں کرتے، اسے اپنے پاس بلا بھیجا اور یہ سوال وجواب ایک بند کاغذ پر لکھ کر اسے دیے۔ دوسری صحبت میں سر مشاعرہ اس نے پڑھے۔

افصح الفصحا مرزا قتیل صاحب، آپ نے جو ہیچمدان کی غزل پر یہ اعتراض کیے ہیں کہ گلاب بمعنی 'گل' گلاب غیر مستعمل اور اردو میں نہیں آیا، ایسا کلامِ لایعنی آپ سا شاعر فخر زمانہ کہے بسا عجب ہے۔ نہیں جانتے ہو کہ محاورۂ اہلِ ہند میں گلابی جاڑا اسے کہتے ہیں کہ موسم گلاب میں ہو اور گلابی رنگ کہ منسوب بہ گلاب ہو، قطع نظر میر (محمد) تقی کہ زبان ریختہ میں سہم وعدیل نہیں رکھتے تھے، فرماتے ہیں:

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

مرزا مظہر جان جاناں (فرماتے ہیں):

عالم ہے یہ پسینے کا اُس مست خواب پر
پڑتی ہے اوس جیسے سحر کو گلاب پر

میاں مصحفی:

سرخ ہے مے سے وہ چشمِ نیم خوابِ نرگسی
یا یہ باغِ حسن میں پھولا گلابِ نرگسی

دیگر:

دلی بھی طرفہ جا ہے کہ ہر اک گلی کے بیچ
بکتے ہیں کوڑی کوڑ کٹورے گلاب کے

اور آپ نے جو فرمایا ہے کہ چشمہ بیرون آب ہے، فی الحقیقت سعدی نے گلستان میں غلطی فرمائی ہے۔[11]

اس کے عہد کے فارسی گو شعرا منہ کا بدلنے کے لیے اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ مرزا مظہر جان جاناں، خاں آرزو، عبدالقادر بیدلؔ وغیرہ کے اردو اشعار تذکروں میں ملتے ہیں۔ کئی تذکرہ نگاروں نے قتیلؔ کا صرف درجِ ذیل اردو شعر ہی نقل کیا ہے:

زنگی بچے کا حسن عدیم المثال ہے
ثانی جو اس کا ہے تو کوئی خال خال ہے[12]

قتیلؔ کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اُن میں سے چند کے نام ہیں: قمرالدین احمد عرف مرزا حاجی تخلص قمر[13]، نور علی بیگ صادق[14]، جوالا پرشاد تسکین[15]، قاضی محمد صادق خاں اخترؔ[16]، محمد رضا شکوہ[17]

جب مرزا قتیلؔ کا آخری وقت آیا تو مرزا خانی نوازش اور شیخ ناسخ عیادت کے لیے گئے تو قتیلؔ سے پوچھا کہ آپ کا جانشین کس کو سمجھا جائے۔ قتیلؔ نے جواب دیا کہ طالب علی عیشیؔ کو، یہ قتیلؔ کے شاگرد تھے۔[18]

قتیلؔ کی وفات:

۲۳ ربیع الاوّل ۱۲۳۳ھ مطابق ۳۱ جنوری ۱۸۱۸ء کو بوقتِ سحر، استسقا کے مرض میں قتیلؔ کی وفات ہوئی۔[18]

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ ناسخ نے 'سعدیٔ شیرازیٔ ثانی' سے تاریخِ وفات نکالی۔

صاحب بلگرامی نے درجِ ذیل شعر سے تاریخِ وفات نکالی:

برائے ماتمِ او گشتہ اند بے سروپا
لطیفہ و سخن و شعر و نکتہ رمز و ادا [19]

اپنی پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں جب غالبؔ کلکتے پہنچے تو غالبؔ کے ایک مخالف مرزا افضل بیگ نے غالبؔ کے خلاف زبردست محاذ قائم کردیا۔ کلکتے میں قتیلؔ کے مداح بہت بڑی تعداد میں تھے۔ مرزا افضل بیگ اور ان کے ساتھیوں نے مشہور کردیا کہ غالبؔ قتیلؔ کو برا بھلا کہتے ہیں۔ کلکتے میں زبردست ادبی معرکہ ہوا، جس میں کچھ لوگوں نے غالب کے ایک شعر میں استعمال کی گئی 'ہمہ عالم' کی ترکیب پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ 'ہمہ' جمع ہے جب کہ 'عالم' واحد ہے۔ قتیلؔ کی 'چہار شربت' اور 'نہر الفصاحت' میں اس ترکیب کی سند نہیں ملتی۔ غالب کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔

اگرچہ قتیلؔ کے انتقال کو بہت عرصہ ہو چکا تھا لیکن غالبؔ کے دل میں قتیلؔ کے خلاف نفرت بیٹھ گئی اور غالبؔ، قتیلؔ کے سخت مخالف ہوگئے۔ قتیلؔ سے غالب کی مخالفت کی تفصیل اسی کتاب میں 'ادبی معرکے کے تین مشاعرے' کے باب میں دی گئی ہے۔

قتیلؔ کے خلاف غالبؔ کے دل میں جو نفرت بیٹھی تھی وہ زندگی کے آخری دم تک باقی رہی۔

جب ادبی معرکے کی وجہ سے غالبؔ کے مخالفوں کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ جب غالب بازار نکلتے تو بعض لوگ اُن پر آوازے کستے۔

مخالفوں کا منہ بند کرنے کے لیے غالبؔ کو علی اکبر خاں کے مشورے پر 'مثنوی بادِ مخالف' لکھنی پڑی، جس کا تفصیلی ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ اس مثنوی میں غالب عجیب و غریب تضاد کا شکار نظر آتے ہیں۔ وہ پہلے تو قتیلؔ اور اُن کی فارسی دانی کا مضحکہ اُڑاتے ہیں لیکن جب مخالفوں کا خیال آتا ہے تو وہ قتیلؔ کی مدح سرائی شروع کردیتے ہیں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ غالبؔ کو ان اشعار میں تضاد نظر نہیں آتا۔ اس مثنوی کا نام پہلے 'آشتی نامہ' تھا۔ اسی طرح یہ مثنوی کلیات میں شامل کرتے وقت اس کا نام 'بادِ مخالف' کردیا تھا۔ وہ اگر چاہتے تو کلیات میں شامل کرنے سے پہلے مثنوی میں سے وہ اشعار نکال سکتے تھے جو قتیلؔ کی مدح میں تھے۔ اب یہ اشعار ملاحظہ ہوں

غالبؔ نے اپنی 'مثنوی بادِ مخالف' میں قتیلؔ کے بارے میں لکھا ہے:

ویں کہ در پیشگاہِ بزمِ سخن

بزباں ہا فتادہ است زمن

کہ فلاں با قتیلؔ نیکو نیست

مگسِ خوانِ نعمتِ او نیست

زلّہ بردارِ کس چرا باشم

من ہمایم مگس چرا باشم

فیضے از صحبتِ قتیلم نیست

رشک بر شہرتِ قتیلم نیست

نہ ہوا خواہی نہ دشمنی

درمیانست پائے ہم فنی

مگر آناں کہ پارسی دانند

ہم بریں عہد و رائے و پیمانند

کہ ز اہلِ زباں نبود قتیلؔ

ہرگز از اصفہاں نبود قتیلؔ

لاجرم اعتماد را نسزد

گفتہ اش استناد را نسزد

غالبؔ نے قتیلؔ کے بارے میں یہ شعر بھی کہا۔

آں کہ طے کردہ ایں مواقف را

چہ شناسد قتیلؔ و واقفؔ را

اس کے بعد ہی غالبؔ کو خیال آیا کہ ان اشعار سے حامیانِ قتیلؔ کی مخالفت اور بڑھ جائے گی،

اس لیے اُنھوں نے قتیلؔ کی مدح میں جو اشعار کہے اُن میں مبالغہ آرائی کی حد کردی۔ اب وہ اشعار ملاحظہ ہوں:

میشوم خویش را بصلحِ دلیل
میسرایم نوائے مدحِ قتیلؔ

تا نماند از من دگر گلۂ
رسد از پیروانِ وی صلۂ

گفتن آئینِ ہوشیاری نیست
لیک دانستن اختیاری نیست

گرچہ ایرانیش نخواہم گفت
سعدیؔ ثانیش نخواہم گفت

لیک از من ہزار بار بہ است
از من و ہمچو من ہزار بہ است

من کفِ خاک و او سپہرِ بلند
خاک را کے رسد بہ چرخ کمند

وصف او حدِ چوں منے نبود
مہر در خوردِ روزنے نبود

مرحبا ، سازِ خوش بیانیِ او
حبّذا شورِ نکتہ دانیِ او

نظمش ، آب حیات را مانَد
دَر رَوانی ، فرات را مانَد

نثرِ او نقشِ بالِ طاؤس است
انتخابِ صراح و قاموس است
پادشاہی کہ در قلمروِ حرف
کردہ ایجاد نکتہ ہائے شگرف
خامہ ہندوی پارسی دانش
ہندیاں سر بخطِ فرمانش
ایں رقمہا کہ ریخت کلکِ خیال
بود سطرے ز نامۂ اعمال

ظاہر ہے کہ ان مدحیہ اشعار میں غالبؔ نے جو کچھ کہا ہے وہ اُن کے دل کی آواز نہیں ہے بلکہ مخالفوں کے دباؤ کی مجبوری سے تعریف وتوصیف کی گئی ہے۔

غالبؔ نے کلکتے میں اکیس اشعار کا ایک قطعہ کہا تھا جو' گلِ رعنا' میں شامل ہے۔ کلکتے سے آنے کے بعد اُنھوں نے قطعے میں اس شعر کا اضافہ کر کے قتیلؔ کے سابق مذہب کا مذاق اُڑایا ہے۔ وہ شعر ہے:

غالبِ سوختہ جاں را چہ بہ گفتا آری
بہ دیارے کہ ندانند نظیریؔ ز قتیلؔ

'گلِ رعنا' میں غالبؔ کا بائیس اشعار کا ایک فارسی قطعہ ہے۔ اسی قطعے میں سفرِ کلکتہ اور کلکتے کے ادبی معرکے کے حوالے ہیں۔ اس قطعے میں شیخ علی حزیںؔ کے دو شعر تضمین کیے ہیں۔ بعد میں غالب نے اس قطعے میں ایک شعر کا اضافہ کیا ہے۔ شعر ہے:

لیک ناید زمن کہ در گفتار
مدحت لالہ سُورداس کنم

ظاہر ہے کہ اس میں قتیلؔ کی طرف واضح اشارہ ہے۔

کسی نے غالبؔ کو بتایا کہ مولوی احمد علی احمد، غالبؔ کی 'قاطع برہان' کے جواب میں 'موید برہان' نام سے کتاب لکھ رہے ہیں،، جس میں قتیلؔ کی تعریف کی گئی ہے۔ غالب نے سترہ اشعار کا ایک قطعہ لکھا، جس کے تین شعر درجِ ذیل ہیں:

مولوی احمد علی احمدؔ تخلص نسخۂ
در خصوصِ گفتگوئِ پارس انشا کردہ است

در جہاں توأم بود روے وے و پشتِ قتیلؔ
پیشواے خویش ہندو زادۂ را کردہ است

با قتیلؔ و جامعِ برہان و لالہ ٹیکچند
لابہ و سوگیری و لطف و مدارا کردہ است

داوری گاہے بنا فرمود و دروے ہرسہ را
منصف و صدرِ امین و صدر اعلیٰ کردہ است

غرض یہ ہے کہ غالبؔ ساری زندگی قتیلؔ کو برا بھلا کہتے رہے، اُن کو گالیاں دیتے رہے، اُس قصور کے لیے جو قتیلؔ سے سرزد ہی نہیں ہوا۔ غالبؔ کی قتیلؔ سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی۔ غیر معمولی شہرت اور مقبولیت ہی قتیلؔ کا قصور تھا، جس کی سزا غالب زندگی بھر اُنھیں دیتے رہے۔

دل چسپ حقیقت یہ ہے کہ غالبؔ نے کلکتے جانے سے پہلے قتیلؔ کے خلاف ایک لفظ نہیں کہا۔ چوں کہ قتیلؔ کی عمر کا بڑا حصہ لکھنؤ میں گزرا تھا۔ اس لیے اِمکان ہے کہ غالب اور قتیلؔ کی کبھی ملاقات نہ ہوئی ہو۔ کلکتے کے ادبی معرکے کے تقریباً دس سال بعد تک اگرچہ غالب خاموش رہے لیکن قتیلؔ کے خلاف نفرت کی آگ اُن کے دل میں سلگتی رہی، جس کا ثبوت وہ خیالات ہیں، جن کا غالب نے مختلف لوگوں کے نام اپنے خطوط میں اظہار کیا ہے۔

غالبؔ نے کلکتے سے آنے کے بعد شاید پہلی بار شیخ امام بخش ناسخؔ کے نام ایک فارسی خط میں قتیلؔ سے اپنی نفرت کا اظہار کیا ہے۔

شیخ ناسخؔ نے غالبؔ کو مشورہ دیا تھا کہ وہ مہاراجا چندولال کے پاس چلے جائیں تو اُن کی مالی

دشواریاں دور ہو سکتی ہیں۔ غالبؔ کو معلوم ہو چکا تھا کہ مہاراجا چندولال فارسی میں قتیلؔ اور اردو میں شاہ نصیر کے مداح ہیں، اس لیے قدرے تلخ لہجے میں ناسخؔ کو جواب دیتے ہیں:

''چندولال میرے زمزموں (شاعری) سے کیا واقف اور میرے طرز اور روش کو کیا جانتے ہیں جو فارسی میں قتیلؔ کو استاد سمجھتے ہوں۔ وہ غالبؔ کو کیا سمجھیں اور جو اردو میں نصیر (شاہ نصیر) کے مداح ہوں، اُن کی نظر میں ناسخؔ کیا ہیں۔ اس وقت اُن کی عمر اسّی سال سے زائد ہے، میں جب تک اُن کے پاس پہنچوں وہ جہنم رسید ہو چکے ہوں گے۔''[۲۰] (فارسی سے ترجمہ)

ناسخؔ کا انتقال ۱۶/اگست ۱۸۳۸ء[۲۱] کو ہوا تھا، جس کا مطلب ہے کہ یہ خط ۱۸۳۸ء سے پہلے کا اور کلکتے کے ادبی معرکے کے تقریباً دس بعد کا ہے۔

غالبؔ نے اپنے بعض شاگردوں اور دوستوں کے خطوط میں قتیلؔ پر بے وجہ اس طرح لعن طعن کی ہے، جس کا کوئی موقع نہیں تھا۔ مثلاً مئی ۱۸۴۸ء کے ایک خط میں مرزا ہرگوپال تفتہؔ کو لکھتے ہیں:

''ظاہراً تم خود فکر نہیں کرتے اور حضرات کے بہکانے میں آجاتے ہو۔ وہ صاحب تو بیش تر اس نظم و نثر کو مہمل کہیں گے، کس واسطے کہ اُن کے کان اس آواز سے آشنا نہیں، جو لوگ قتیلؔ کو اچھا لکھنے والوں میں جانیں گے، وہ نظم و نثر کی خوبی کو کیا پہچانیں گے۔''[۲۲]

ناسخؔ اور مرزا ہرگوپال تفتہؔ کے نام ان دونوں خطوط میں قتیلؔ کے بارے میں غالبؔ نے صرف یہ کہا ہے کہ جو لوگ قتیلؔ کو اچھا لکھنے والوں میں جانیں گے وہ نظم و نثر کی خوبی کو کیا پہچانیں گے۔

چودھری عبدالغفور سرورؔ کے نام مارچ ۱۸۵۹ء کے خط میں غالبؔ لکھتے ہیں:

''قتیلؔ اور غیاث الدین ملائے مکتبی رام پوری کی سی قسمت کہاں سے لاویں کہ تم جیسا شخص میرا معتقد ہو اور میرے قول کو معتمد سمجھے۔''[۲۳]

غالبؔ نے چودھری عبدالغفور سرورؔ کے نام مارچ ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں غلط اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”قتیل کو اساتذہ سلف کے کلام سے قطعاً آشنائی نہیں۔“ [۲۴]

چودھری عبدالغفور سرور کے نام مارچ ۱۸۵۹ء میں غالب نے قتیل کو فرید آباد کا کھتری دلوالی سنگھ ثم متخلص بہ قتیل لکھا ہے۔ دراصل غالب کو اس بات پر غصہ تھا کہ چودھری عبدالغفور سرور نے قتیل کو مرحوم لکھا ہے۔ غالب لکھتے ہیں:

”زبان کام قلم سے لینا دشوار ہے یعنی جو کچھ کہا چاہیے اُس کو کیوں کر لکھا چاہیے۔ وہ بات کہاں کہ کچھ میں نے عرض کیا، کچھ آپ نے فرمایا، دو چار باتوں میں جھگڑے نے انجام پایا۔ خیر، دولتِ ہم زبانی کہاں میسّر؟ آپ کے حکم بجالانے کو اپنا شرف جانتا ہوں اور ”عرض کرتا ہوں کہ نظامی اب ایسا ہوا کہ جب تک فرید آباد کا کھتری دلوالی سنگھ ثم متخلص بہ قتیل، جس کو حضرت نے مرحوم لکھا ہے، اُس کی تصدیق نہ کرے، تب تک اُس کا کلام قابلِ استناد نہ ہو۔ قتیل کو اساتذۂ سلف کے کلام سے قطعاً آشنائی نہیں۔ اُس کے علمِ فارسی کا مآخذ اُن لوگوں کی تقریر ہے کہ جو نواب سعادت علی خاں کے وقت میں ممالکِ غربی کی طرف سے لکھنؤ میں آئے اور ہنگامہ آرا ہوئے۔ بیشتر اُن میں سادو (کذا) کشمیری یا کابلی و قندھاری و مکرانی۔ احیاناً کوئی عامۂ اہلِ ایران سے بھی ہو۔ مانا کہ عظمائے ایران میں سے بھی کوئی ہوگا۔ تقریر اور ہے تحریر اور ہے۔ اگر تقریر بعینہ تحریر میں آیا کرے تو خواجہ وطاط اور شرف الدین علی یزدی اور حسین واعظ کاشفی اور طاہر وحید، یہ سب نثر میں کیوں خونِ جگر کھایا کرتے۔ اُسی طرح کی نثریں جو، لالہ دلوالی سنگھ قتیل متوفی نے بہ تقلیدِ اہلِ ایران لکھی ہیں، کیوں نہ رقم فرمایا کرتے؟“ [۲۵]

قتیل پورے ہندوستان میں فارسی کے ممتاز شاعر اور فارسی داں کی حیثیت سے مشہور تھے لیکن غالب انھیں شاعر ہی تسلیم نہیں کرتے تھے۔ قتیل کے بارے میں غالب کا خیال تھا کہ اُنھوں نے فارسی کو بگاڑ دیا ہے۔ وہ قتیل کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو غالب جیسے عظیم شاعر کو زیب نہیں دیتے۔ اُنھوں نے اپریل ۱۹۵۹ء کے ایک خط میں صاحب عالم مارہروی کو لکھا ہے کہ:

''اگر قابلِ تحقیق ہو تو میرے بیان پر غور کرو اور جو عبدالواسع اور غیاث الدین اور عبدالرزاق ان ناموں کی شوکت نظر میں ہے تو تم جانو۔ ایک شخص بھیک مانگتا ہے۔ باپ نے اُس کا نام میر بادشاہ رکھ دیا ہے اصل فارسی کو اس کھتری بچے قتیل علیہ ماعلیہ نے تباہ کیا۔ رہا سہا غیاث الدین رام پوری نے کھودیا۔ ان کی سی قسمت کہاں سے لاؤں، جو صاحبِ عالم کی نظر میں اعتبار پاؤں؟ خالصاً للہ۔ غور کرو کہ وہ خرانِ ناشخص کیا کہتے ہیں اور میں خستہ و دردمند کیا بکتا ہوں۔ واللہ نہ قتیل فارسی شعر کہتا ہے اور نہ غیاث الدین فارسی جانتا ہے۔ میرا یہ خط پڑھو۔ یہ نہیں کہتا کہ خواہی نخواہی پڑھو۔ قوتِ ممیزہ سے کام لو، ان غولوں پر لعنت کرو۔ سیدھی راہ پر آجاؤ۔''[۲۶]

اسی خط میں غالب لکھتے ہیں:

''نہیں کہتا کہ خواہی نہ خواہی میری تحریر کو مانو مگر اس کھتری بچے سے اور اس معلّم (عبدالواسع) سے مجھ کو کم تر نہ جانو۔ عربی کا حرف اور ہے اور فارسی کا قاعدہ اور ہے۔ سمجھو یا نہ سمجھو تم کو اختیار ہے۔ عقل کو کام فرماؤ، غور کرو۔ سمجھو عبدالواسع پیغمبر نہ تھا۔ قتیل برہما نہ تھا۔ واقف غوث الاعظم نہ تھا۔ میں یزید نہیں ہوں، شمر نہیں ہوں۔ مانتے ہو مانو نہ مانو، تم جانو۔''[۲۷]

غالب موقع بے موقع فارسی کے ہندوستانی فرہنگ نویسوں ادیبوں اور شاعروں کو برا بھلا کہنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ چودھری عبدالغفور سرور کے نام ایک خط مورخہ مارچ اپریل ۱۸۵۹ء میں غالب لکھتے ہیں:

''زہے سیاہی فالیز، آرزو، فقیر اور شیدا اور بہار وغیرہم انھیں میں آگئے۔ ناصر علی اور بیدل اور غنیمت۔ ان کی فارسی کیا؟ ہر ایک کا کلام بہ نظرِ انصاف دیکھیے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا؟ منت اور مکین اور واقف اور قتیل یہ تو اس قابل بھی نہیں کہ ان کا نام لیجیے۔ ان حضرات میں عالم علومِ عربیہ کے شخص ہیں، خیر ہوں، فاضل کہلائیں۔ کلام میں اُن کے مزہ کہاں؟ ایرانیوں کی سی ادا کہاں؟''[۲۸]

قاضی عبدالجمیل جنونؔ بریلوی کو ۸؍ستمبر ۱۸۵۹ء کو غالبؔ لکھتے ہیں:

"غیاث الدین رام پور میں ایک ملائے مکتبی تھا۔ ناقلِ عاقل، جس کا ماخذ اور مستند علیہ قتیلؔ کا کلام ہوگا، اُس کا فنِ لغت میں کیا فرجام ہوگا؟

کیستم من کہ تا ابد بزیم

لَاحَولَ وَلَاقوّۃ۔ یہ مصرع میرا نہیں۔ "تا ابد بزیم" یہ فارسی لالہ قتیلؔ کی ہے۔ [۲۹]

پہلے غالبؔ چند فارسی شاعروں اور فرہنگ نویسوں ہی کے خلاف تھے لیکن ۱۸۶۲ء تک پہنچتے پہنچتے غالب تمام فارسی فرہنگ نویسوں کے بھی خلاف ہو گئے۔ مولوی ضیاء الدین خاں ضیا دہلوی کے نام غالب ایک خط میں لکھتے ہیں:

"۸۰۰ یا ۹۰۰ ہجری میں ہوسناک لوگ فارسی کے فرہنگ لکھنے پر متوجہ ہوئے۔ نہ ایک نہ دو بلکہ ہزار دو ہزار فرہنگیں فراہم ہوگئیں۔ یہاں تک کہ قتیلؔ نو مسلم لکھنوی اور غیاث الدین ملائے مکتب دار رام پوری اور کوئی روشن علی جون پوری اور کہاں تک کہوں کون کون جس، جس کے جی میں آئی وہ متصدی تحریرِ قواعدِ انشا ہوگیا۔" [۳۰]

۱۸۲۸ء سے ۱۸۶۱ء تک غالبؔ نے قتیلؔ سے اختلاف تو کیا ہے لیکن انھیں برا بھلا نہیں کہا۔

۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے دوران غالبؔ کو مجبوراً خانہ نشیں ہونا پڑا۔ اُن کے دوستوں ،معتقدوں اور شاگردوں کا آنا جانا بند ہوگیا تو اُنھوں نے علمی مشاغل میں ڈوب کر اپنی تنہائی ناکام انقلاب کے غم کو دور کرنے کی کوشش کی۔ اس دوران اُنھوں نے اپنا روزنامچہ "دستنبو' کے نام سے لکھا۔ اس زمانے میں اُن کے پاس مولوی محمد حسین تبریزی کی مشہور فارسی لغت 'برہانِ قاطع' اور 'دساتیر' دو کتابیں تھیں۔ غالب نے 'برہانِ قاطع' کا غور سے مطالعہ کیا تو انھیں بہت سی غلطیاں نظر آئیں۔ اُنھوں نے ان غلطیوں کو اکٹھا کر کے' قاطع برہان' کے نام سے ایک کتاب لکھ لی، جو ۱۸۵۸ء میں مکمل ہوگئی تھی۔ غالبؔ اس کے مسودے پر نظر ثانی کرتے رہے اور غالب کو غلط یا صحیح اس لغت میں بہت سی غلطیاں نظر آئیں۔ وہ پہلے ہی ہندوستانی فارسی شاعروں کے خلاف تھے۔ اب ہندوستانی فارسی فرہنگ نویسوں کے بھی خلاف ہو گئے۔

اگست ۱۸۵۸ء تک غالب 'برہانِ قاطع' کے جواب میں اپنی کتاب 'قاطعِ برہان' کا پہلا مسودہ مکمل کر چکے تھے۔ کیوں کہ اگست ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں غالب نے میر مہدی مجروح کو لکھا ہے کہ:

"قاطعِ برہان' کے مسودے سب میں نے پھاڑ ڈالے۔ اس واسطے کہ ہر نظر میں اُس کی صورت بدلتی گئی۔ وہ تحریر بالکل مغشوش ہوگئی۔ ہاں اس کی نقلیں صاف، کہ جن میں کسی طرح کی غلطی نہیں نواب صاحب نے کر لی ہیں۔"[۳۱]

یہی وہ زمانہ ہے جب ہندوستانی فارسی دانوں کے خلاف غالب کے رویے میں شدت پیدا ہوئی۔ ۴/اکتوبر ۱۸۶۱ کو غالب نے تفتہ کو جو خط لکھا ہے اس میں ہندوستان کے فارسی دانوں کے بارے میں غالباً پہلی بار دشنام طرازی سے کام لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میں 'برہان' کا خاکہ اُڑا رہا ہوں "چہار شربت" اور "غیاث اللغات" کو حیض کا لتا سمجھتا ہوں، ایسے گم نام چھوکروں سے کیا مقابلہ کروں گا۔ "برہان قاطع" کے اغلاط بہت نکالے ہیں۔ دس جز کا ایک رسالہ لکھا ہے اُس کا نام "قاطع برہان" رکھا ہے۔"[۳۲]

۱۸۶۲ء میں غلام غوث خاں بے خبر کو غالب لکھتے ہیں:

"آپ جب تک کلامِ اہلِ زبان میں نہ دیکھ لیں۔ اُس کو جائز نہ جانیے گا مگر کلام سعدی و نظامی و حزیں اور اُن کے امثال اور نظائر کا معتمد علیہ ہے نہ آرزو اور واقف اور قتیل وغیر ہم کا۔"[۳۳]

چودھری عبدالغفور سرور کے نام مورخہ جولائی ۱۸۶۳ء کے ایک خط میں ہندوستان کے دو فارسی شاعروں ممتاز و اختر کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے قتیل اور واقف سے لے کر بیدل اور ناصر علی تک سب کو کم مرتبہ ثابت کر کے طنز کا شکار بنایا ہے۔ غالب لکھتے ہیں:

"میرا قیاس اس کا مقتضی ہے کہ پیرومرشد حضرت صاحبِ عالم مجھ سے آزردہ ہیں اور وجہ اُس کی یہ ہے کہ میں نے ممتاز و اختر کی شاعری کو ناقص کہا تھا۔ اس رقعے میں ایک میزان عرض کرتا ہوں۔

> حضرت صاحب ان صاحبوں کے کلام یعنی ہندیوں کے اشعار کو قتیل اور واقف سے لے کر بیدل اور ناصر علی تک، اس میزان میں تولیں۔ میزان یہ ہے۔ رودکی و فردوسی سے لے کر خاقانی و ثنائی و انوری وغیرہم تک ایک ایک گروہ، ان حضرات کا کلام تھوڑے تفاوت سے ایک وضع پر ہے پھر حضرت سعدی طرزِ خاص کے موجد ہوئے سعدی و جامی ہلالی۔ یہ اشخاص متعدد نہیں۔ فغانی اور ایک شیوۂ خاص کا مبدع ہوا۔ خیال ہائے نازک و معانی بلند لایا۔ اس شیوے کی تکمیل کی ظہوری و نظیری و عرفی و نوعی نے۔" سبحان اللہ قالبِ سخن میں جان پڑگئی۔ اس روش کو بعد اس کے صاحبانِ طبع نے سلاست کا چربا بادیا۔ صائب و کلیم و سلیم و قدسی و حکیم شفائی اس زمرے میں ہیں۔ رودکی و اسدی و فردوسی، یہ شیخ سعدی کے وقت میں ترک ہوا اور سعدی کی طرز نے بہ سبب سہل ممتنع ہونے کے رواج نہ پایا۔ فغانی کا انداز پھیلا اور اُس میں نئے نئے رنگ پیدا ہوتے گئے تو اب طرزیں تین ٹھہری ہیں۔ خاقانی اُس کے اقران، ظہوری اُس کے امثال۔ صائب اُس کے نظائر۔ خالصاً للہ ممتاز و اختر وغیرہم کا کلام ان تین طرزوں میں سے کس طرز پر ہے؟ بے شبہہ فرماؤ گے کہ یہ طرز اور ہی ہے۔ پس تو ہم نے جانا کہ اُن کی طرز چوتھی ہے، کیا کہنا ہے، خوب طرز ہے، اچھی طرز ہے مگر فارسی نہیں ہے، ہندی ہے۔ دارا الضرب شاہی کا سکہ نہیں ہے، ٹکسال باہر ہے۔ داد، داد، انصاف، انصاف"۔[۳۴]

غالب کے ملا غیاث الدین سے ناراض ہونے کے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ غیاث الدین نے اپنی لغت 'غیاث اللغات' میں قتیل کے حوالے دیے تھے۔ غالب نے اپنی تصنیف 'تیغِ تیز' (مطبوعہ ۱۸۶۷ء) میں قتیل کے ساتھ ملا غیاث الدین کو بھی لپیٹ لیا۔ غالب 'تیغِ تیز' میں لکھتے ہیں:

> "مولوی برہان پرست فارسی مدان صفحہ ۱۰۱ میں موید برہان کے 'فاژہ' و 'خمیازہ' کی بحث میں لکھتا ہے۔ "ظنِ غالب آنکہ غالب عربی مدان را غیاث گمراہ کردہ باشد" عیاذاً باللہ اگر غالب جامعِ غیاث اللغات کو

آدمی جانتا ہوتو وہ خود آدمی نہیں۔ایک بار ''علم شے بہ از جہل شے' کی رعایت کر کے اس کتاب کو سراسر دیکھ لیا۔جب دیکھا کہ جابجا قتیلؔ کے کلام کا حوالہ دیتا ہے اور مآخذ اُس کا فنِ لغت میں 'چہار شربت' اور 'نہر الفصاحت' ہے۔کتاب پر اور مولف پر لعنت بھیجی۔''۳۵ (فارسی سے ترجمہ)

قتیلؔ پر اعتراضات

غالبؔ نے قتیلؔ پر کئی اعتراض کیے ہیں، کچھ اُن الفاظ پر جو قتیلؔ نے استعمال کیے ہیں اور کچھ اُن الفاظ پر جو خود اُن کے شاگردوں نے استعمال کیے تھے۔شاگردوں کی اِصلاح کرتے ہوئے غالب نے لکھا ہے کہ اس طرح کے الفاظ قتیلؔ استعمال کرتے ہیں۔یہ سب اعتراضات قتیلؔ کی وفات کے تقریباً تیس سال بعد کیے گئے تھے۔

نثرِ مرجز

غالبؔ نے نثر کی اقسام پر اپنے کئی خطوط میں گفتگو کی ہے۔خاص طور سے خواجہ عبدالغفور سرورؔ کے نام خطوط میں بحث مفصّل ہے۔اُنھوں نے واضح الفاظ میں تو نہیں لکھا لیکن ان کے اردو خطوط کی بعض عبارتوں سے اندازہ ہوتا ہے۔اُن کا خیال تھا کہ قتیلؔ نے نثرِ مرجز کی تعریف غلط لکھی ہے۔خواجہ عبدالغفور سرورؔ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''آمدم بر سرِ مدعا، نثرِ مرجز اُس کو کہتے ہیں: کہ وزن ہو اور قافیہ نہ ہو، مقابل مقفّیٰ کے، کہ قافیہ اور وزن نہ ہو اور یہاں یہ بھی سمجھا چاہیے کہ وزن میں قید منظور نہیں، مثلاً حضرت نظامی علیہ الرحمۃ کی نثر کا وزن یہ ہے: مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن ۔حضرت ظہوری علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: ''راتبش سرو بن گلشن فتح، خنجرش ماہی دریاے ظفر۔'' یہ نثر مرجز ہے۔وزن اس کا: فعلاتن فعلاتن، کاتبوں نے مقفّیٰ کرنے کے واسطے صورت بدل دی ہے اور کچھ تصرف کیا ہے کہ نثر نہ مرجز رہی نہ مقفّیٰ بنی۔ چناں چہ اساتذۂ فن ''لَن تَنَالُوا البِرَّ حَتّٰی تُنفِقُوا!'' اس آیت سراسر ہدایت کو نثر موجز کہتے ہیں اور اس کا وزن

ہے: فاعلاتن فاعلاتن فاعلن۔ ''**ویرزقہ من حیث لایحتسب**۔'' اس کا وزن: فعولن فعولن فعولن فعول۔ بندے کی تحقیقات یہی ہے کہ نثر تین قسم پر ہے مقفیٰ: قافیہ ہے اور وزن نہیں، مرجز: وزن ہے اور قافیہ نہیں۔ عاری: نہ وزن ہے نہ قافیہ۔ مسجع ہی مقفیٰ ہے کہ دونوں فقروں میں الفاظ ملائم اور مناسب ہم دگر ہوں۔ نظم میں یہ صنعت آپڑے تو اُس کو مرصّع کہتے ہیں اور نثر اس صنعت پر مشتمل ہو تو اُس کو مسجع کہتے ہیں۔''[۳۸]

مرزا قتیل نے 'اقسام ثلثہ نثر' بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''نثر را سہ گونہ بنا گذاشتہ اند،

قتیل کے قول کے مطابق نثریں تین طرح کی ہوتی ہیں (۱) عاری اُس نثر کو کہتے ہیں جس میں وزن ہوتا ہے نہ قافیہ (۲) مسجع وہ نثر ہوتی ہے جس میں وزن نہیں ہوتا لیکن قافیہ ہوتا ہے۔ (۳) مرجز، وہ نثر ہے جس میں وزن ہوتا ہے لیکن قافیہ نہیں ہوتا۔''[۳۹]

اس موضوع پر علمی بحث کرنا میرے لیے ممکن نہیں لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ اس مسئلے پر غالب کا ذہن صاف نہیں ہے۔ عاری اور نثر مرجز کے بارے میں اُن کی بالکل وہی رائے ہے جو مرزا قتیل کی ہے۔ اگرچہ مسجع کی تعریف میں غالب اُلجھے ہوئے ہیں پھر بھی خواجہ عبدالغفور سرور کے نام خط میں نثر کی ان تینوں اقسام کے بارے میں ایک ایک لفظ وہی کہتے ہیں جو مرزا قتیل نے کہا ہے۔ اوپر کے اقتباس میں غالب نے کہا ہے:

''نثر تین قسم پر ہے۔ مقفیٰ: قافیہ ہے اور وزن نہیں، مرجز: وزن ہے اور قافیہ نہیں، عاری: نہ وزن ہے نہ قافیہ۔''

اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع پر غالب کا اعتراض برائے اعتراض ہے۔

کدہ

چودھری عبدالغفور سرور کے نام ایک خط (مارچ ۱۸۵۹ء) میں غالب لکھتے ہیں:

''یہ شخص (قتیلؔ) مدعی ہے کہ ''کدہ'' کا لفظ سوائے پانچ چار اسم کے اور اسم کے ساتھ ترکیب نہیں پاتا۔ پس'' آرزوکدہ''اور'' دیو کدہ'' اور''نشتر کدہ'' اور امثال اس کے جو ہزار جگہ اہلِ زبان کے کلام میں آیا ہے وہ نادرست ہے۔ میں اور آپ بیٹھیں اور اس کے خرافات پڑھے جائیں اور جو میں عرض کروں، اُس پر حضرت غور فرمائیں، تب معلوم ہو کہ یہ کتنا لغواور فارسی دانی سے کتنا بیگانہ ہے۔''[۴۸]

''کدہ'' کے استعمال کے بارے میں غالبؔ نے مرزا تفتہ کو ۱۷/اگست ۱۸۶۲ء کو جو خط لکھا تھا اس میں عبدالواسع ہانسوی اور قتیلؔ کو برا بھلا کہا بلکہ قتیلؔ کو 'الو کا پٹھا' تک کہہ دیا۔ غالبؔ لکھتے ہیں:

''سنو میاں! میرے ہم وطن یعنی ہندی لوگ جو وادیٔ فارسی دانی میں دم مارتے ہیں، وہ اپنے قیاس کو دخل دے کر ضوابط ایجاد کرتے ہیں۔ جیسا وہ گھاگھس، اُلو عبدالواسع ہانسوی لفظ''نامراد'' کو غلط کہتا ہے اور یہ اُلو کا پٹھا قتیلؔ ''صفوت کدہ و شفقت کدہ'' و''نشتر کدہ'' کو اور ''ہمہ عالم'' و''ہمہ جا'' کو غلط کہتا ہے۔ کیا میں بھی ویسا ہی ہوں جو ''یک زبان'' کو غلط کہوں گا؟ فارسی کی میزان یعنی ترازو میرے ہاتھ میں ہے۔ لِلّٰہِ الحمدُ ولِلّٰہِ الشکرؔ؟''[۵۰]

غالبؔ نے' قاطعِ برہان'' میں 'کدہ' کے موضوع پر قتیلؔ کے ایک شاگرد سے گفتگو کی، جس کی تفصیل ان الفاظ میں لکھی ہے:

''یکے از پرورش آموختگان قتیل نومسلم در کلکتہ بمن گفت استاد...... جزا سے چند کہ شمار آں از پنج یا شش نگذرد، ماقبل کردہ آوردن...... جائز نہ مے شمارد۔ پاسخ گزاردم کہ بے خبراں بگفتۂ چوں خودے کار برخود تنگ گیرند، آگاہ دلاں راچہ افتادہ کہ توقع ناروا راپذیرند۔ حیرتکدہ وظلمت کدہ...... وامثال اینہا درنظم ونثر اہل عجم بسیار است۔''[۴۶]

غالبؔ کے اس اعتراض کے بارے میں قاضی عبدالودود لکھتے ہیں:

''کدہ' کا ذکر 'بادِ مخالف' میں نہیں مگر بقول خود تلمیذ قتیلؔ کو جو جواب

اُنھوں نے دیا ہے اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ مشاعرے میں قتیلؔ کے قول کی بنا پر اعتراض ہوا ہوگا تو کس قدر بپھر گئے ہوں گے۔ لفظ زیرِ بحث کے متعلق قتیلؔ نے 'نہر الفصاحت' [۴۳] میں لکھا ہے کہ ''کدہ'' ۵ لفظوں' بت، غم، آتش، مے، گلشن کے ساتھ ملحق ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ مسموع نہیں؟ آبکدہ نہ جانے درست ہے یا غلط۔ حاشیے کی عبارت یہ ہے: ''یعنی ایں با اصول اند (سوائے ایں...... آنچہ در کلامِ اساتذہ یافتہ شود فروع اینہا باشد، عصر مقصود نیست و فروع دراصل داخل است'' یہ حاشیہ نہ معلوم کس کا لکھا ہوا ہے، اگر قتیلؔ کا ہے تو گویا اُنھوں نے اپنا دعویٰ واپس لے لیا ہے۔ اس صورت میں متن میں جو کچھ ہے وہ لا حاصل ہے۔ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ قدما کے یہاں صرف مرقومۂ بالا الفاظ کے ساتھ کدہ آیا ہے۔'' [۴۴]

''دقیقیؔ کے اشعار میں جو شاملِ شاہنامہ ہیں جو پرستش کدہ موجود ہے اور خاقانیؔ کے یہاں عیسیٰ کدہ ملتا ہے۔'' [۴۵]

حکیم ابو العلا ناطق لکھنوی نے ''کدہ'' کی بحث پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے: غالبؔ نے ہرگوپال تفتہؔ کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ 'یہ اُلو کا پٹھا قتیلؔ صفوت کدہ و شفقت، نشتر کدہ و ہمہ جا 'ہمہ عالم' کو غلط کہتا ہے:

۱- اس عبارت میں دو اعتراض ہیں: قتیلؔ نے صفوت کدہ اور 'نشتر کدہ' کو غلط بتایا ہے۔

۲- ہمہ عالم و ہمہ جا کو قتیلؔ نے ناجائز قرار دیا ہے۔

یہ دونوں الزام قتیلؔ پر بہتان سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ کیوں کہ نہ تو اُنھوں نے (قتیلؔ نے) کہیں صفوت کدہ اور نشتر کدہ کا نام لیا ہے اور نہ 'ہمہ عالم' و 'ہمہ جا' کو کہیں غلط بتایا ہے۔ ان اعتراضوں کی ماخذ قتیلؔ کی یہ عبارت ہے:

''کدہ بمعنی خانہ باشد پنج لفظ ملحق شدہ سوائے آں مسموع نیست بتکدہ و غمکدہ، آتش کردہ و میکدہ و گلشن کدہ، وغیر آں چون آب کدہ، نمی دانم درست یا نادرست است یعنی اینہا اصول اندوہ سوائے ایں فروع و فروع دراصل داخل است چوں حیرت کدہ سنبل کدہ، ویراں کدہ،

حسرت کدہ، ماتم کدہ و راحت کدہ تغافل کہ جہنم کدہ بہشت کدہ ہر دو
در گلشن کدہ داخل است۔ چرا گلشن جا کے گل معنی بود، ماتم کدہ و عشرت
کدہ و غم کدہ الذہراند، حصر داخل مقصود نیست الخ

اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ پانچ لفظ اصول اور باقی الفاظ جو کدہ کے ساتھ مرکب ہیں وہ فروع ہیں اور یہ بھی اصل میں داخل ہیں یعنی ان کا استعمال کرنا بھی جائز ہے۔

قتیلؔ نے یہ نہیں لکھا ہے کہ صفوت کدہ اور نشتر کدہ وغیرہ غلط ہے مگر میں قتیلؔ کی اس بات سے متفق نہیں ہوں کہ پانچ لفظ ''اصول'' ہیں سوائے اس کے مسموع نہیں ہے۔ مسموع کے بارے میں حسب ذیل گزارش ہے:

تسکیںؔ کدہ۔ رضی دانش:۔

کعبہ تسکیں کدہ دیر تسلّی گاہ ست
نالہ سرکن ہمہ جاخانۂ فریاد رس ست

'جفا کدہ' سراج الدین خاں آرزوؔ

دریں جفا کدہ از کس مجوئے رنگِ ثبات
کہ طفلِ اشک ہم اینجا چو نالہ ہر جائیتؔ

پروین کدہ، حکیم زلالی

دریں پروین کدہ چنداں بمانم
کہ شعرے چند بر شعرے فشانم (ستارہ)

پریشاں کدہ: جلال اسیرؔ:

در پریشاں کدۂ یاس بود فیض رسا
سایۂ بید خوش آیند شمالے دارد

مجھے اصول و فروع کی تعمیم سے بھی اختلاف ہے۔ غالبؔ نے جو نشتر کدہ، صفوت کدہ و شہرت کے متعلق لکھا ہے کہ قتیلؔ ان الفاظ کو غلط

بتاتے ہیں۔ قتیلؔ نے تو کہیں ان الفاظ کا ذکر بھی نہیں کیا یہ اُس غریب پر تہمت ہے بلکہ اُن اُنھوں نے تو صاف لکھ دیا ہے کہ حصر مقصود نہیں ہے۔ میں نے ساٹھ ستر الفاظ کدہ، سے مرکّب دیکھے ہیں، نہ تو اُن میں یہ الفاظ ہیں اور نہ میرا ذاتی ذوق ان الفاظ کو قبول کرتا ہے جب تک کسی ایرانی کے کلام میں دیکھ نہ لوں۔''[۴۶]

کدہ کے سلسلے میں غالبؔ کا اعتراض بالکل بے بنیاد ہے، کیوں کہ قاضی عبدالودود نے 'نہر الفصاحت' کے حاشیے پر لکھی گئی جو عبارت نقل کی ہے، اُس کے مطابق قتیلؔ نے اپنا دعویٰ واپس لے لیا تھا۔ چوں کہ غالبؔ کی نظر سے 'نہر الفصاحت' کا وہ قلمی نسخہ نہیں گزرا تھا، جس پر قاضی عبدالودود کا نقل کیا ہوا حاشیہ لکھا ہوا ہے، اس لیے غالبؔ اس اعتراض کے سلسلے میں بے قصور ہیں۔

خاک نبود

۴- دیوانِ قتیلؔ اور ''ثمرات البداع تھے'' میں قتیلؔ کا ایک شعر ہے:

یک و جب جائے بہ کوے تو زخوں پاک نبود
کشتہ بر کشتہ تپاں بود دگر خاک نبود

غالبؔ قدرؔ بلگرامی کے نام خط میں لکھتے ہیں:

''اہلِ ہند کی فارسی اسی طرح خام اور ناتمام رہی کہ اصول میں اُنھوں نے فارسی کے قواعد کی تطبیق عربی سے چاہی اور اردو کے خاص روزمرّے کی فارسی بنایا کیے۔ ہندی میں ''کچھ نہیں'' کی جگہ ''خاک نہیں'' بولتے ہیں۔ فارسی میں ''ہیچ نیست'' کی جگہ ''خاک نیست'' کبھی کوئی نہیں کہے گا۔ قتیلؔ چاروں خانے چت گرا ہے:

کشتہ بر کشتہ تپاں بود، دگر خاک نبود

یعنی ہیچ نہ بود۔ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ۔''[۴۷]

اس شعر پر غالبؔ کا اعتراض اس لیے غلط ہے کہ اس محاورے کے بارے میں گفتگو کرتے

ہوئے قتیل نے لکھا ہے ''این محاورہ را ہمیشہ ہندی میدانستم۔'' [۴۸]

یہاں ایک مصرع یاد آرہا ہے:

این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

غالب نے ایک فارسی شعر میں اردو محاورے ''میری گر، سے کیا گیا'' کو اس طرح استعمال کیا ہے۔

گوئی مباد در شکن طرّہ خوں شد

دل زان تست از گرہ ماچہ می رود

بے پیر

غالب نے لفظ ''بے پیر'' سے بحث کرتے ہوئے مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

''لفظ بے پیر تورانی بچہ ہائے ہندی نژاد کا تراشا ہوا ہے، جب میں اپنے شاگردوں کو نہیں باندھنے دیتا تو تم کو شعرِ فارسی میں کیوں کر اجازت دوں گا''۔

مرزا جلال اسیر علیہ الرحمۃ مختار ہیں اور اُن کا کلام سند ہے۔ میری کیا مجال ہے کہ اُن کے باندھے ہوئے لفظ کو غلط کہوں لیکن تعجب ہے اور بہت تعجب ہے کہ امیر زادۂ ایران ایسا لکھے۔۔۔۔۔لفظ ''بے پیر'' ایک لفظ ٹکسال باہر ہے ورنہ صاحبِ زباں ہونے میں اسیر بھی ظہوری سے کم نہیں۔'' [۴۹]

غالب کے معیار دو ہیں اگر اسیر لفظ ''بے پیر'' استعمال کرے تو غالب تعجب کر کے رہ جاتے ہیں اور اگر قتیل ایسا کرے تو بقول اُن کے ''وہ چاروں خانوں چت گرا ہے۔

جامہ گذاشتن

غالبؔ نے چودھری عبدالغفور سرورؔ کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

''کالپی کے نواب زادوں میں سے ایک صاحب قتیلؔ کے شاگرد تھے۔ میں نے ایک رقعہ قتیلؔ کا اُن کے نام کا دیکھا ہے کہ قتیلؔ کا اُن کے نام کا دیکھا ہے کہ قتیلؔ اُن کو لکھتا ہے کہ'' جامہ گذاشتن'' بہ معنی'' مردن''، مسلّم لیکن بہت احتیاط کیا کرو۔ موقع دیکھ لیا کرو، جب لکھا کرو۔ میں کہتا ہوں کہ احتیاط کیا اور موقع کیا؟'' فلاں مرد، بہماں جامہ گذاشت'' پھر وہ کہتا ہے کہ'' کدہ'' کے ساتھ سوائے پانچ سات لفظ کے اور لفظ کو ترکیب نہ دو پھر فرماتا ہے کہ'' ہمہ'' کے لفظ کو جمع کے ساتھ لاؤ۔ مفرد سے نہ ملاؤ۔'' ۵۰

قتیلؔ نے خواجہ امامی کے نام ایک خط میں 'جامہ گذاشتن' کے بارے میں لکھا تھا:

''......دیگر اینکہ در خطِ شما لفظ 'جامہ گذاشتن' در حق شخصے بود۔ آیندہ مذکورِ او ہیچ نہ باید نوشت۔ خبرہاے اراجیف از زبانِ عوام معتبر نیست اگر چیزے دلالت بر عظمت و جبروت او داشتہ باشد مضائقہ ندارد۔ والا چہ ضرور خصوصاً عبارتے کہ در و لفظ 'جامہ گذاشتن' ومثل آن باشد ہیچ صورت مناسب نیست۔ ہرچند ایں اصطلاح راکم کسے می داند۔ لیکن بقرینہ دریافت می تواند شد۔ آیندہ اگرہمچو چیزے بگوش خورد، بہتر انیست کہ نہ نویسد۔

چرا کہ اگر اصلے دارد بعد دو روز شما ہم خواہید شنید؟ اگر دروغ است نوشتن آن خالی از قباحت نیست و ایں ہمہ آفت در تصریح نام شخص است۔ اگر بکنایہ باشد ہیچ قباحتے نہ دارد......یا تمام عبارت در ترکِ نوشتن بہتر است کہ احدے برآن مطلع نمی شود۔'' ۵۱

قتیلؔ کے خط کے اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے 'جامہ گذاشتن' کے استعمال کے بارے میں ہدایت نہیں دی ہے بلکہ مکتوب الیہ کو لکھا ہے کہ تم نے فلاں شخص کی وفات کی افواہ

سن کر مجھے اس کی اطلاع دی ہے۔ اگر چہ تم نے ''جامہ گذاشتن'' کا محاورہ استعمال کیا ہے لیکن سمجھنے والے تو تمھارا اصل مطلب سمجھ جائیں گے۔ اس لیے آیندہ اس طرح کی بات خط میں نہ لکھا کرو اور اگر لکھو تو بہتر ہے کہ ترکی میں لکھو تا کہ کوئی سمجھ نہ سکے۔

قتیل کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اودھ کے کسی بڑے آدمی کے مرنے کی افواہ سن کر امامی نے خط لکھا تھا۔ بڑا آدمی کون ہے؟ قاضی عبدالودود کا خیال ہے کہ یہ نواب سعادت علی خاں کا ذکر معلوم ہوتا ہے۔ 'جامہ گذاشتن' کے بارے میں غالب کا خط پڑھ کر اندازہ ہوا کہ اس خط کے سلسلے میں دو سہو ہوئے۔ ایک تو غالب نے لکھا ہے کہ یہ خط '' کالپی کے نواب زادوں میں سے ایک'' کے نام ہے، یہ درست نہیں ہے۔ خط خواجہ امامی کے نام ہے۔ دوسرے غالب نے لکھا ہے کہ قتیل نے ہدایت دی ہے کہ '' جامہ گذاشتن'' کے بارے میں '' بہت احتیاط کیا کرو۔ موقع دیکھ لیا کرو، جب لکھا کرو۔''

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ قتیل کہنا چاہتے ہیں کہ بڑے آدمی کی وفات کے بارے میں اگر کوئی افواہ سنو تو خط میں نہ لکھو۔ کیوں کہ اگر کسی اور نے خط پڑھ لیا، تو مصیبت آجائے گی۔

اس کا مطلب ہے کہ غالب نے قتیل سے جو بات منسوب کی ہے، وہ قتیل نے کہی ہی نہیں۔

جامک

غالب سید غلام حسنین قدر بلگرامی کے نام ایک خط میں کچھ ادبی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے قتیل پر بے وجہ لعن طعن کرتے ہیں۔ (یہ خط ۱۸۵۷ء سے قبل لکھا گیا تھا) غالب لکھتے ہیں:

> '' ماہم دوسہ جامگی علی التواتر'' '' زدہ بودم'' 'مازدہ' بودیم' تمھارا دل اس ترکیب کو قبول کرتا ہے؟ '' من زدہ بودم'' یا مازدہ بودیم'' اس کے علاوہ '' دوسہ جامگی'' بہ کاف فارسی، یعنی چہ، '' جام'' '' معلوم'' کاف تصغیر کا '' جامک'' چاہیے۔ '' جامک'' کیا؟ مگر یہ پیروی قتیل کی ہے کہ وہ ایرانیوں کی تقریر کے موافق تحریر اپنی بنانا چاہتا ہے۔ ظہوری، جلال، ظہیر، طاہر وحید کسی نے '' جام'' کو '' جامک'' نہیں لکھا۔ '' دوسہ جامگی'' کی جگہ '' دوسہ ساغر'' یا '' دوسہ قدح'' لکھو۔ ۵۲
>
> '' قدر زعفران زار را بوے گل کرد۔'' اس کا لطف کچھ میری سمجھ میں

نہیں آیا۔ ''قدر زعفران زار'' کیا؟ اور پھر اُس کو کس نے بوے گل کردیا؟ ''بسکرّر۔'' کدام زبان است، عربی یا فارسی؟

''حسبِ لیاقتِ خود'' کافی است۔ ''خودم'' چہ محل دارد؟ مگر ہماں شیوۂ قتیل۔ ''بندۂ مجبورم'' ہماں سکۂ قتیل۔''

قتیل دشمنی میں غالب بعض غلط باتیں قتیل سے منسوب کرکے انھیں برا بھلا کہتے تھے۔ اس اعتراض کا بھی یہی حال تھا۔ بقول سید اسد علی انوری:

''کہیں ثابت نہیں کہ مرزا قتیل نے جام کو جامک یا جامکی لکھا ہو۔ مرزا غالب نے خواہ مخواہ مرزا قتیل پر منڈھ دیا ہے اور یہ اُن کا معمول تھا کہ جہاں غلط فارسی دیکھی اور اُنھوں نے قتیل پر الزام رکھا۔''

میرا خیال ہے کہ قتیل نے کہیں جام کو 'جامک'' نہیں لکھا اور پھر فارسی شاعری میں ''جامک'' کی مثالیں ملتی ہیں۔ بقول قاضی عبدالودود......

'' جامک ایک مستند ایرانی شاعر، طغرا کے یہاں بھی آیا ہے، 'جامکے در دست مینا در بغل۔'' ۵۳؎

ایسا ہی ایک معاملہ آغا احمد علی احمد کے ساتھ ہوا۔

غالب نے 'مویدِ برہان' کے جواب میں 'تیغِ تیز' لکھی تھی، جس میں غالب لکھتے ہیں:

''مولوی جی (آغا احمد علی احمد) نے قتیل کی پیروی کی ہے کہ وہ غلط غلط محاورے لکھ کر اس کی تصحیح کرتا ہے۔ مثلاً ''نان از مربائے سیب خوردم'' کو غلط کہتا ہے اور ہدایت کرتا ہے '' نان با مربائے سیب خوردم'' کہو۔'' ۵۴؎

بقول قاضی عبدالودود

''موید کا جواب یہ ہے کہ: نان از مربائے سیب خوردم' فرضی نیست، چناں چہ عبدالرحیم دہری در فرہنگ دبستاں ایں غلط عوام رانشان دادہ و گفتہ کہ ناداناں ترجمہ ہندی زباں می کنند (شمشیر تیز تر، ص ۴۳)

ایسے جھوٹ سے قتیل کو کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا، اعتراض نادرست ہے۔"۵۵

'نان از مرباے سیب خوردم' کے غلط یا صحیح ہونے سے قتیل کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

خودم

غالب کے شاگرد سید غلام حسنین قدر بلگرامی نے "حسب لیاقتِ خودم" لکھ دیا۔ غالب کو خودم پر اعتراض ہے۔ قدر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"حسب لیاقتِ خود" کافی است۔ "خودم" چہ محل دارد؟

مگر ہماں شیوۂ قتیل۔ بندہ مجبورم، ہماں سکہ قتیل"

غالبؔ اور بیدلؔ

مرزا عبدالقادر بیدل ہندوستان کے فارسی گو شاعروں میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ فارسی کے ایک بلند مقام شاعر کی حیثیت سے اُن کی شہرت صرف ہندوستان ہی تک محدود نہیں تھی بلکہ انھیں ایران، پاکستان، افغانستان اور وسطِ ایشیا کے بہت سے ملکوں میں اسی قدر شہرت اور مقبولیت حاصل تھی اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ بیدل کی شخصیت اور فن پر افغانستان، ایران، تاجکستان اور دوسرے کئی ملکوں میں اعلیٰ پایے کا تحقیقی اور تنقیدی کام ہوا ہے۔ اس سلسلے میں یہاں چند کتابوں کی نشان دہی کی جاتی ہے۔ اُستاد خلیل اللہ خلیلی اور سرور خاں گویا کا مرتب کیا ہوا 'کلیاتِ بیدل' افغانستان سے شائع ہوا ہے۔ یہ کلیات چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ افغانستان ہی سے 'بیدل: شاعرِ زمانہ ہا' کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب مختصر ہونے کے باوجود تلاش و تحقیق اور ادبی کاوش کی ایک عمدہ مثال ہے۔ ایران کے ڈاکٹر شفیع کدکنی کی کتاب 'شاعرِ آئینہ ہا'، بیدل پر ایک اور قابلِ قدر تحقیقی کارنامہ ہے۔ تاجیکستان کے مشہور محقق صدرالدین عینی نے بیدل کے کلام کا جامع انتخاب کر کے اُس پر اعلیٰ درجے کا تنقیدی مقدمہ لکھا ہے۔ ہندوستان سے باہر بیدل پر جو بڑی تعداد میں کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ اُن میں سے یہاں چند کتابوں کا بطورِ خاص ذکر کیا گیا ہے۔ یہ وہ کتابیں ہیں جن سے مجھے اپنے کام کے سلسلے میں استفادے کا موقع ملا۔ ہندوستان میں بھی بیدلؔ پر خاصا کام ہوا ہے۔ لیکن اب بھی اُن پر مزید کام کرنے کی گنجائش ہے۔ بیدلؔ کے سوانح، شخصیت اور فن کے بہت سے ایسے گوشے ہیں۔ جن پر مزید روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ ہندستان کے فارسی شعر و ادب میں بیدلؔ کا جو مقام و مرتبہ ہے اُس پر ابھی تک جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ہمارے خیال میں کافی نہیں ہے۔

غالب ہندوستان کے فارسی شاعروں میں صرف دو کے معترف تھے۔ ایک امیر خسرو اور دوسرے عبدالقادر بیدلؔ، امیر خسرو کے فن کا اعتراف غالبؔ کی مجبوری اور کلکتے کے ادبی معرکے کی ادبی سیاست کا حصہ ہے، جہاں تک بیدلؔ کا تعلق ہے غالبؔ اُن کے بے پناہ معترف اور مداح تھے۔ یہاں تک کہ کلکتے کے ادبی معرکے سے قبل غالبؔ کی زندگی میں بیدلؔ کی حیثیت اُن کے استادِ معنوی کی سی تھی۔ غالب نہ صرف یہ کہ بیدلؔ کا تتبع کرتے تھے بلکہ

اس بات پر فخر بھی کرتے تھے جس کا اُنھوں نے اپنی شاعری میں کئی بار اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ یہاں جملۂ معترضہ کے طور پر یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ علامہ اقبال جیسا عظیم شاعر بھی بیدل سے متاثر تھا۔ اقبال نے کئی بار اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ اُن پر زندگی کے بہت سے اسرار و رموز بیدل ہی کے وسیلے سے منکشف ہوئے ہیں۔

محققین نے بیدل کی پیدائش مختلف شہروں کی بتائی ہے۔

امر اللہ الہٰ آبادی[۱]، سید محمد صدیق حسن خاں[۲]، آزاد بلگرامی[۳]، دکتور اسد اللہ حبیب[۴] اور مصحفی[۵] بیدل کی جائے ولادت پٹنہ بتاتے ہیں۔

اس کے برعکس مرزا محمد طاہر نصرآبادی اصفہانی[۶] اور محمد افضل سرخوش[۷] نے انھیں لاہور کا بتایا ہے۔ بندرابن داس خوشگو انھیں اکبر آباد کا بتاتے ہیں۔[۸]

سید الوہاب افتخار نے لکھا ہے کہ بیدل قوم چغتا سے تھے لیکن اُنھوں نے نشو و نما ہندوستان میں پائی۔[۹] رضا قلی خاں ہدایت انھیں دہلوی الاصل بتاتے ہیں۔[۱۰]

عبدالغفور نساخ کا بیان ہے کہ بیدل کا 'توران وطن، مولد بخارا تھا، کم سنی میں ہندوستان آگئے تھے۔[۱۱] حکیم قدرت اللہ قاسم نے بھی اُن کی پیدائش بخارا کی بتائی ہے۔[۱۲] لچھمی نرائن شفیق کو یہ سعادت حاصل ہوئی تھی کہ بیدل ڈیڑھ سال تک اُن کے گھر پر رہے تھے۔ اس لیے دوسرے تذکرہ نگاروں کے مقابلے میں اُن کا بیان قابلِ ترجیح ہے۔ شفیق نے شاہ محمد شفیع وارد کے حوالے سے لکھا ہے کہ بیدل ممالکِ بنگالہ کے اکبر نگر (جو راج محل کے نام سے مشہور ہے) میں پیدا ہوئے تھے۔"[۱۳]

ابراہیم علی خاں[۱۴] اور مصحفی[۱۵] نے لکھا ہے کہ بیدل ارلاس قوم سے تھے۔ آزاد بلگرامی بھی بیدل کو ارلاس قوم کا بتاتے ہیں۔

دکتور اسد اللہ حبیب نے لکھا ہے کہ مرزا عبدالقادر بیدل کی کتاب 'چار عنصر' کی تحریروں میں بعض ایسے شواہد موجود ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ بیدل کی ولادت ۱۰۵۴ھ (مطابق ۱۶۴۴-۱۶۶۳ء) میں ہوئی۔[۱۶]

بیدل نے اپنے سنِ ولادت کا درج ذیل قطعہ کہا تھا:

بسالے کہ بیدلؔ بملکِ ظہور
ز فیضِ ازل تافت چوں آفتاب
بزرگے خبرداد از مولدش
کہ ہم فیضِ قدس است و ''ہم انتخاب'
۱۰۵۴ھ ۱۰۵۴ھ

دکتور اسداللہ حبیب نے بیدلؔ کے مختصر سوانح بیان کیے ہیں۔ اُن کی تحریر کے مطابق

''بیدلؔ کے والد کا نام عبدالخالق تھا، وہ سپاہی پیشہ تھے۔ قادری سلسلے کے ایک بزرگ شیخ کمال کے مرید تھے۔ بیدلؔ پانچ سال کے تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ ایک سال بعد والدہ بھی داغِ مفارقت دے گئیں۔ وفات سے کچھ عرصے پہلے والدہ نے انھیں مکتب میں داخل کردیا۔ سات مہینے میں بیدلؔ نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا۔ اُس کے بعد ایک سال میں قرآن پڑھ لیا اور عربی زبان کی صرف ونحو سیکھ کر فارسی شاعروں کا مطالعہ شروع کردیا۔ دس سال کی عمر میں بیدلؔ نے شعرگوئی کا آغاز کیا۔ اُنھوں نے سب سے پہلے درجِ ذیل رباعی کہی تھی:

یارم ہرگاہ در سخن می آید
بوئے عجبیش از دہن می آید
ایں بوئے قرنفل است یا نکہتِ گل
یا رایحۂ مشکِ ختن می آید

بیدلؔ کو دس سال کی عمر میں پراگندگیِ اسبابِ زندگانی کی وجہ سے مکتب چھوڑنا پڑا۔ اُنھوں نے اپنی کتاب 'چہار عنصر' میں اس پراگندگی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اُن کے وہ چچا مرزا قلندر جو اُن کی پرورش کے ذمہ دار تھے، مکتب میں آگئے، جس میں بیدلؔ تعلیم پا رہے تھے۔ اُن کے سامنے دو لوگ کسی مسئلے پر گفتگو کرتے کرتے ایک دوسرے کو بے عزت کرنے لگے۔ چوں کہ مرزا قلندر تند مزاج تھے، اس لیے اُنھوں نے اہلِ مدرسہ کے غیر مہذب رویّے سے دل شکستہ ہو کر بیدلؔ کو مدرسے سے اُٹھالیا...... مکتب چھوڑنے کے بعد آغازِ جوانی تک بیدلؔ اپنے چچا کے زیرِ تربیت رہے۔ چوں کہ مرزا قلندر خود شعرگوئی کی طرف مائل تھے، اس لیے اُنھوں نے بیدلؔ میں بھی ادبی مذاق پیدا کیا اور اُن سے کہا کہ سخنورانِ سلف کے کلام کا مطالعہ کر کے

اچھے اشعار کا انتخاب کریں اور انھیں سنائیں۔اس طرح بیدلؔ نے قدیم ادب سے شناسائی حاصل کی۔ بیدلؔ کے کلام کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان پر سنائی، عطار اور مولوی روم کا بہت گہرا اثر تھا۔اُن کے اکثر قصیدے خاقانی کی یاد دلاتے ہیں۔ [۱۷]

چھمی نرائن شفیقؔ نے اپنے تذکرے 'شامِ غریباں' میں مرزا عبدالقادر بیدلؔ کا خاصا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ 'شامِ غریباں' میں شفیقؔ نے صرف اُن لوگوں کا ذکر کیا ہے، جو دوسرے ممالک سے ہندوستان آئے تھے۔ مرزا بیدلؔ کی ولادت ہندوستان میں ہوئی تھی پھر بھی شفیقؔ نے اس تذکرے میں اُن کا ترجمہ شامل کیا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ:

> ''مشارُ الیہ (بیدلؔ) وارِدِ ہند نہیں ہیں لیکن اس تذکرے میں ان کے ترجمے کی شمولیت کی وجہ یہ ہے کہ تذکرہ نگاروں نے مرزا کے حالات تفصیلاً اور اجمالاً لکھے ہیں اور راقم الحروف نے بھی اپنے تذکرے 'گلِ رعنا' میں اُن کے حالات درج کیے ہیں۔ حال ہی میں محمد شفیع وارد طہرانی کا تذکرہ 'مراۃِ واردات' نظر سے گزرا۔اس کتاب میں وہ حالات بھی ہیں جو بعض دوسرے تذکروں میں نظر سے گزر چکے ہیں۔ اس کتاب میں ان کے علاوہ بھی مرزا بیدلؔ کے کچھ ایسے حالات ہیں جو میری نظر سے کہیں اور نہیں گزرے۔لہٰذا میں نے سوچا کہ مرزا اعلا درجے کے صاحب کمال ہیں، اس لیے شاہ محمد شفیع وارد نے جو زائد حالات لکھے ہیں۔انھیں بھی لکھنا چاہیے تا کہ وہ صفحۂ روزگار پر محفوظ رہیں۔شاہ وارد نے لکھا ہے:

> ''طائرِ خوش نوائے وجود مرزا بیدلؔ کی ولادت ممالکِ بنگالہ کے اکبر نگر عرف راج محل میں ہوئی۔ ایک مدّت تک اس سرزمین پر اطمینان و سکون کے ساتھ زندگی گزاری اور عین جوانی میں ہندوستان (دہلی) آگئے۔ پہلے شاہ عالم بن عالمگیر کے صاحب زادے سلطان محمد معزالدین کے حقیقی خالو مرزا سلیمان کی صحبت میں برسوں زندگی گزاری۔ مرزا سلیمان (مرزا سلیمان کو سہواً سلطان لکھ دیا گیا ہے) کے انتقال کے بعد مرزا بیدلؔ اعظم بن عالمگیر کے ملازم ہوگئے......ایک دن اعظم شاہ کے مقربوں میں سے کسی نے انھیں

بیدلؔ کے اشعار سنائے۔ اعظم شاہ نے پوچھا کہ یہ شعر کس کے ہیں؟ عرض کیا: مرزا بیدلؔ شاہ کے۔ اعظم شاہ نے مزاحاً کہا۔ ہماری فوج میں تمام لوگ دل والے ہیں۔ اس میں بیدلؔ کا کیا کام۔ مرزا تک جب یہ بات پہنچی تو انھیں پسند نہیں آئی اور وہ اعظم شاہ کو چھوڑ کر سفر پر روانہ ہوگئے۔ کئی منزلیں طے کر کے جمنا کے کنارے آباد متھرا شہر میں اقامت گزیں ہوگئے۔ اُس وقت وہاں کے حاکم حسن علی خاں بہادر الہ وردی خاں کو اُن کے آنے کی اطلاع ملی۔ اس نے مرزا بیدلؔ کی دلجوئی اور خاطر داری کی۔ مرزا کو وہاں لعل محمد کی صحبت بہت پسند آئی۔ سلطان عالمگیر (اورنگ زیب) اُن دنوں دکن میں تھے۔ اُنھوں نے اچانک لعل محمد کو اپنے پاس بلا لیا۔ لعل محمد بادشاہ کے حکم کے مطابق جبراً و قہراً دکن کے سفر پر روانہ ہوگئے۔ راستے میں اُن کا انتقال ہوگیا۔ مرزا (بیدلؔ) ڈیڑھ سال تک راقم الحروف (کچھمی نرائن شفیقؔ) کے گھر پر مقیم رہے۔ شکراللہ خاں اُن دنوں میں نارنول (جو میوات کا ایک علاقہ ہے) حاکم تھے۔ اُنھوں نے بیدلؔ کو قاصد کے ہاتھ ایک خط اور سفر خرچ بھیجا۔ خط میں شوقِ ملاقات کا اظہار کیا گیا تھا۔ مرزا خط ملنے کے بعد میرے والد سے رخصت لے کر شکراللہ خاں کے پاس چلے گئے اور شکراللہ خاں کی زندگی تک ان دونوں میں اتحاد و اتفاق رہا اور کبھی مفارقت کا خیال بھی نہیں آیا۔ شکراللہ خاں کے تین سعادت مند صاحب زادے تھے۔ اُن کے انتقال کے بعد سب سے بڑے صاحب زادے کو باپ کے خطاب یعنی شکراللہ خاں سے نوازا گیا۔ منجھلے شاکر خاں اور سب سے چھوٹے میر کرم اللہ خاں جن کا تخلص عاشق تھا، وہ اپنی صلاحیتوں کے مطابق عاقل خاں کے خطاب سے نوازے گئے۔ اُنھوں نے مرزا بیدلؔ کی ایسی خاطر داری دلجوئی کی کہ مرزا نے وفات کے وقت تک اپنی طویل زندگی آرام و سکون سے گزاری۔ اپنے نسب و حسب کے بارے میں مرزا بیدلؔ نے کئی بار جو مجھے بتایا وہ یہ ہے کہ مرزا کا سلسلۂ اجداد شاہ منصور بن مظفر پادشاہِ فارس ممدوحِ خواجہ حافظ شیرازی تک پہنچتا ہے۔ جب شاہ منصور کی امیر تیمور سے جنگ ہوئی تو شاہ منصور مارے گئے۔ ان کی اولاد اور

> نواسے پوتے وغیرہ بُخارا چلے گئے۔ کئی پشتوں تک یہ خاندان ماوراء النہر میں مقیم رہا۔ مرزا بیدؔل کے والد اس مقام سے ہجرت کر کے
>
> ہندوستان آگئے اور مملکتِ بنگالہ میں اُنھوں نے قیام فرمالیا۔ ایک پشت گزارنے کے بعد بیدؔل کی ولادت ہوئی۔''[18]

شفیقؔ نے یہ بھی لکھا ہے:

> ''......مرزا بیدؔل پیرایہ اہلیت سے آراستہ اور صاحبِ کمال تھے۔ خدا نے اس برگزیدہ انسان پر یہ خاص کرم کیا تھا کہ ساری زندگی اُن کے دل میں دنیاوی تحصیلِ اسباب کا خیال نہیں آیا اور ہمیشہ جمعیتِ معاش سے زندگی گزاری اور خوش وخرم رہے۔ بڑے بڑے امرا اور صاحبِ ثروت (بیدؔل کی) بڑے ادب، احترام سے اُن کی خاص مجلس سے فیض اندوز ہوتے تھے۔ مرزا بیدؔل تمام عمر شکراللہ خاں اور اپنے صاحب زادوں کے علاوہ کسی کے گھر نہیں گئے۔ اپنے زمانے کے صاحب اقتدار لوگوں کے پاس بہت کم جاتے تھے۔''[19] (فارسی سے ترجمہ)

مرزا قلندر اور بیدؔل کے ماموں مرزا ظریف قادری سلسلے کے شیخ جمال کے مرید تھے اور صوفیوں کی صحبت میں رہتے تھے، جس کا بیدؔل پر بہت اثر پڑا...... بیدؔل اُس حلقے سے باہر نکل کر کبھی کبھی شاہ ملوک مجذوب کی صحبت میں رہتے۔ شاہ ملوک خود شاعر تھے۔ اُن کی صحبت کا بیدؔل پر بہت اچھا اثر ہوا۔[20]

صاحب تذکرۂ گلزارِ ابراہیم کا بیان ہے کہ بیدؔل:

> ''قوتِ جسمانی اور طاقتِ قادرِ قوی نے انھیں اتنی عنایت فرمائی تھی کہ اور ان کے معاصرین کے حصے میں کم آئی تھی۔ چناں چہ اک روز رکاب میں شہہ زادے کی عین سواری کے سامنے میں ایک شیر نکل آیا اور کئی بے چاروں اجل کے ماروں کو ذائقہ مرگ کا اس نے چکھایا۔ آخر مرزائے مذکور (بیدؔل) کے ہاتھ وہ شیر بکری کی طرح مارا گیا اور اپنی جان سے بے چارہ گیا۔''[21]

بیدلؔ دنیا سے کنارہ کشی کر کے صوفی ہو گئے تھے۔ علی ابراہیم خاں اور مرزا علی لطف نے لکھا ہے۔

''(بیدلؔ) دفعتاً ایسے روے خلائق سے بیزار ہوئے کہ روزگار پا کشیدہ اور دنیاداری سے بیزار ہوئے۔ طریقۂ فقر اور گوشہ نشینی کا اختیار کیا۔ دل کو فراغِ یاس اور خونِ تمنا سے رشکِ گلزار کیا، لیکن دروازہ ان کا کثرتِ اعتقاد سے مسجودِ خاص و عام تھا اور بوسہ گاہِ امیرانِ عظام تھا۔''[۲۲]

میر محمد خاں بہادر سرورؔ نے 'عمدۂ منتخبہ' میں لکھا ہے کہ:

''عوام ان کی ذات سے بہرہ اندوز اور فائدہ مند ہوتے تھے۔ اکثر خوارقِ عادات جو قربِ الٰہی کا لازمہ ہیں ان سے ظہور میں آتے تھے۔''[۲۳]

بقول ڈاکٹر عبدالمغنی اکیس سال کی عمر میں (یعنی ۱۶۶۵ء کے آس پاس) وہ ترکِ وطن کر کے دہلی آ گئے۔ بقول مالک رام ۴/صفر ۱۱۳۳ھ (مطابق ۲۴/نومبر ۱۷۲۰ء) کو اُن کا دہلی میں انتقال ہو گیا[۲۴] دہلی کے پرانے قلعے کے سامنے اُن کی حویلی تھی، اُسی میں مدفون کیے گئے۔ عہدِ غالب میں بیدلؔ کی قبر کے آثار باقی نہیں تھے، اسی لیے غالب نے بیدلؔ کی قبر کے بارے میں یہ شعر کہا تھا:

گر ملے حضرتِ بیدلؔ کا خطِ لوحِ مزار

اسدؔ آئنہ پروازِ معانی مانگے

خان آرزوؔ نے لکھا ہے کہ:

''ہندوستان کے لوگ مرزا بیدلؔ کے یومِ وفات پر عرس کرتے ہیں، جس میں چراغاں کیا جاتا ہے اور کھانا پکا کر غریبوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔''[۲۵]

پرانے قلعے کے سامنے بیدلؔ کا موجودہ مزار خواجہ حسن نظامی مرحوم نے ۱۹۴۱ء میں تعمیر کرایا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں حکومت نے مزار کے اطراف بہت اچھا باغ بنوا دیا۔

اکثر تذکرہ نگاروں نے بیدلؔ کے درجِ ذیل دو اشعار بھی نقل کیے ہیں:

مت پوچھو دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں
ایک تخمِ بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں
جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا بیدلؔ کہاں ہے ہم میں [۲۶]

یہ اشعار نکات الشعرا، تذکرہ شعرائے اردو، چمنستانِ شعرا، تذکرہ مسرت افزا میں نقل ہوئے ہیں۔

غالبؔ نے لگ بھگ پندرہ سال کی عمر میں شعر گوئی کا باقاعدہ آغاز کیا۔ ابتدائی پندرہ سال تک اُن کے استادِ معنوی میرزا عبدالقادر بیدلؔ ہی رہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب غالب نے فارسی میں بہت کم شاعری کی۔ اُن کی پوری توجہ اردو شاعری پر تھی۔ اب تک غالب کا جو سب سے پہلا اردو دیوان دستیاب ہوا ہے، اس کی کتابت ۱۸۱۶ء میں مکمل ہوئی تھی۔ فارسی کا دیوان ''میخانۂ آرزو سرانجام'' کے نام سے مرتب ہوا اور ۱۸۴۵ء میں شائع ہوا۔

اگرچہ غالبؔ کے بعض نقادوں نے بیدلؔ اور غالبؔ کے کلام کا تجزیہ کر کے ثابت کیا ہے کہ غالب، بیدل سے بہت متاثر تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک کسی نقاد نے اس موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ یہ کام دراصل اُن حضرات کو کرنا چاہیے، جنھوں نے فارسی زبان وادب کے علاوہ غالبؔ کی شاعری کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے اور جن کی تنقیدی اور تجزیاتی صلاحیتیں اعلیٰ درجے کی ہیں۔

اب تک کا دستیاب شدہ غالبؔ کا دوسرا دیوانِ اردو نسخۂ حمیدیہ ہے، جو بھوپال کے میاں فوجدار محمد خاں کے کتاب خانے میں محفوظ تھا۔ اس دیوان میں بارہ ایسے اشعار ہیں، جن میں غالب نے طرزِ بیدلؔ کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''بیعتِ بیدلؔ کا فیض ہے کہ میرا قلم اس قدر مسیحائی دکھاتا ہے اور چوں کہ خامۂ بیدلؔ میرا خضرِ راہ ہے اس لیے سخن میں گمراہی کا مجھے کوئی خطرہ نہیں''۔ ان اشعار میں غالبؔ ''نغمۂ بیدل'' کے سحر کو سراہتے ہیں اور بیدلؔ سے استفادے کا اعتراف کرتے ہیں۔ غالبؔ کی ابتدائی عہد کی شاعری کی فکر اور اظہار دونوں پر بیدلؔ کا گہرا اثر ہے۔ اردو کے ایسے اشعار ملاحظہ ہوں، جن میں غالب نے بیدلؔ کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے۔

دل کارگاہِ فکر و اسدؔ بے نوائے دل
یاں سنگِ آستانۂ بیدلؔ ہے آئنہ

....

جوشِ دل ہے، مجھ سے حسنِ فطرتِ بیدل نہ پوچھ
قطرے سے میخانۂ دریائے بے ساحل نہ پوچھ

....

ہے خامہ فیضِ بیعتِ بیدلؔ بکف اسدؔ
یک نیستاں قلمروِ اعجاز ہے مجھے

....

جوشِ فریاد سے لوں گا دیتِ خواب، اسدؔ
شوخیِ نغمۂ بیدلؔ نے جگایا ہے مجھے

....

ہر غنچہ، اسدؔ، بارگہِ شوکتِ گُل ہے
دل فرشِ رہِ ناز ہے، بیدلؔ اگر آوے

....

اسدؔ قربانِ لطفِ جورِ بیدلؔ
خبر لیتے ہیں، لیکن بیدلی سے

....

اے کرم، نہ ہو غافل، ورنہ ہے اسدؔ بیدلؔ
بے گہر صدف گویا، پشتِ چشمِ نیساں ہے

....

اسدؔ ہر جا سخن نے طرحِ باغِ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگِ بہارِ ایجادیِ بیدلؔ پسند آیا

....

مطربِ دل نے مرے تارِ نفس سے غالبؔ
ساز پر رشتہ پئے نغمۂ بیدلؔ باندھا

....

مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالبؔ
عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے خامۂ بیدلؔ کا

....

ختم نبوت ﷺ زندہ باد | عظمت صحابہ زندہ باد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

معزز ممبران: آپ کا وٹس ایپ گروپ ایڈ من "**اردو بکس**" آپ سے مخاطب ہے۔

آپ تمام ممبران سے گزارش ہے کہ:

- گروپ میں صرف PDF کتب پوسٹ کی جاتی ہیں لہذا کتب کے متعلق اپنے کمنٹس / ریویوز ضرور دیں۔ گروپ میں بغیر ایڈ من کی اجازت کے کسی بھی قسم کی (اسلامی و غیر اسلامی، اخلاقی، تحریری) پوسٹ کرنا سختی سے منع ہے۔
- گروپ میں معزز، پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے ممبرز موجود ہیں اخلاقیات کی پابندی کریں اور گروپ رولز کو فالو کریں بصورت دیگر معزز ممبرز کی بہتری کی خاطر ریموو کر دیا جائے گا۔
- کوئی بھی ممبر کسی بھی ممبر کو انباکس میں میسج، مس کال، کال نہیں کرے گا۔ رپورٹ پر فوری ریموو کر کے کاروائی عمل میں لائے جائے گی۔
- ہمارے کسی بھی گروپ میں سیاسی و فرقہ واریت کی بحث کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔
- اگر کسی کو بھی گروپ کے متعلق کسی قسم کی شکایت یا تجویز کی صورت میں ایڈ من سے رابطہ کیجئے۔
- سب سے اہم بات:

گروپ میں کسی بھی قادیانی، مرزائی، احمدی، گستاخِ رسول، گستاخِ امہات المؤمنین، گستاخِ صحابہ و خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسنین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، گستاخ اہلبیت یا ایسے غیر مسلم جو اسلام اور پاکستان کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف ہیں یا ان کے روحانی و ذہنی سپورٹرز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا ایسے اشخاص بالکل بھی گروپ جوائن کرنے کی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہونے پر فوراً ریموو کر دیا جائے گا۔

- تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش / ڈاؤنلوڈ کر کے **فری آف کاسٹ** وٹس ایپ گروپ میں شیئر کی جاتی ہیں۔ جو کتاب نہیں ملتی اس کے لئے معذرت کر لی جاتی ہے۔ جس میں محنت بھی صَرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔
- عمران سیریز کے شوقین کیلئے علیحدہ سے عمران سیریز گروپ موجود ہے۔
- **لیڈیز کے لئے الگ گروپ کی سہولت موجود ہے جس کے لئے ویریفیکیشن ضروری ہے۔**
- اردو کتب / عمران سیریز یا سٹڈی گروپ میں ایڈ ہونے کے لئے ایڈ من سے وٹس ایپ پر بذریعہ میسج رابطہ کریں اور جواب کا انتظار فرمائیں۔ برائے مہربانی اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے موبائل پر کال یا ایم ایس کرنے کی کوشش ہر گز نہ کریں۔ ورنہ گروپس سے تو ریموو کیا ہی جائے گا بلاک بھی کیا جائے گا۔

نوٹ: ہمارے کسی گروپ کی کوئی فیس نہیں ہے۔ سب فی سبیل اللہ ہے

0306-7163117 — محمد سلمان سلیم

0343-7008883 — پاکستان زندہ باد

0333-8033313 — راؤ ایاز

پاکستان زندہ باد | پاکستان پائندہ باد

اللہ تبارک تعالیٰ ہم سب کا حامی وناصر ہو

آہنگِ اسدؔ میں نہیں جز نغمۂ بیدلؔ
عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

اس کے علاوہ تیرہواں شعر وہ ہے جو غالبؔ کے پہلے مرتبہ دیوانِ اردو میں نہیں ہے۔ لیکن جس کے بارے میں غالب نے عبدالرزاق شاکر کے نام اپنے ایک خط میں لکھا تھا۔

''قبلہ! ابتدائے فکرِ سخن میں بیدلؔ و اسیر و شوکت کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا۔ چناں چہ غزل کا مطلع یہ تھا:

طرزِ بیدلؔ میں ریختہ لکھنا　　　اسد اللہ خاں قیامت ہے

پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامینِ خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہوگیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا۔ اوراق یک قلم چاک کیے۔ دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوانِ حال میں رہنے دیے''۔[۲۲]

غالبؔ کے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شعر بھی ابتدائی دور میں اور قیاساً ۱۸۲۱ء سے قبل کہا گیا تھا۔ غالبؔ کے ایسے اردو اشعار کی تعداد بہت کافی ہے جو شعوری طور پر بیدلؔ کے تتبع کا نتیجہ ہیں۔ غالب کے ایسے اشعار بھی کم نہیں ہیں جو بیدلؔ کے فارسی اشعار کا اردو ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے اشعار ملاحظہ ہوں:

غالبؔ

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضرؔ
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے

بیدلؔ

تا کے ز خلق پردہ بَرَد افگنی چو خضر
مُردن بہ از خجالتِ بسیار زیستن

غالبؔ

میں عدم سے بھی پرے ہوں، ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

بیدلؔ

ہمچو عنقا، بے نیازِ عرضِ ایجادیم ما
یعنی، آنسویِ دمِ یک عالم آبادیم ما

غالبؔ

نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی
ہوا جامِ زُمرّد بھی، مجھے داغِ پلنگ آخر

بیدلؔ

منزلِ عیش بہ وحشت کدۂ امکاں نیست
چمن، از سایۂ گل، پُشتِ پلنگ است ایں جا

غالبؔ

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

بیدلؔ

خلقے بہ عدم دودِ دل و داغِ جگر بود
خاکِ ہمہ صرفِ گل و سُنبُل شدہ باشد

غالبؔ

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمعؑ ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

بیدلؔ

زندگی در گردنم افتاد، بیدلؔ چارہ نیست
شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن

غالبؔ

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیِ جا کا
گُہر میں محو ہوا، اضطراب دریا کا

بیدلؔ

دلِ آسودۂ ما شورِ امکاں در قفس دارد
گُہر در دیدہ است ایں جاعنانِ موجِ دریا را

غالبؔ

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

بیدلؔ

قطرۂ ما تا کُجا سامانِ خود داری کند
بحر ہم از موج ایں جا می شمارد دام ہا

غالبؔ

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

بیدلؔ

حرف چندینکہ صَرفِ انساں است
چوں تامل کُنی نہ آساں است

غالبؔ

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدّعا عَنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

بیدلؔ

در جستجوے ما نہ کَشی زحمتِ سُراغ
جائے رسیدہ ایم کہ عَنقا نمی رسد

غالبؔ

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

بیدلؔ

ہماں مُحیط کہ خود را بخویش می پوشید
زِ پردۂ دلِ ہر قطرہ شد نقاب کُشا

غالبؔ

زِ بسکہ، مشقِ تماشا جنوں علامت ہے
کُشاد و بَستِ مژہ سیلیِ ندامت ہے

بیدلؔ

دیدۂ را بہ نظارہ دلِ ما محرم نیست
مژہ برہم زدن، از دستِ ندامت کم نیست

غالبؔ

تا کجا، اے آگہی، رنگِ تماشا باختن
چشم وا گردیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

بیدلؔ

چشم وا کردن، کفیلِ فرصتِ نظّارہ نیست
پرتوِ ایں شمع، آغوشِ وداعِ محفل است

غالبؔ

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اِک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

بیدلؔ

جلوہ مشتاقم بہشت و دوزخی منظور نیست
میروم از خویش در ہر جا کہ می خوانی مرا

غالبؔ

بساطِ عمر میں تھا ایک دل، یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

بیدلؔ

آبِ گُہریم خونِ یاقوت
داریم بہ روے خود چکیدن

غالبؔ

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

بیدلؔ

بہ ہستیِ تو امید است نیستی ہا را
کہ گفتہ اند اگر ہیچ نیست اللہ ہست

غالبؔ کے وہ فارسی اشعار ملاحظہ ہوں جن پر بیدلؔ کی فکر اور اظہارِ بیان کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں:

غالبؔ

از وہم قطرگیست کہ درخود گُمیم ما
اما چو وارسیم ہماں قلزمیم ما

بیدلؔ

دریاست قطرۂ کہ بدریا رسیدہ است
جز ما کسے دگر نتواند بما رسید

غالبؔ

زما گرم است ایں ہنگامہ بنگر شورِ ہستی را
قیامت می دمد از پردۂ خاکی کہ انساں شد

بیدلؔ

بے وجودِ ما ہمیں ہستی عدم خواہد شدن
تا دریں آئینہ پیدا ایم عالم، عالم است

غالبؔ

سراغ وحدت ذاتش تواں ز کثرت جست
کہ سائر است در اعداد بے شمار یکے

بیدلؔ

بلبل بہ نالہ حرفِ چمن را مفسّر است
یارب زبانِ نکہتِ گل ترجمان کیست

غالبؔ

در سلوک از ہرچہ پیش آمد گذشتن داشتم
کعبہ دیدم نقشِ پائے رہ رواں نامیدمش

بیدلؔ

کعبہ و بت خانہ نقشِ مرکزِ تحقیق نیست
ہر کجا گم گشت رہ سر منزلے آراستند

غالبؔ

نظر بازی و ذوقِ دیدار کو
بفردوس روزن بدیوار کو

بیدلؔ

گویند بہشت است ہمہ راحتِ جاوید
جائیکہ بہ داغے نہ طپد دل چہ مقام است

بیدلؔ کا شعر ہے:

حریفے کہ شد میکشِ خمرِ ذات
چہ ساں مست گردد ز جامِ صفات

غالبؔ نے اسی خیال کو دو اشعار میں بیان کیا ہے:

سرپائے خُم پہ چاہیے ہنگامِ بے خودی
رو سوئے قبلہ وقتِ مُناجات چاہیے
یعنی بحسبِ گردشِ پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیے

غالبؔ کے فارسی اشعار بھی خاصی تعداد میں بیدلؔ کے تتبع کا نتیجہ ہیں۔ دونوں کے بعض اشعار میں غیر معمولی مشابہت ہے۔ ایسے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

غالبؔ

گردیدن زاہداں بجنت گستاخ
ویں دست درازی بہ ثمر شاخ بہ شاخ

بیدلؔ

در جنّتے کہ وعدۂ نعمت شنیدہ ای
آدم کجاست اکثر سکانش احمقند

ڈاکٹر عبدالمغنی نے بیدلؔ کی مثنوی ''طورِ معرفت'' اور غالبؔ کی مثنوی ''چراغِ دیر'' کا موازنہ کیا ہے۔ ان کی عالمانہ تحریر سے کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ جب بیدلؔ کو وندھیاچل کے کوہستان بیراٹ میں کچھ دن رہنے کا موقع ملا تو وہاں کی رومان پرور فضا نے انھیں اسی طرح

مسحور کر دیا جیسے غالبؔ کو بنارس کی سحر انگیز فضا اور حسینوں نے کیا تھا۔ غالبؔ نے جب مثنوی ''چراغِ دیر'' نظم کی ہے تو ان کے ذہن میں یقیناً بیدلؔ کی مثنوی ''طورِ معرفت'' تھی۔ اسی لیے غالبؔ کی مثنوی کا پورا ڈھانچہ اسی انداز کا ہے۔ فکر و خیال اور اظہارِ بیان کی سطح پر غالبؔ، بیدل کی مثنوی سے بہت متاثر ہیں۔ غالبؔ نے اپنی مثنوی ''چراغِ دیر'' کے لیے وہی بحر اختیار کی ہے جس میں بیدلؔ نے ''طورِ معرفت'' نظم کی تھی۔ بقول ڈاکٹر عبدالمغنی ''نظامی، جامی اور ان کے بعد ناصر علی سرہندی نے بھی اپنی مثنویوں میں تواجد و سرور کے اظہار کے لیے یہی بحر اختیار کی تھی۔ بیدلؔ نے ''طورِ معرفت'' کا آغاز ان دو اشعار سے کیا ہے:

طپش فرسود شوقِ نالہ تمثال
زِ تحریکِ نفس وا می کند بال
کہ خاموشی نوا ساز است امروز
غبارِ سرمہ آواز است امروز

اب غالبؔ کی مثنوی ''چراغِ دیر'' کے ابتدائی دو شعر ملاحظہ ہوں:

نَفَس با صُور دمساز است امروز
خموشی محشرِ راز است امروز
رگِ سنگم شرارے می نویسم
کفِ خاکم غبارے می نویسم

غالبؔ کے ان دونوں اشعار میں الفاظ، قافیے، ردیف اور حد تو یہ ہے کہ تصورات تک میں یکسانیت ہے۔ اب بیدلؔ کی مثنوی ''طورِ معرفت'' اور غالبؔ کی ''چراغِ دیر'' کے کچھ اشعار

ملاحظہ ہوں:

غالبؔ

بہ لطف از موج گوہر نرم رو تر
بناز از خونِ عاشق گرم رو تر

بیدلؔ

ہمہ از موج گلشن خوش عناں تر
ز آبِ زندگانی ہم رواں تر

غالبؔ

تعالیٰ اللہ بنارس چشم بد دور
بہشتِ خرّم و فردوسِ معمور

بیدلؔ

بہشتِ اتفاقِ آرزو ہا
فرنگستانِ حسنِ رنگ و بو ہا

غالبؔ

بہارستانِ حسنِ لا ابالیست
بہ کشور ہا سمر در بی مثالیست

بیدلؔ

رگ ابرِ بہارستانِ نیرنگ
طلسم ریشۂ فردوس در چنگ

غالبؔ

کفِ ہر خاکش از مستی کنشتی
سر ہر خارش از سبزی بہشتی

بیدلؔ

بُنِ ہر خار صد گلشن در آغوش
کفِ ہر خاک صد آئینہ بردوش

غالبؔ

بسامانِ دو عالم گلستاں رنگ
زِ تاب رخ چراغانِ لب گنگ

بیدلؔ

دو عالم رنگ و بوی خفتہ یک بار
زِ شورِ خندۂ گل گشت بیدار

غالبؔ

شکایت گونۂ دارم ز احباب
کتانِ خویش می شویم بہ مہتاب

بیدلؔ

تماشاے جمالِ شستۂ آب
کنانم می زند بر روے مہتاب

غالبؔ

بود در عرض بال افشانیِ ناز
خزانش صندلِ پیشانیِ ناز

بیدلؔ

نگہ تا با غبارش آشنا بود
مژہ عرضِ دکانِ توتیا بود

بیدلؔ نے اپنے سالِ ولادت کا درجِ ذیل قطعہ کہا تھا:

بسالے کہ بیدلؔ بہ مُلکِ ظہور
ز فیضِ ازل تافت چوں آفتاب
بزرگے خبر داد از مولدش
کہ ہم فیضِ قدس است وہم 'انتخاب'

۱۰۵۴ھ   ۱۰۵۴ھ

غالبؔ نے بیدلؔ کی پیروی کرتے ہوئے اپنی ولادت کی تاریخ بھی رباعی میں منظوم کی۔

رباعی

غالبؔ چو زِ ناسازیِ فرجام نصیب
ہم بیمِ عدو دارم و ہم ذوقِ حبیب
تاریخِ ولادتِ من از عالم قدس
ہم ''شورشِ شوق'' آمد و ہم لفظِ 'غریب'

۱۲۱۲ھ   ۱۲۱۲ھ

غالبؔ نے بیدلؔ کے مصرعوں کو تضمین بھی کیا ہے۔ یہ شعر پہلے بھی پیش کیا جا چکا ہے، جس میں غالب نے بیدلؔ کے ایک فارسی مصرعے کو اردو شعر میں تضمین کیا ہے۔ شعر ہے:

آہنگِ اسد میں نہیں جز نغمۂ بیدلؔ
عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

بیدلؔ کی مثنوی ''عرفان'' کا ایک شعر ہے:

من کفِ خاک و او سپہرِ بلند
نبرد خاک بر سپہر کمند

غالبؔ کی مثنوی ''بادِ مخالف'' کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

من کفِ خاک و او سپہرِ بلند
خاکِ در کے رسد بچرخ کمند

یہ شعر اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ مثنوی ''بادِ مخالف'' کی تصنیف کے وقت غالبؔ کے ذہن میں بیدلؔ کی مثنوی ''عرفان'' بھی تھی۔

غالبؔ کے ادبی معرکے کا ذکر کرتے ہوئے یہ واقعات لکھے جا چکے ہیں لیکن یاددہانی کے طور پر انھیں یہاں پھر دہرانا ضروری ہے۔

غالبؔ اپنی پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں جب کلکتہ پہنچے ہیں تو پنشن کے قضیے سے متعلق اُن کے ایک مخالف مرزا افضل بیگ نے غالبؔ کی تحقیر کے لیے تین مشاعرے منعقد کرائے۔ اس سلسلے میں جو پہلا مشاعرہ منعقد ہوا، اس میں غالب نے اپنی ایک اردو اور ایک فارسی غزل پڑھی۔ ان دونوں غزلوں کو بہت پسند کیا گیا اور مرزا افضل بیگ نے جس سازش کے تحت اس مشاعرے کا اہتمام کیا تھا وہ گویا ناکام ثابت ہوئی۔ دوسرے مشاعرے میں غالب نے ایک غزل پڑھی۔ اس غزل کے ایک شعر پر ایک بہت ہی کم رتبہ اور انجان شخص سے اعتراض کروایا گیا۔ غالب کا شعر تھا:

جز وے از عالم و از ہمہ عالم بیشم
ہمچو موئے کہ بتاں را ز میاں بر خیزد

اس شعر پر تین اعتراض تھے۔ پہلا اعتراض تھا کہ ''بیش'' کی جگہ ''بیشتر'' ہونا چاہیے تھا۔ دوسرا اعتراض تھا کہ ''موئے زمیان برخیزد'' غلط ہے، جس کی وجہ سے پورا شعر بے معنی ہو گیا ہے اور تیسرا اعتراض یہ تھا کہ ''عالم'' مفرد ہے۔ اس لیے حسب اجتہادِ قتیلؔ اس کے ساتھ ''ہمہ'' کا

استعمال نہیں ہونا چاہیے۔ غالبؔ کے اس شعر پر مخالفین کے اعتراضات اور غالبؔ اور حامیانِ غالبؔ کے جوابات نے ان اعتراضات کو ایک ادبی معرکے کی شکل دے دی۔ یہ معرکہ جون یا جولائی ۱۸۲۸ء میں ہوا۔ اس بحث میں مخالفین کی جانب سے چوں کہ قتیلؔ کی سند پیش کی گئی تھی۔ غالبؔ کو مخالفین کے اعتراضات اور خاص طور سے قتیلؔ کو سند کے طور پر پیش کرنا سخت ناگوار گزرا۔

اس معرکے کا ایک منفی نتیجہ یہ نکلا کہ غالبؔ ہندوستان کے تمام فارسی گو شاعروں کے مخالف ہوگئے۔ ان کا کہنا تھا کہ چوں کہ ہندوستان کے تمام فارسی شاعروں نے فارسی، اہلِ زبان سے نہیں کتابوں اور ہندوستان کے فارسی استادوں سے سیکھی ہے، اس لیے اُن کی فارسی لائقِ اعتبار نہیں۔ ان ہندوستانی شاعروں میں دیگر قابلِ ذکر شعرا کے ساتھ امیر خسرو بھی شامل تھے۔ چناں چہ اس معرکے کے بہت بعد غالبؔ نے امیر خسروؔ کی شاعری کا اعتراف کیا، لیکن وہ بھی دل سے نہیں، محض مصلحتاً۔

غالبؔ نے چودھری عبدالغفور سرورؔ کے نام مارچ، اپریل ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں لکھا ہے:

> ''غالبؔ کہتا ہے کہ ہندوستان کے سخن وروں میں حضرت امیر خسرو دہلوی علیہ الرحمۃ کے سوا کوئی استاد مسلم الثبوت نہیں ہوا۔ خسرو، کے خسروِ قلمروِ سخن طرازی ہے یا ہم چشمِ نظامی گنجوی وہم طرح سعدی شیرازی ہے۔''[۲۸]

درج ذیل شعر کے علاوہ اردو میں غالبؔ کا غالباً اور کوئی ایسا شعر نہیں ہے، جس میں انھوں نے خسرو کو خراجِ تحسین پیش کیا ہو۔

غالبؔ مرے کلام میں کیوں کر مزا نہ ہو
پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پانو

یہ شعر کلکتے کے ادبی معرکے کے آٹھ دس سال بعد کہا گیا ہے۔ اپنے ایک اور شعر میں غالبؔ نے خود اپنے بارے میں تعلّی سے کام لیتے ہوئے بالواسطہ طور پر خسرو کا بھی ذکر کیا ہے۔

ملے دو مرشدوں کو قدرتِ حق سے ہیں، دو طالب
نظام الدین کو خسروؔ، سراج الدین کو غالبؔ

سراج الدین سے مراد ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ہے۔ بہادر شاہ ظفر نے غالب کو ۱۸۵۰ء میں تیموری خاندان کی تاریخ لکھنے پر مقرر کیا تھا۔ ۱۸۵۴ء میں ذوق کی وفات کے بعد غالب بہادر شاہ ظفر کے استاد مقرر ہوئے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ شعر ۱۸۵۰ء کے بعد کہا گیا۔ اس شعر میں خسرو کے شاعرانہ مرتبے کا کوئی ذکر نہیں سوائے اس کے کہ انھیں حضرت نظام الدین اولیاؒ کا ارادت مند بتایا گیا ہے۔ بہر حال ''دو طالب'' کی ترکیب سے خسرو اور غالب کے ہم پلّہ ہونے کی طرف ایک خفیف سا اشارہ ضرور موجود ہے۔

غالب نے اپنے اردو کلام میں بیدل کا ذکر کم سے کم تیرہ بار اس انداز میں کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ غالب بیدل کی شاعرانہ عظمت کے معترف ہیں۔ جب کہ بالکل اسی انداز سے خسرو کا ذکر ان کے ہاں غالباً صرف ایک دو بار ہی ہوا ہے۔ غالب نے مختلف موقعوں پر اردو خطوط میں بیدل کے بارہ شعر اور ایک مصرع نقل کیا ہے۔ جب کہ خسرو کا غالباً ایک مصرع بھی کہیں نقل نہیں کیا۔ غالب کے فارسی یا اردو کلام پر بھی امیر خسرو کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی محقق یا نقاد کی کوئی ایسی تحریر سامنے نہیں آئی، جس میں غالب اور خسرو کے کلام کا موازنہ کیا گیا ہو۔ ڈاکٹر نظام الدین گوریکر نے اپنی کتاب ''طوطیانِ ہند'' میں خسرو کی مثنوی ''کشور ہند''، فیضی کی مثنوی ''نل دمن'' اور غالب کی مثنوی ''چراغ دیر'' کا تعارف ضرور کرایا ہے لیکن یہ صرف ان تین مثنویوں کا تعارف ہی ہے موازنہ نہیں۔

میرا خیال ہے کہ غالب امیر خسرو کے مداح ضرور ہوں گے، لیکن ان کے کلام سے شاید وہ اتنے متاثر نہیں تھے، جتنا کہ وہ بیدل کی شاعری سے تھے۔ معرکۂ کلکتہ کے بعد وہ ہندوستان کے تمام فارسی شاعروں سے منحرف ہوگئے تھے۔ محض اپنے بچاؤ کے لیے سپر کے طور پر انھوں نے ایک شعر اور ایک خط میں امیر خسرو کی تعریف کی ہے۔ تاکہ اُن پر یہ الزام نہ آئے کہ وہ کسی ایک ہندوستانی فارسی گو کے بھی قائل نہیں ہیں۔

تمام غالب شناسوں نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ غالب بیدل کی شاعری سے بہت متاثر تھے۔ میں نے اس مقالے میں غالب کے اردو اور فارسی اشعار، غالب کے اردو خطوط اور مختلف تحریروں کے حوالے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ غالب بیدل کے جیسے مداح اور معتقد تھے کسی اور ایرانی یا ہندوستانی فارسی داں کے نہیں تھے۔ وہ بیدل کو اپنا استادِ معنوی مانتے تھے۔

بڑی تعداد میں غالب کے ایسے اشعار، خطوط اور دیگر تحریریں موجود ہیں، جن سے اندازہ ہوتا

ہے کہ غالبؔ بیدلؔ کے نہ صرف زبردست مداح تھے، بلکہ بیدلؔ کا تتبع بھی کرتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ یہاں غالبؔ کی کچھ ایسی ہی تحریروں اور اشعار کا ذکر کیا جائے گا۔ بھوپال سے غالبؔ کے قلم سے لکھا ہوا جو اردو دیوان دستیاب ہوا ہے اُسے پروفیسر نثار احمد فاروقی اور اکبر علی خاں مرحوم نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔

غالبؔ کے سب سے پہلے دستیاب دیوانِ اردو کا مخطوطہ وہ ہے جس پر غالبؔ کی ۱۲۳۱ھ کی مہر لگی ہوئی ہے اور جو بھوپال سے دستیاب ہوا تھا۔ دیوانِ غالب کے اس مخطوطے کو پروفیسر نثار احمد فاروقی نے مرتب کیا تھا۔ اگرچہ دیوان پر مرتب کی حیثیت سے اُن کا نام نہیں دیا گیا اور یہ نقوش (لاہور، حصہ ۲/ اکتوبر ۱۹۶۹ء) میں شائع ہوا۔ یہی مخطوطہ اکبر علی خاں مرحوم نے ''نسخۂ عرشی زادہ'' کے نام سے ۱۹۶۹ء میں ادارۂ یادگارِ غالب'' رام پور سے شائع کیا ہے۔ اس دیوان کی پیشانی پر حصولِ برکت کے لیے غالب نے پہلے ''بسم اللہ'' لکھی ہے اور اُس کے نیچے لکھا ہے ''ابوالمعانی حضرت عبدالقادر بیدلؔ رضی اللہ عنہ۔ اس دیوان اردو کے ترقیمے میں غالب نے لکھا ہے:

> ''بتاریخ چہار دہم رجب المرجب سہ شنبہ سنہ ہجری وقتِ دوپہر روز باقی ماندہ فقیر بیدل اسد اللہ خاں عرف میرزا نوشہ متخلص بہ اسد عفی اللہ عنہ از تحریر دیوانِ آوردِ حسرت عنوانِ خود فراغت یافتہ بہ فکرِ کاوشِ مضامین دیگر رجوع بخیالِ روحِ میرزا علیہ الرحمہ آورد۔ فقط۔[۲۹]

کوئی بھی شاعر یا فن کار اپنے کسی ہم فن کو اس سے بڑھ کر اور کیا خراجِ تحسین پیش کر سکتا ہے۔ کلکتے کے ادبی معرکے تک غالب، بیدلؔ کے بہت مداح تھے۔ بیدلؔ کی دو مثنویوں کے مخطوطے پنجاب یونی ورسٹی لاہور کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ ان میں بیدلؔ کی ایک مثنوی ہے ''طورِ معرفت''۔ اُس کے سرورق پر غالب نے اپنے قلم سے مثنوی کی تعریف میں ایک شعر لکھا ہے اور اپنی مہر ثبت کی ہے۔ شعر ہے:

ازیں صحیفہ بنوعی ظہورِ معرِفت است

کہ ذرہ ذرہ چراغانِ طورِ معرِفت است[۳۰]

دوسرا مخطوطہ ہے بیدلؔ کی مثنوی ''محیطِ اعظم'' کا۔ اس کے پہلے صفحے پر غالبؔ نے اپنے قلم سے مندرجہ ذیل شعر لکھ کر اپنی مہر ثبت کی ہے۔

ہر حُبابے را کہ موجش گل کند جامِ جم است
آبِ حیواں آبِ وے از محیطِ اعظم است

کلکتے کے ادبی معرکے کے مشاعرے میں غالبؔ نے جب ایک غزل پڑھی تو اُس میں یہ شعر بھی تھا:

شورِ اشکے بہ فشارِ منِ مژگاں دارم
طعنہ بر بے سرو سامانیِ طوفاں زدۂ

اس شعر پر یہ اعتراض کیا گیا کہ ردیف کے طور پر ''زدۂ'' کا استعمال غلط ہے۔

کلکتے کے ادبی معرکے کے دوران ''زدۂ'' کے استعمال پر بحث کرتے ہوئے غالبؔ نے مثنوی ''بادِ مخالف'' میں بیدلؔ کا ایک شعر سند کے طور پر پیش کیا ہے۔ بیدلؔ کو ''محیطِ بے ساحل''، ''صاحبِ جاہ و دستگاہ''، ''قلزمِ فیض''، اور ''سحرِ بیکراں'' جیسے عظیم الشان الفاظ سے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

می زدۂ ''غمزدہ'' کہ ترکیب است
بقیاسِ فقیر تقلیب است
چوں بر آید زِ انگبین موش
''زدۂ غم'' دمد زِ مفہومش
لیک در بعض جا نہ در ہمہ اش
لفظ'' مارے ہوئے'' است ترجمہ اش
ہمچناں آں محیطِ بے ساحل
قلزمِ فیضِ، میرزا بیدلؔ
از محبت حکایتے دارد
کہ بدنیاں بدایتے دارد

غالبؔ نے سند کے طور پر بیدلؔ کا درج ذیل شعر پیش کیا ہے:

عاشقی بیدلے جنوں زدۂ
قدحِ آرزو بہ خوں زدۂ

پھر غالبؔ کہتے ہیں:

کردہ ام عرض ہمچناں ''زدہ''
طعنہ بر بحر بیکراں زدہ
مگر ایں شعر زاں نمط نہ بود
ور بود شعرِ من غلط نہ بود
نہ غلط گفتہ است در خود گفت
راست گویم در آشکار و نہفت
دعویِ بندہ بے سرو بن نیست
شعر بیدلؔ بجز تفنن نیست

ابتدا میں غالبؔ فخر یہ طور پر فارسی کے پچھلے شاعروں سے ہم سری کا دعویٰ کرتے تھے۔ انھوں نے کلکتے سے محمد علی خاں کے نام اپنے ایک خط میں اس پہلے مشاعرے کی روداد بیان کی تھی جو بقول غالبؔ اُن کے مخالفوں نے انھیں نیچا دکھانے کے لیے منعقد کیا تھا، لیکن اُن کا کلام اتنا پسند کیا گیا کہ کچھ لوگوں نے بقول غالبؔ کہا:

''غالبؔ کے مقابلے میں قتیلؔ کیا بلکہ اگر پچھلے شاعروں سے غالبؔ ہم سری کا دعویٰ کرتے تو کچھ غلط نہیں، یہ دعویٰ تو غالبؔ کو زیب دیتا ہے''۔ [۳۱]

لیکن جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ کلکتے کے ادبی معرکے کے بعد غالبؔ نے بیدلؔ کا نہ صرف تتبع ترک کر دیا بلکہ بیدلؔ کے اثر سے آزاد ہونے کی شعوری کوشش بھی کی، یہ اور بات ہے کہ کلی طور پر وہ خود کو بیدلؔ کے اثر سے آزاد نہیں کر سکے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ عمر کے آخری حصے تک اُن کے دل و دماغ پر بیدلؔ کے اشعار چھائے رہے، جس کا ثبوت اُن کے اردو خطوط ہیں، جن میں انھوں نے بیدلؔ کے اشعار نقل کیے ہیں:

غالبؔ نے مرزا تفتہؔ کے نام ایک خط میں بیدلؔ کی تعریف اس طرح کی ہے:

''تمھیں یاد ہوگا میں نے تمھارا (قلمی) دیوان دیکھ کر کہا تھا کہ میرزا عبدالقادر بیدلؔ نے اپنا دیوانِ غزلیات از اوّل تا آخر

اس طرح مرتب کیا ہے کہ ہر زمین میں دو غزلیں کہیں اور ان دو غزلوں کے درمیان ایک مختلف زمین رکھی ہے۔ کتنا اچھا ہو کہ تمھارا دیوان بھی اسی انداز سے ترتیب پائے۔ اب یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس سے تمھارے کلام کی رونق بڑھی اور میری مسرّت میں اضافہ ہوا''۔[۳۲]

نواب انورالدولہ سعدالدین خاں بہادر شفقؔ کے نام اکتوبر ۱۸۵۵ء کے ایک خط میں غالبؔ لکھتے ہیں:

''اَرَنی کے رے کی حرکت وسکون کے باب میں قولِ فیصل یہی ہے جو حضرت نے لکھا ہے۔ اگر تقطیعِ شعر مساعدت کر جائے اور ''اَرَنی'' بروزنِ ''چمنی'' گنجایش پائے نعم الاتفاق، ورنہ قاعدۂ تصرف مقتضی جواز ہے''۔

مرزا عبدالقادر بیدلؔ:

چو رسی بہ طورِ ہمت، ارَنی مگو و بگذر
کہ نیرزد ایں تمنا بہ جوابِ لن ترانی [۳۳]

حکیم غلام نجف خاں کے نام خط میں پنشن کے اجرا ہونے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''پنشن کی درخواست دے رکھی ہے۔ بہ شرطِ اجرا بھی میرا کیا گزارا ہوگا...... خدا جانے پنشن جاری ہوگا یا نہ ہوگا۔ احتمالِ تعیش وتنعم بہ شرطِ تجرید، صورتِ اجرائے پنشن میں سوچتا ہوں اور وہ موہوم ہے۔

بیدلؔ کا یہ شعر مجھ کو مزا دیتا ہے:

نہ شامِ ما را سحر نویدے، نہ صبحِ ما را دمِ سپیدے

چو حاصلِ ماست ناامیدی، غبارِ دنیا بفرقِ عقبیٰ [34]

مرزا تفتہ نے جب اپنا سارا جمع کیا ہوا روپیہ خرچ کر دیا۔ غالب ناراض ہو کر ۱۹ر دسمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں انھیں لکھتے ہیں:

''بنک گھر کا روپیہ اٹھا چکے ہو، اب کہاں سے کھاؤ گے؟ میاں! نہ میرے سمجھانے کو دخل ہے نہ تمھارے سمجھنے کی جگہ ہے۔ ایک چرخ ہے کہ وہ چلا جاتا ہے، جو ہونا ہے، وہ ہوا جاتا ہے۔ اختیار ہو تو کچھ کیا جائے۔ کہنے کی بات ہو تو کچھ کہا جائے۔ مرزا عبدالقادر بیدلؔ خوب کہتا ہے:

رغبتِ جاہ چہ و نفرتِ اسباب کدام
زیں ہوسہا بگزر یا مگزر، می گزرد [35]

چودھری عبدالغفور سرورؔ کے نام نومبر ۱۸۶۰ء کے ایک خط میں غالبؔ، بیدلؔ کا ایک مصرع نقل کرتے ہیں:

''کبھی جو سابق کی اپنی نظم و نثر دیکھتا ہوں تو یہ جانتا ہوں کہ یہ تحریر میری ہے۔ مگر حیران رہتا ہوں کہ میں نے یہ نثر کیوں کر لکھی تھی اور کیوں کر یہ شعر کہے تھے۔ عبدالقادر بیدلؔ کا یہ مصرع گویا میری زبان سے ہے:

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ [36]

جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں غالبؔ کو بیدلؔ کا یہ مصرع اتنا پسند تھا کہ انھوں نے اسے تضمین بھی کیا ہے:

غالب ایک خط میں انورالدولہ سعدالدین خاں بہادر شفقؔ کو لکھتے ہیں:

''افسوس، کہ میرا حال اور یہ لیل و نہار، آپ کی نظر میں نہیں۔ ورنہ آپ جانیں اس بجھے ہوئے دل اور اس ٹوٹے ہوئے دل

اور اس مرے ہوئے دل پر کیا کر رہا ہوں۔ نواب صاحب!
اب نہ دل میں وہ طاقت، نہ قلم میں وہ زور سخن گستری کا۔ ایک
ملکہ باقی ہے، بے تامل اور فکر جو خیال میں آجائے وہ لکھ لوں،
ورنہ فکر کی صعوبت کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ بقول مرزا عبدالقادر
بیدلؔ شعر:

جہدہا در خورِ توانائیست
ضَعف یکسر فراغ می خواہد[۳۷]

غالبؔ عمر کے تقریباً آخری حصے تک بیدلؔ کے اشعار سند کے طور پر پیش کرتے رہے۔ انھوں
نے مولوی ضیاالدین دہلوی کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

''یہ جو قبلۂ اہلِ سخن طوسی علیہ الرحمۃ کے یاں آیا ہے

ممیراُن کسے را وہرگز ممیر

مجاز ہے، امر بھی اور تعدیہ بھی، متاخرین میں سے بھی عبدالقادر
بیدلؔ کہتا ہے:

بمیر اے سرکشِ ناپاک دم بیاسائی''

ادبی معرکے کی وجہ سے غالبؔ بیدلؔ کے اثر سے تو باہر آگئے لیکن اُن کا احترام کرتے رہے اور
بیدلؔ اُن کے پسندیدہ شعرا میں شامل رہے۔

قاضی عبدالودود نے لکھا ہے:

''ابتدا میں غالبؔ پر بیدلؔ کا جو اثر تھا، اس کا خود انھیں اقرار
ہے، اور میرا خیال ہے کہ اس زمانے میں بھی جب وہ اسے نکمے
شاعروں میں شمار کرنے لگے تھے اس کے دائرۂ اثر سے باہر نہ
تھے۔ یہ بات اور ہے کہ ابتدا میں صرف بیدلؔ یا اس کے ہم

طرز شعرا سے متاثر تھے، بعد کو نظیری، عرفی، ظہوری، حزیں وغیرہ کا بھی اثر قبول کیا۔ ''بادِ مخالف'' اس زمانے کی تصنیف ہے جب غالب نے طرزِ بیدل کو بڑی حد تک ترک کر دیا تھا، لیکن اس کے باوجود انھوں نے اس کا ایک شعر بہ طور سند اس مثنوی میں شامل کیا ہے، اور اس کی شان میں، قلزمِ فیض'' اور '' صاحبِ جاہ و دستگاہ'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں (کلیات، ص ۹۴:)اشعار ذیل، جیسا کہ میں اپنے مقالے'' بادِ مخالف'' کی اوّلیں روایت (ایم۔آر۔اے مسلینی) میں دکھا چکا ہوں، اس مثنوی کی روایت میں نہ تھے، بعد کو بڑھائے گئے ہیں:

غالب آخر تک بیدل کے اشعار اظہارِ پسندیدگی کے ساتھ اپنے خطوں میں نقل کرتے رہے ہیں۔ ۳۸

دعویِ بندہ بے سر و بن نیست
شعرِ بیدل بجز تفنن نیست
پارہ ای از کلامِ اہلِ زباں
می فرستم بخدمتِ یاراں
(کلیات: ص ۹۵)''

غالب آخری عمر تک بیدل کے اشعار اظہارِ پسندیدگی کے ساتھ اپنے خطوں میں نقل کرتے رہے ہیں۔ ۳۸'' (الف)

پروفیسر محمد منور نے بیدل اور غالب کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

'' الفاظ کی حد تک میرزا غالب نے بیدل سے ضرور اکتسابِ فیض کیا ہے مگر تمام عمر بیدل کے معانی تک نہ پہنچ سکے''۔ ۳۹

پروفیسر صاحب کہتے ہیں کہ قاری اس وقت دھوکے میں مبتلا ہو جاتا ہے جب اس قسم کی غزلوں میں میرزا غالب مقطعے میں ظہوری یا عرفی کے کا ذکر کر دیتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق

میرزا غالبؔ صرف ان معاصرین کو ''غچّا'' دینے کی کوشش کرتے ہیں، جنھوں نے ان کی زندگی میں شور مچایا تھا کہ اتباع بیدلؔ کے اس قدر واضح شواہد باقی چھوڑ کر مرزا غالبؔ نے اعلان کر دیا ہے کہ ان کے کلام میں صوری اور معنوی محاسن بیدلؔ کے مرہون منت ہیں، پردہ اٹھایئے اور حقیقت دیکھیے۔ مرزا غالبؔ کو اچھی طرح علم تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ صحیح اس حقیقت کو پالے گا۔

بیدلؔ سے غالبؔ کے ذہنی رشتے کو تین زمانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا زمانہ وہ تھا جب غالبؔ بیدلؔ کے زبردست مداح تھے اور ان کی شاعری میں فکر اور اظہار دونوں سطحوں پر اُن کا تتبع کرتے تھے۔ دوسرا زمانہ کلکتے کے ادبی معرکے کے بعد شروع ہوتا ہے جب غالبؔ نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ وہ بیدلؔ کے اثر سے باہر آگئے ہیں اور اب بیدلؔ کے ہندوستانی فارسی شاعر ہونے کی وجہ سے اُن کا تتبع نہیں کرتے، بلکہ انھوں نے یہ بھی ثابت کیا کہ وہ کبھی بیدلؔ سے متاثر نہیں رہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے عمر کے آخر حصے تک وہ بیدلؔ کے اثر سے باہر نہیں آسکے۔ بیدلؔ ہمیشہ اُن کے پسندیدہ شاعر رہے۔ وہ اردو خطوں میں بیدلؔ کے اشعار نقل کرتے رہے۔ جب غالبؔ نے ''برہانِ قاطع'' کے جواب میں ''قاطع برہان'' تصنیف کی تو انھیں غلط فہمی ہوگئی کہ ہندوستان میں اُن سے بڑا کوئی فارسی داں نہیں پیدا ہوا تو انھوں نے غالباً مارچ/اپریل ۱۸۵۹ء میں پہلی بار بیدلؔ کے بارے میں تحقیر آمیز رویّہ اختیار کیا ہے۔ ایک خط میں چودھری عبدالغفور سرورؔ کو لکھتے ہیں:

> ''آرزوؔ، فقیرؔ اور شیداؔ اور بہارؔ وغیرہ ہم انھیں میں آگئے۔ ناصر علی اور بیدلؔ اور غنیمت، ان کی فارسی کیا؟ ہر ایک کا کلام بہ نظرِ انصاف دیکھیے، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا؟ مِنّت اور مکینؔ اور واقف اور قتیلؔ تو اس قابل بھی نہیں کہ ان کا نام لیجیے''۔[۴۰]

اگست ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں غالبؔ مرزا تفتہؔ کو ان کی غزل پر اصلاح دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''وہ شعر کس واسطے کاٹا گیا؟ سمجھو پہلا مصرع لغو، دوسرے مصرع میں ''نبرد'' کا فاعل معدول۔ ''حلقۂ زا'' کی زے پر

نقطہ نہ تھا۔ میں نے غصّے میں لکھا کہ نہ "حلقۂ چہرا" درست نہ "حلقہ زا" درست۔ مگر یہ فارسی بیدلانہ ہے، خیر رہنے دو"۔ [۱۴۱]

جولائی ۱۸۶۳ء میں خواجہ عبدالغفور سرور کے نام خط میں لکھتے ہیں:

"میرا قیاس اس کا مقتضی ہے کہ پیر و مرشد حضرت صاحبِ عالم مجھ سے آزردہ ہیں اور وجہ اُس کی یہ ہے کہ میں نے ممتاز و اختر کی شاعری کو ناقص کہا تھا۔ اس رقعے میں ایک میزان عرض کرتا ہوں۔ حضرت صاحب اِن صاحبوں کے کلام کو یعنی ہندیوں کے اشعار کو قتیل اور واقف سے لے کر بیدل اور ناصر علی تک، اس میزان میں تولیں۔ میزان یہ ہے۔

رودکی و فردوسی سے لے کر خاقانی و ثنائی و انوری وغیرہ ہم تک ایک گروہ، اِن حضرات کا کلام تھوڑے تفاوت سے ایک وضع پر ہے پھر حضرت سعدی طرزِ خاص کے موجد ہوئے۔ سعدی و جامی و ہلالی۔ یہ اشخاص متعدد نہیں۔ فغانی اور ایک شیوۂ خاص کا مبدع ہوا۔ خیال ہائے نازک و معانیِ بلند لایا۔ اس شیوے کی تکمیل کی ظہوری و نظیری و عرفی و نوعی نے۔ سبحان اللہ قلبِ سخن میں جان پڑگئی۔ اس روش کو بعد اس کے صاحبانِ طبع نے سلاست کا چربا دیا۔ صائب و کلیم و سلیم و قدسی و حکیم شفائی اس زمرے میں ہیں۔ رودکی و اسدی و فردوسی، یہ شیوہ سعدی کے وقت میں ترک ہوا اور سعدی کی طرز نے بہ سبب سہل ممتنع ہونے کے رواج نہ پایا۔ فغانی کا انداز پھیلا اور اُس میں نئے نئے رنگ پیدا ہوتے گئے۔ تو اب طرزیں تین ٹھہری ہیں۔ خاقانی اُس کے اقران، ظہوری اُس کے امثال۔ صائب اُس کے نظائر۔ خالصتاً للہ ممتاز و اختر وغیرہ ہم کا کلام اِن تین طرزوں میں سے کس طرز پر ہے؟ بے شبہہ

فرماؤ گے کہ یہ طرز اور ہی ہے پس تو ہم نے جانا کہ اُن کی طرز چوتھی ہے، کیا کہنا ہے، خوب طرز ہے، اچھی طرز ہے مگر فارسی نہیں ہے، ہندی ہے۔ دارالضرب شاہی کا سکّہ نہیں ہے، ٹکسال باہر ہے۔ داد، داد، انصاف، انصاف''۔[۴۲]

مرزا تفتہ کے نام کا خط' اردوے معلیٰ' مطبوعہ ۹/ مارچ ۱۸۶۹ء میں شامل ہے اور آخری دو خطوط، غالب کے خطوط کے مجموعے' عودِ ہندی' میں شامل ہیں جو غالب کی وفات سے لگ بھگ چار مہینے قبل اکتوبر ۱۸۶۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس وقت بھی بیدل کے مداحین کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ غالب نے بیدل کے بارے میں جو کچھ کہا تھا، وہ ان مداحین کو بہت ناگوار گزرا۔ اگرچہ غالب کا انتقال ہو گیا تھا، پھر بھی ایسی کم سے کم تین کتابیں شائع ہوئیں، جن میں بیدل کی حمایت کی گئی اور بیدل سے متعلق غالب کے خیالات پر ناگواری کا اظہار کیا گیا۔ پہلی کتاب' اسرارِ حسن' تھی۔ اس کے مصنف محمد احسن تھے[۴۳] دوسری کتاب' نمونہ مغلوبیتِ غالب''[۴۴] تھی۔ اس کے مصنف بھوپال کے شنکر پرشاد جوشؔ تھے۔

شنکر پرشاد جوشؔ نے' نمونہ مغلوبیتِ غالب' میں' کرامتِ بیدل' نام کی ایک کتاب کا بھی ذکر کیا ہے، جس میں بیدل کی مدافعت اور غالب کی مخالفت کی گئی ہے اور انھیں برا بھلا کہا گیا ہے۔' کرامتِ بیدل' کا ابھی تک کوئی نسخہ مجھے دستیاب نہیں ہوا۔

'عودِ ہندی' کی طباعت کے بعد اگر غالب سال دو سال اور زندہ رہ جاتے تو عین ممکن تھا کہ ایسا ہی ایک اور ادبی معرکہ وجود میں آ جاتا جو کلکتے کے ادبی معرکے اور'' قاطعِ برہان'' کے معرکے کی یاد تازہ کر دیتا۔

مولوی غیاث الدین عزّت

غالبؔ نے ہندوستان کے جن تین شاعروں اور فرہنگ نویسوں کی کڑی نکتہ چینی کی ہے، ان میں مرزا محمد حسن قتیلؔ اور عبدالواسع ہانسوی کے علاوہ تیسرا نام مولوی غیاث الدین عزت رام پوری کا ہے لطف کی بات یہ ہے کہ قتیلؔ اور عبدالواسع کی طرح غالبؔ کا مولوی غیاث الدین سے بھی براہِ راست کبھی کوئی مناقشہ نہیں ہوا، بلکہ ان دونوں کی سرے سے کبھی ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ غیاث الدین کا آبائی وطن رام پور تھا۔ اُن کے دادا مولوی شرف الدین اور والد مولوی جلال الدین دونوں صاحبِ علم و فضل تھے۔[1]

احمد علی شوقؔ نے غیاث الدین کا پورا نام مولوی غیاث الدین تخلص عزتؔ اور والد کا نام شرف الدین بتایا ہے[2] جو درست نہیں ہے۔ صحیح وہی ہے جو امیر مینائی نے لکھا ہے یعنی مولوی جلال الدین۔ خود غیاث الدین نے ''غیاث اللغات'' میں اپنے والد کا نام مولوی جلال الدین اور دادا کا نام شرف الدین لکھا ہے[3] احمد علی خاں شوقؔ کے قول کے مطابق غیاث الدین نے غلام جیلانی رفعت سے کتب درسیہ پڑھیں، مولوی نور النبی سے علمِ طِب کی تعلیم حاصل کی اور عنبر شاہ خاں عنبرؔ اور کبیر خاں تسلیمؔ کے شاگرد رہے۔ تلاشِ معاش میں لکھنؤ بھی گئے تھے۔ لیکن بہت جلد رام پور واپس چلے آئے۔

نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں دونوں غیاث الدین کے شاگرد تھے۔ رام پور سرکار سے وظیفہ مقرر تھا[4] مولانا امتیاز علی خاں عرشیؔ نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> ''رام پور کے نواب یوسف علی خاں ناظمؔ اور نواب کلب علی خاں نے فارسی کی تعلیم غیاث الدین عزت سے حاصل کی۔[5]

امیر مینائی کا بیان ہے کہ:-

> ''صاحبِ غیاث اللغات رام پور میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور وہاں کے دو حکمراں یوسف علی خاں و کلب علی خاں کے استاد تھے۔''[6]

۲۲/ذی الحجہ ۱۲۶۸ھ مطابق ۷/اکتوبر ۱۸۵۲ء کو غیاث الدین کا انتقال ہوا۔ احمد علی خاں شوقؔ نے ان کی تدفین کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"غیاث الدین، نواب دروازے کو جاتے ہوئے مفتی غلام حیدر کے مکان کے قریب چوراہے پر داہنے ہاتھ کو جو مسجد ہے، اُس میں دفن ہوئے۔"[۷]

سید مرتضیٰ حسین فاضلؔ کے قول کے مطابق:

"غیاث الدین کی تصنیفات کی تعداد خاصی ہے۔ انھوں نے ادب اور طِب دونوں موضوعات پر چالیس پچاس کتابیں لکھی ہیں"۔[۸]

عبدالرؤف عروجؔ نے اُن کی جن کتابوں کا تذکرہ کیا ہے، ان کی تفصیل اس طرح ہے:

"خلاصۃ الانشاء، رسالۂ عروض و قافیہ، افسانہ باغ و بہار، شرحِ مثنویِ غنیمت، شرحِ سکندر نامہ، شرحِ ابوالفضل، شرحِ گل کشتی، شرحِ بدر چاچ، مجرباتِ غیاثی، ازالہ اغلاط عربی و فارسی۔ خواص الادویہ، شرحِ گلستاں اور منتخب العلوم"۔[۹]

ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم نے غیاث الدین کی ذیل میں درج کچھ اور کتابوں کی نشان دہی کی ہے:

جواہر التحقیق، آمد نامہ فارسی، قصۂ شاہزادہ مہر نظیر و غیرہ ملکہ ماہ منیر، شرحِ سکندر نامہ، قصہ گل و گیندا، منتخب العلوم، منشآتِ عزت، رسائل مولوی غیاث الدین اور غیاث اللغات وغیرہ۔"[۱۰]

"غیاث اللغات" کے بارے میں خود اس کے مولف غیاث الدین کا بیان ہے:

"در عرصۂ چہار دہ سال بہ عبارتِ سہل عام فہم ایں کتاب (غیاث اللغات) تالیف نمودہ"۔[۱۱]

احمد علی خاں شوقؔ نے غیاث اللغات کی مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''حقیقت امر یہ ہے کہ غیاث اللغات ایک عرصۂ قلیل میں ملک میں مشتہر و مقبول ہو گئی نظر ثانی سے قبل ہی بہت سے لوگوں نے اس کی نقلیں لیں۔ ۱۲۶۵ء میں مطبع میرحسن رضوی، لکھنؤ میں پہلی بار طبع ہوئی اور مالک مطبع نے خود مصنف سے نسخہ منگوا کر تصحیح کر کے چھاپا اور اس کے بعد تو معلوم نہیں مختلف سے مطابع سے کتنی بار یہ کتاب چھپی۔''[۱۲]

بقول قاضی عبدالودود :

''غیاث الدین رام پوری مولف 'غیاث اللغات' سے غالب بہت بیزار ہیں، ان کی توہین میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے اور 'غیاث اللغات' کو وہ ایک نہایت لغو چیز سمجھتے ہیں۔ یہ اغلاط سے خالی نہیں، لیکن اسے کسی طرح نا قابل اعتنا نہیں کہہ سکتے۔ چناں چہ ایرانِ حال کے محقق بزرگ قزوینی نے ''المعجم فی معائر اشعار المعجم '' کے دیباچے میں اسے ''فرہنگِ نفیس'' کہا ہے، اور یہ چند سال قبل ایران میں بھی طبع ہوئی ہے۔

صاحب 'مویدِ برہان' نے ایک لفظ کی بحث میں لکھ دیا تھا کہ بظنِ غالب اس کتاب نے غالب کو گمراہ کیا ہوگا۔ غالب بپھر پڑے۔ مولف اور اس کی کتاب پر لعنت بھیجنے کے بعد فرماتے ہیں: رام پور میں وہاں کے صاحب زادگانِ عالی تبار اور روسای نامدار'' سے ملاقاتیں رہیں تو یہ معلوم ہوا کہ یہ شخص ایک گمنام مکتب دار ملا تھا جو نہ رئیسِ رام پور کا روشناس تھا، نہ اکابرِ شہر کا آشنا'' اس سے قطع نظر کہ علم کے لیے رئیس کی روشناسی اور اکابرِ شہر کی آشنائی ضروری نہیں، غیاث الدین کلب علی خاں اور ان کے والد یوسف علی خاں کے استاد تھے اور رام پور میں ان کی بڑی عزت تھی۔ یہ امیر مینائی کی ''انتخابِ یادگار'' سے ثابت ہے۔ شاگردی کا اقرار خود کلبِ علی خاں کی طرف

سے سمجھنا چاہیے، امیر مینائی نے نہ صرف اس کتاب میں، بلکہ ایک خط میں بھی لکھا ہے کہ اس کتاب میں جو کچھ ہے، ان کے حکم کے مطابق ہے۔ غالب اگر دو بار رام پور نہ گئے ہوتے اور غیاث الدین کے متعلق وہ بات کہتے جو اوپر منقول ہے، تو کہا جاسکتا تھا کہ انھیں غلط اطلاع ملی، یہ بات حد درجہ خلافِ قیاس ہے کہ رام پور کے صاحب زادگانِ عالی تبار اور روسای نامدار سے یہ معلوم ہوا ہو۔'' [۱۳]

ایران کے منصور ثروت نے بھی مولوی غیاث الدین کی 'غیاث اللغات' مرتب کی ہے۔ اُس کے پیش لفظ میں وہ لکھتے ہیں:

''و مدتِ چہاردہ سال در تدوینِ آں زحمت کشیدہ است۔ ایں فرہنگ ویژگیھائے ذیقیمتی دارد کہ از جملہ می تواں بہ موارد زیر اشارہ کرد'' ...... نکتہ ای کہ در کمتر فرہنگِ گذشتہ رعایت شدہ است، ذکر مآخذ و منابع در معانی لغت ھست۔ مولفِ غیاث در بسیار وسیع و بہ طور وسواس آلودی منابع در سخن خویش را ارایہ نمودہ است و ایں امانت داری در ذکر منبعِ سخن، ارزش والای بہ اثر او بخشیدہ است'' [۱۴]

غیاث الدین نے بعض دیگر علوم کے مباحث میں درجِ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔

''(۱) گلستاں، (۲) بوستاں (سعدی)، (۳) یوسف زلیخا (جامی)، (۴) نیرنگِ عشق (غنیمت)، (۵) انشاے امان اللہ حسینی، (۶) انشاے مادھورام، (۷) انشاے یوسفی، (۸) انشاے منیر، (۹) انشاے جامع القوانین (خلیفہ شاہ محمد) (۱۰) کشائش نامہ، (۱۱) طوطی نامہ (بخشی)، (۱۲) بہارِ دانش (عنایت اللہ) (۱۳) رسالہ عبدالواسع ہانسوی، (۱۴) مجمع الصنائع (نظام الدین احمد)، (۱۵) نصاب ابونصر فراہی، (۱۶) انوار سہیلی (کاشفی)، (۱۷) مکاتبات علامی ابوالفضل، (۱۸) انشاے طاہر وحید، (۱۹) نلدمن (فیضی)، (۲۰) سکندر نامہ،

(۲۱) مخزنِ اسرار (نظامی)، (۲۲) مثنوی و دیوان (ناصر علی)، (۲۳) دیوانِ صائب، (۲۴) دیوان حافظ، (۲۵) نثرِ ظہیری تفرشی (۲۶) قران السعدین (خسرو)، (۲۶) تحفۃ العراقین، (۲۷) قصائد خاقانی، (۲۸) قصائدِ انوری، (۲۹) توقیعات کسرٰی، (۳۰) گل کشتی میر نجات، (۳۱) زنانہ بازار، (۳۲) رقعات نثر ظہوری، (۳۳) رسائل طغرٰی (مشہدی)، (۳۴) حسن و عشق، (۳۵) مثنوی مولوی روم، (۳۶) اخلاق ناصری نصیر الدین طوسی، (۳۷) چار شربت از قتیل''۔[۱۵]

غیاث الدین نے اکثر الفاظ اور محاورات کی تحقیق کے لیے جن لغات سے استفادہ کیا ہے، اُن کے نام ہیں:

(۱) قاموس (شیخ مجد الدین فیروز آبادی)، (۲) صحاح (جوہری)، (۳) صراح (ابوالفضل محمد)، (۴) کنز اللغات (ملا رؤف)، (۵) منتخب اللغات (ملا عبدالرشید)، (۶) بحر الجواہر (محمد بن یوسف) (۷) لب الالباب (جلال الدین سیوطی)، (۸) کشف اللغات، (محمد عبدالرحیم)، (۹) مدار الافاضل (شیخ الہدا دسر ہندی)، (۱۰) موئد الفضلاء (محمد لاد)، (۱۱) لطائف اللغات (عبداللطیف)، (۱۲) فردوس اللغات (عبداللہ)، (۱۳) برہان قاطع''۔[۱۶]

جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ مولوی غیاث الدین کا شمار قتیؔل اور عبدؔالواسع ہانسوی کے ساتھ ان تین لوگوں میں ہے۔ جن کی فارسی دانی اور فرہنگ نویسی کا غالب نے کبھی اعتراف نہیں کیا۔ چناں چہ قاضی عبدالودود لکھتے ہیں:

''غالبؔ کی غیاث الدین سے عداوت کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ صاحبِ غیاث اللغات کے ہم عصروں میں بہت سے لوگ انھیں فارسی داں سمجھتے تھے اور فارسی دانی کے متعلق غالبؔ کا خیال تھا کہ:

ان آیۂ خاص است کہ برمن شدہ نازل[۱۷]

میرے خیال میں جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ غالب کی غیاث الدین سے کبھی ملاقات ہوئی اور نہ خط و کتابت۔ ایسی صورت میں یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ان دونوں کے درمیان کبھی کسی طرح کا اختلاف نہیں ہوا۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ غالب نے نواب انور الدولہ سعد الدین خاں بہادر شفق کے نام ۱۸۵۳ء میں جو خط لکھا تھا، اس میں غیاث الدین کو درج ذیل الفاظ میں کیوں یاد کیا۔ غالب لکھتے ہیں:

> ''غیاث اللغات ایک نام موقر و معزز۔ جیسے الفربہ خواہ مخواہ مرد آدمی۔ آپ جانتے بھی ہیں کہ یہ کون ہے؟ ایک معلم فرومایہ، رام پور کا رہنے والا۔ فارسی سے ناآشنائے محض اور صرف و نحو میں ناتمام۔ ''انشائے خلیفہ'' و منشات مادھو رام کا پڑھانے والا۔ چناں چہ دیباچے میں اپنا ماخذ بھی اس نے خلیفہ شاہ محمد و مادھو رام و غنیمت و قتیل کے کلام کو لکھا ہے۔ یہ لوگ راہ سخن کے غول ہیں۔ آدمی کے گمراہ کرنے والے۔ یہ فارسی کو کیا جانیں۔ ہاں طبع موزوں رکھتے تھے، شعر کہتے تھے۔''[18]

مرزا غالب شمس العلماء مولوی ضیاء الدین دہلوی (ف ۱۳۲۶ھ) کو لکھتے ہیں:

> ''نہ ایک نہ دو بلکہ ہزار دو ہزار فرہنگیں فراہم ہو گئیں۔ یہاں تک کہ قتیل نو مسلم لکھنوی اور غیاث الدین ملائے مکتب دار رام پوری اور کوئی روشن علی جونپوری اور کہاں تک کہوں کون کون، جس کے جی میں آئی وہ متصدی تحریر قواعد انشاء ہو گیا۔''[19]

اس خط میں غالب نے غیاث الدین سے اپنے اختلاف کی وجہ خود بیان کر دی۔ وجہ اختلاف یہ ہے کہ غیاث الدین نے اپنی لغت ''غیاث اللغات'' میں اپنے ماخذ کے نام بتاتے ہوئے قتیل کی ''چار شربت'' کا بھی ذکر کیا اور چوں کہ غالب، قتیل کے سخت ترین مخالف تھے، اس لیے انھوں نے غیاث الدین کو بھی بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا اور شفق کے نام ۱۸۵۳ء کے خط میں اُن تمام حضرات کو 'جاہل' اور 'راہ سخن کے غول' کہا، جنھیں غیاث الدین نے اپنا ماخذ بتایا تھا۔ ان لوگوں کے ساتھ غیاث الدین کو 'معلم فرومایہ' اور ''فارسی سے ناآشنائے محض کہہ کر بُرا بھلا کہا۔

غالب کا کہنا ہے کہ انھوں نے شروع سے آخر تک غیاث اللغات پڑھی تھی۔ انھوں نے یہ

بات ان الفاظ میں کہی ہے:

> ''ایک بار ''علم شے بہ از جہل شے'' کی رعایت کر کے اس کتاب کو سراسر دیکھ لیا۔ جب دیکھا کہ جابجا قتیل کے کلام کا حوالہ دیتا ہے اور ماخذ اُس کے فنِ لغت میں ''چار شربت'' اور ''نہر الفصاحت' (قتیل کی تصنیفات) ہیں۔ کتاب پر اور مولف پر لعنت بھیجی۔'' ۲۰

کلکتے میں حامیانِ قتیل کے ہاتھوں غالب کو جو رسوائی اٹھانی پڑی، اُس کی تلخ یادیں باقی تھیں۔ چوں کہ قتیل کے شاگرد اور مداح پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس لیے غالب احتیاطاً برملا قتیل کو کچھ نہیں کہتے تھے۔ لیکن قتیل اور غیاث الدین عزت سے اپنی شدید نفرت کا اظہار نواب انورالدولہ شفق کے نام غالباً پہلی بار ۱۸۵۳ء کے خط میں کیا ہے اور پھر تقریباً پانچ سال تک خاموش رہے۔ ان پانچ برسوں میں غالب کی فارسی اور اردو تحریروں میں غیاث الدین کے خلاف کوئی بات میری نظر سے نہیں گزری۔ میرا خیال ہے کہ جب غالب نے ''غیاث اللغات'' کا مطالعہ کیا تو اُس میں قتیل کا نام دیکھ کر بھڑک گئے اور انھوں نے نواب انورالدولہ شفق کے نام وہ خط لکھا جس کا اقتباس اوپر نقل کیا جا چکا ہے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے کے بھی ذاتی خطوط میں غالب نے قتیل اور غیاث الدین وغیرہ کو بُرا بھلا ضرور کہا لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کی ادبی زندگی کا شیرازہ بکھر چکا تھا اور غالب کے مخالفین تقریباً باقی نہیں رہے تھے۔ اسی لیے غالب نے قدرے آزادانہ طور پر قتیل اور دوسرے فارسی شاعروں اور فرہنگ نویسوں کو بُرا بھلا کہنا شروع کیا۔

جن دنوں غالب ''دستنبو'' لکھ رہے تھے تو انھوں نے بہت سے الفاظ کی خاص تحقیق کی تھی۔ غالباً اسی کا اثر تھا کہ اُن کے کلکتے کے زخم پھر تازہ ہو گئے۔ ۲۰ ستمبر ۱۸۵۷ء کو غالب نے تفتہ کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

> ''کاتب اِن اجزا کا، جن کی رو سے کاپی لکھی جاتی ہے، فارسی کا عالم ہے۔ علم اس کا غیاث الدین رام پوری اور حکیم محمد حسین دکنی سے زیادہ ہے۔ تصحیح سے غرض یہ ہے کہ کاپی سراسر موافق اُن اوراق کے ہو، نہ یہ کہ فرہنگوں میں دیکھا جائے گا۔'' ۲۱

غالب چودھری عبدالغفور سرور کے نام مارچ ۱۸۵۹ء کے خط میں صاحب عالم مارہروی سے

مخاطب ہیں۔ انھوں نے مسجع اور مرجز نثر پر بحث کر کے لکھا ہے:

''قتیل لکھنوی اور غیاث الدین ملاے مکتبی رام پوری کی سی قسمت کہاں سے لاؤں کہ تم جیسا شخص میرا معتقد ہو اور میرے قول کو معتمد سمجھے''۔[۲۲]

اسی خط میں غالب لکھتے ہیں:

''صاحب ''دستور شگرف'' کا کلام نص اور مولوی غیاث الدین کا کلام حدیث نہیں ہے۔'' [۲۳]

اصل فارسی کو اس کھتری بچے قتیل علیہ ما علیہ نے تباہ کیا، رہا سہا غیاث الدین رام پوری نے کھودیا۔ ان کی سی قسمت کہاں سے لاؤں جو صاحب عالم کی نظر میں اعتبار پاؤں۔ غور کرو کہ وہ خرانِ نا مشخص کیا کہتے ہیں اور میں خستہ و دردمند کیا بکتا ہوں۔ واللہ! نہ قتیل فارسی شعر کہتا ہے اور نہ غیاث الدین فارسی جانتا ہے۔ میرا یہ خط پڑھو، یہ نہیں کہتا کہ خواہی نہ خواہی پڑھو، قوتِ ممیزہ سے کام لو، ان غولوں پر لعنت کرو، سیدھی راہ پر آجاؤ، اگر نہیں آتے تو تم جانو۔ تمھاری بزرگی پر اور میرزا تفتہ کی نسبت پر نظر کر کے لکھا ہے:

نہیں کہتا کہ خواہی نہ خواہی میری تحریر کو مانو مگر اس کھتری بچے سے اور اس معلم سے مجھ کو کم تر نہ جانو۔'' [۲۴]

غالب اپنے ایک شاگرد قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی کے نام ۸/ستمبر ۱۸۵۹ء کے خط میں لکھتے ہیں:

''غیاث الدین رام پور میں ایک ملاے مکتبی تھا۔ ناقلِ عاقل جس کا مآخذ اور مستند علیہ قتیل کا کلام ہوگا۔ اس کا فنِ لغت میں کیا فرجام ہوگا۔

کیستم من کہ تا ابد بزیم

لاحول ولاقوۃ یہ مصرع میرا نہیں۔ ''تا ابد بزیم یہ فارسی لالہ قتیلؔ کی ہے۔''[۲۵]

تفتہؔ کے نام ۴؍ اکتوبر ۱۸۶۱ء کے خط میں غالبؔ لکھتے ہیں:

''میں ''برہان'' کا خاکہ اڑا رہا ہوں۔ ''چار شربت'' اور ''غیاث اللغات'' کو حیض کا لتہ سمجھتا ہوں۔ ایسے گم نام چھوکروں سے کیا مقابلہ کروں گا۔''[۲۶]

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں ممکن نہیں کہ غالبؔ کو اس کا علم نہ ہو کہ رام پور کے نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں دونوں غیاث الدین کے شاگرد رہے تھے۔ چوں کہ غالب دربارِ رام پور کے وظیفہ خوار تھے، اس لیے انھوں نے اپنے شاگردوں اور دوستوں کے نام نجی خطوں میں تو غیاث الدین پر تنقید کی اور انھیں بُرا بھلا بھی کہا لیکن کسی کتاب میں غیاث الدین کے بارے میں اپنی رائے کا برملا اظہار نہیں کیا۔ کیوں کہ انھیں اندیشہ تھا کہ اگر نواب رام پور کی نظر سے اُن کی یہ تحریر گزری تو وہ معتوب قرار دیے جاسکتے ہیں اور سو روپے ماہوار کا وظیفہ بھی بند ہوسکتا ہے۔ لیکن جب احمد علی احمد نے غیاث الدین کا نام لے کر غالب پر حملہ کیا تو اُن سے برداشت نہیں ہوسکا۔ اِس کا پس منظر یہ ہے کہ غالب کی ''قاطع برہان'' کے جواب میں آغا احمد علی احمد نے 'مویّد برہان' لکھی، جو کلکتے سے ۱۸۶۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں آغا احمد علی احمد نے لکھا کہ 'ظن غالب یہ ہے کہ عربی سے ناواقف غالبؔ کو غیاث الدین نے گمراہ کیا ہے۔' غالب سے یہ الزام کیسے برداشت ہوتا۔ پھٹ پڑے۔ اس الزام کا جواب دیتے ہوئے غالب اپنی کتاب ''تیغ تیز'' میں لکھتے ہیں:

''مولوی برہان پرست۔ فارسیمدال صفحہ ۱۰۱ میں 'موید برہان' کی ''فاژہ'' وخمیازہ' کی بحث میں لکھتا ہے۔ ظنِ غالب آنکہ غالبِ عربیمدان راغیاث گمراہ کردہ باشد، عیاذ أباللہ۔ اگر غالب جامعِ غیاث اللغات کو آدمی جانتا ہو، تو وہ خود آدمی نہیں۔ ایک بار ''علم شے بہ از جہل'' کی رعایت کر کے اس کتاب کو سراسر دیکھ لیا۔ جب دیکھا کہ جابجا قتیلؔ کے کلام کا حوالہ دیتا ہے اور مآخذ اس کا فنِ لغت میں ''چار شربت'' اور ''نہر الفصاحت'' ہے، کتاب پر اور مولف پر لعنت بھیجی۔ مدرّس جی

> اتنا نہ سمجھے کہ جو میاں انجو کو نہ مانے گا وہ میانجی غیاث الدین کو کیا جانے گا۔ بارے جب رام پور جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں کے صاحبزادگانِ عالی تبار اور رؤسائے نامدار سے ملاقاتیں اور صحبتیں رہیں تو اس شخص کا حال یہ معلوم ہوا کہ ایک ملائے مکتب دار تھا، نہ رئیس کا روشناس، نہ اکابرِ شہر کا آشنا۔ ایک گمنام ملا مکتب دار۔ چند صاحبِ مقدور لڑکے اُس کے مکتب میں پڑھتے تھے۔ انھوں نے صرفِ زر میں اُس کو مدد دی، مثل بندر کے جس نے نجاّر کی تقلید کی تھی۔ ایک فرہنگ لکھ کر چھپوائی۔ خدا کا شکر ہے کہ غالب مانند مدرّس صاحب کے ہر دلعزیز نہیں۔ گل محمد خاں بلوچ کو ایرانی اور سراج الدین علی خاں آرزو کو نواب اور لالہ ٹیک چند کو راجہ کبھی نہ لکھے گا۔“[۲۷]

نوابانِ رام پور سے غالب کے بہت قریبی تعلقات تھے۔ جب نواب یوسف علی خاں تعلیم حاصل کرنے دہلی آئے۔ یہاں نواب صاحب کی فارسی تعلیم غالب کے سپرد کی گئی تھی۔ ۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علی خاں تخت نشین ہوئے تو ۲۵ر فروری ۱۸۵۷ء میں نواب صاحب شاعری میں بھی غالب کے شاگرد ہوگئے۔ ۱۹ر جنوری ۱۸۶۰ء کو غالب دلّی سے روانہ ہوکر ۲۷ر جنوری کو رام پور پہنچے۔ ۱۷ر مارچ ۱۸۶۰ء کو رام پور سے روانہ ہوکر ۲۴ر مارچ ۱۸۶۰ء کو دلّی پہنچ گئے۔

۲۱ر اپریل ۱۸۶۵ء کو نواب یوسف علی خاں کا انتقال ہوگیا اور نواب کلب علی خاں تخت نشین ہوئے تو مبارک باد دینے کے لیے غالب ۷ر اکتوبر ۱۸۶۵ء کو رام پور کے لیے روانہ ہوئے اور ۱۲ر اکتوبر کو رام پور پہنچے اور ۸ر جنوری ۱۸۶۶ء کو دلّی واپس آئے۔ گویا غالب نے دوبار رام پور گئے اور تقریباً تین مہینے اس شہر میں مقیم رہے۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ اس دوران غالب کو یہ علم نہ ہوا ہو کہ نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں دونوں غیاث الدین کے شاگرد تھے اور غیاث الدین کا شمار ممتاز اہلِ علم میں ہوتا تھا۔ اس سب کے باوجود غالب نے غیاث الدین کے بارے میں جو کچھ لکھا، وہ صریحاً غلط اور دیانت داری کے خلاف تھا۔ غالب کی ”تیغ تیز“ ۱۸۶۷ء میں شائع ہوئی۔ ہمیں اس کا علم نہیں، کہ اپنے استاد مولوی غیاث الدین کے بارے میں غالب کی یہ تحریر نواب کلب علی خاں کی نظر سے گزری یا نہیں اور گزری تو اُن کا ردِّعمل کیا تھا۔

غرض یہ ہے کہ مولوی غیاث الدین سے غالبؔ کا معرکہ یک طرفہ تھا۔ کیوں کہ غالبؔ کی غیاث الدین سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی اور نہ کبھی کسی معاملے میں اختلاف ہوا۔ کلکتے میں مرحوم قتیلؔ کے نام پر جو معرکہ ہوا تھا، غیاث الدین سے معرکہ اسی کا نتیجہ تھا۔ قتیلؔ، غیاث الدین، عبدالواسع ہانسوی اور ہندوستان کے دوسرے فارسی فرہنگ نویسوں اور شاعروں کے خلاف کلکتے کے ادبی معرکے میں پیدا ہونے والی تلخی کا اظہار تھا۔

غالب کے ایک شاگرد ابوالفضل محمد عباس رفعت شروانی بھوپالی نے ''غیاث اللغات'' پر تنقیدی تحریر لکھی تھی جو شروانی کے شاگرد سید جعفر حسین دیوبندی نے نقل کی ہے۔ (مکتوبات جعفری) مجموعہ خطوطِ سید جعفر حسین مع حالات کا قلمی نسخہ ڈاکٹر محمد ایوب قادری کی ملکیت تھا۔ اُن کی وفات کے بعد نہ جانے اس مخطوطے پر کیا بیتی اور اب یہ کہاں ہے۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے اپنے مقالے'' غالب اور غیاث اللغات'' (مشمولہ غالب اور عصرِ غالب، کراچی، ۱۹۸۲ء ص ص ۴۸۔۷۵) میں لکھا ہے۔

چوں کہ یہ تنقیدی تحریری بہت اہم ہے اور پہلی بار شائع ہوئی ہے۔ اس لیے یہاں پوری تحریر نقل کی جاتی ہے۔

> ''روزے در حضاران محفل نعیم مشاغل عمدہ امرایان زماں ومنشی و شاعر یکتا جہاں مدارالمہام منشی جمال ادلین خاں صاحب بہادر نائب اول ملک محروسہ بھوپال حاضر بودم معزی الیہ قدح تعزیہ می نمودہ بودند۔ در اثنائے اشغال و خلال ایں حال کتاب غیاث اللغات برداشت ومعنی تعزیہ ماتم پرسی کردن بر آمد از دیدنش برہم خاطر بودہ سویم نگریست ومخاطب شدہ فرمود کہ ماتم پرسی کردن چہ معنی دارد۔ راقم بشکوہ محفل وے تبسم کناں پاسخ سوخت وہیچ پاسخ نداد پس آں کتابے از لغات تازی طلبیدہ دید ،نوشتہ بود کہ بصیر وشکیبائی غم زدگان رفتن، از معائنہ ایں معنی وحل مشکل مالا ینحل از برہمی و درہمی برآمدہ بشاشت بر چہرہ پاکش راہ یافت و زباں بخوشا آفریں مصنف ومؤلف لغت تازی کشادو برنادانی وژاژ خواہی ملا غیاث رام پوری بسیار خندید دہم روزے ہنگام شب ابوالفضل دوراں مولانا محمد عباس

خاں استاد من بر مکانم از غایت کرم چوں آیۂ رحم نزول داشتند ۔ پیش شمع چراغ کتاب غیاث نہادہ بود ۔ بروش تفنن برداشتہ و بردست نازک خویش نہادہ و از صوب راست کشادہ سیر کردن سر کرد و قریب دو سہ سطر خواندہ بود کہ ناگرفت بد دماغ شہ و چیں بجبیں آوردہ فرمود خامہ بیار ، نیاز مند دست دراز کردہ قلم داں برداشتہ پیش نہاد ، آں گراں مایہ از دست بیضا کار باصلاح لفظ بکتاش نوشت ۔

بکتاش کہ بکتاش نام از یکے اکابر صوفیہ بود کہ بزعم اہلِ روم ولی کامل گزشتہ است و اکثر مردم روم مرید و معتقد اویند و معائنہ فرمود ، باز نجندید و از امواج بحر ذخار خاطر عاطر خود جوشیدہ بر لفظ ہزار جریب و ہمخوابہ اصلاح داد ۔

ہزار جریب کہ ہزار جریب نام باغ شاہ عباس در اصفہاں ہمخوابہ بمعنی زوجہ نہ ایں کہ صاحب غیاث نوشتہ کہ ہزار جریب نام مقام کہ مسکن شیعاں است در ایران و ہمخوابہ در آخر ایں لفظ ہاز ائد است و معنی ندارد و از آنجا گزاشتہ از پیش بکشاد ہماں حال پیش آمد ،

آخر کار ملخص کلام ایں کہ کتاب از دست دور ساختہ فرمود اگر صحیفہ ہذا از آغاز تا انجام بسہولت تمام بتماشاے آورم ، ربع کتاب بیکار خواہد برآمد ، فی الواقع کلام مالا کلام است ، از ملا بسا غلطی ہاے فاش سرزدہ اند ۔

بوقلموں مولانا صاحب ممدوح در یکے از انشاے پارسی صد برگ نام بوقلموں بمقامے نبشتہ اند مرا از دیدنش حیرت افزود کہ صاحب غیاث "بوقلموں" را لفظ عربی تحقیق کردہ است ، ہماں دم ایں گفتگو ہم پیش نمودم نجندید و گفت "بوقلموں" نام گلیست کہ آنرا "گل آفتاب پرست" نیز گویند ، بہر جائیکہ آفتاب برمی گردد او نیز برمی گردد و در تمام روم برنگ دگر نماید و در ملک

ایران برکوہ الوند اکثر می روید ہندیاں اور سورج مکھی گویند۔ صانعان روم و چین و فرنگ بساں رنگ مختلف دیبائے می بافتند کہ امروز در ملکِ ہندوستان یافتہ می شود و ہندیاں اورا، ' دھوپ چھاؤں'' گویند حکیم حاذق پسر حکیم ہمام اکبری در مثنوی طلسم گنج کہ سامان صبح می نویسد آوردہ۔

ز سوراخ بروں کرد سر   بو قلمون دوخت سوئے مشرق نظر

و بوقلموں اغلب فارسی است۔

ابنائے روزگار اور امستندمی دانستند و از نادانی بروشوق آں محاورہ را باوجِ فلک الافلاک کشیدہ است۔

پائے خاکی کردن چنانچہ ملا آوردہ کہ پائے خاکی کردن بمعنی پیادہ رفتن محض غلط و خطا است زیرا کہ پائے خاکی کردن بمعنی پاتر اب است چنانکہ رسمیت کہ قبل یک روز از روانگیِ سفر بنا بر لحاظ ساعتِ سعد و نحس خود را بیروں شہر برند و روز دیگر او براہ نہند نہ اینکہ تا کلکتہ ولندن خود را پیادن بردن۔

کودن و آنکہ صاحبِ غیاث لفظ کودن را بحوالۂ قاموس لفظ عربی نوشتہ در قاموس یافتہ نشد، صاحب برہان معنی آں مردم کمینہ و دوں و کم عقل و ناداں و کندفہم و کج طمع می نویسد و ایں لفظ اغلب فارسی است

کنیسہ و کنیسہ لفظ عربی است و معنی آں معبد یہود و نصاریٰ و کفار چنانکہ صاحب قاموس گوید، کنیسہ معبداں یہود و النصاریٰ و نصاری و کفار چنانکہ صاحبِ قاموس گوید کنیسہ معبدان یہود و النصاری و الکفار، پس انچہ صاحب غیاث د برہان معبد گبراں نوشتہ غلط است۔

سر بخش و صاحب غیاث سر بخش بمعنی حصہ و حصہ کلاں آوردہ، دریں ہم کلام است زیرا کہ صاحب فرہنگ دساتیر بخش۔ بمعنی

سرآمد و مقتدیٰ آوردہ۔

مولوی حکیم نجم الغنی خان رام پوری نے بھی غیاث اللغات میں دیے گئے بعض الفاظ کے معنی پر اعتراضات کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

(۱) لفظ سفسطہ کو جو لفظ فارسی سے ہے غیاث اللغات میں سقسطہ قاف سے لکھ دیا ہے۔

(۲) تکسینان اور بگتیناں لکھا ہے۔ حالاں کہ لفظ اوّل میں پہلا حرف تاے فوقانی اس کے بعد کاف تازی اس کے بعد سین مہملہ ہے۔ انھوں نے پہلا حرف یاے موحدہ دوسرا قاف فارسی تیسرا تاے فوقانی قرار دیا ہے اور لفظ تکسین، تحسین کا ہم وزن ہے جیسا کہ انجمن آراے ناصری میں مذکور ہے۔

(۳) میر کو امیر کا مخفف کہا ہے اور یہ بھی غلطی ہے۔ اس لیے کہ امیر اسم فاعل عربی کا ہے اور میر ترکی کا لفظ ہے۔ سردار کے معنی ہیں جیسے میر لشکر، میر شب، میر آب، میر ساماں، میرزا جیسا کہ "کلیاتِ صہبائی" میں مرقوم ہے۔

(۴) عبدالملک بن مروان کو بغداد کا خلیفہ بتایا ہے۔ حالاں کہ بغداد کی خلافت مروانیوں کے بعد بنی عباس سے شروع ہوئی ہے۔

(۵) بحر کی جمع ابحار بتائی ہے اور یہ صحیح نہیں اس کی جمع بحار، بحور اور ابحر ہے۔

(۶) رانا لقب راجا جے پور کا بتایا ہے اور یہ غلطی ہے۔ یہ لقب والیانِ اودے پور ملک میواڑ کا ہے۔ ان کا یہ لقب رانا راہب کے عہد سے مقرر ہوا ہے۔ متاخرین کا مہارانا لقب قرار پایا اور والیٔ گوہد کا بھی رانا لقب تھا، جس کی اولاد کے قبضے میں دھولپور کی ریاست ہے۔

(۷) منتخب اللغات اور رسالہ معربات کے حوالے سے لکھا ہے کہ طبرزد طاے حطی و دال مہملہ کے ساتھ تبرزد کا معرب ہے۔ حالاں کہ ان

کتب میں لفظ معرب کو ذال معجمہ کے ساتھ بتایا ہے۔ ۲۸

مولوی حکیم نجم الغنی خاں رام پوری نے اپنی ایک دوسری تصنیف 'نہج الادب' میں 'غیاث اللغات' پر ان الفاظ میں اظہارِ خیال کیا ہے۔

''ایں کتاب در عصر ما بسببِ استعمال بر تحقیق حلیہ و معانی لغات ضروریہ کثیر الاستعمال عربیہ و فارسیہ و ترکیہ و کنایات و اصطلاحات و مباحث بعض علوم وصحت اکثر الفاظ و محاورات کتبِ مروجہ نظم و نثرِ فارسی و دیگر کتب طبیہ وغیرہ ایں زبان شہرتے گرفتہ کہ مافوقش متصور نیست ایں کتاب بسیار سہم عام فہم استو در بعض جابرائے آسانی تفہیم اشکال ہم تحریر نمودہ و بنابر سند تحت ہر لغت نام کتابے کہ آں لغت ازاں بہ تحقیق رسیدہ مرقوم کردہ مگر بعض جا ایں التزام ترک نیز شدہ است و اختلاف و اتفاق کتب ہم بیان ساختہ اما محتوی است بر امرے چند کہ احتراز و اجتناب ازاں لازم چنانچہ جائے کہ طویل مطلب بود ایجاز مخل نمودہ و جائے کہ اختصار مقصود بود طول لا طائل فرمودہ و غلط معنی و تحریف و تصحیف نیز دراں موجود است۔ چنانچہ از تحریفات و تصحیفات جیدہ او آں است''۔ ۲۸

تیمور۔ در لفظ تیمور گفتہ است کہ یاد و واو خواندن نمی آید چراکہ علامت کسرہ وضمہ است ایں ہم بہ شہادت عجائب المقدور فی اخبار تیمور غلط است چہ مصنفش اصل نام آں پادشاہ تیمور بروزن ذی نور نگاشتہ است و تمر وغیرہ از تصرفات نگاشتہ۔

بابا کپور۔ دہم از تصرفات اوست بابا کپور شخصے کہ فقیر تنگ نوش شبود انتہی، مؤلف گوید شاہ عبدالغفور عرف شاہ کپور مجذوب از اولیائے کرام است و مزار فائض الانوار آں جناب در قلعہ گوالیار است در منتخب التواریخ مذکور است کہ از سادات حسینی بود در ابتدائے حال سپاہگری می کرد یکبار نوکری ترک کردہ بہ سقائی مشغول شد و شبانہ خانۂ عورات بیوہ مستورہ آب رسانیدے و خلائق را بے اجرت آب دادے آں کہ جذبہ رسید و از کاروبار ماندہ ترک اختیار کردہ بطریق محاورہ سخن نکردے و

پیوستہ مستہلک بودے و ہمیشہ سرافگندہ در مراقبہ می گزرانید، شیخ فیضی تاریخ اورا کپور مجذوب یافتہ جاجم بحوالہ برہان قاطع نوشتہ کہ جاجم لفظ ترکی ست و برہان ازیں تصریح ساکت است۔ نوشادر۔ از برہان نقل کردہ کہ نوشادر مرکب ست از نوش بمعنی تریاق و آدر بمعنی آتش یعنی تراقے ست کہ ازیاں آتش بہم می رسد و ایں ہم افترا است در برہان ازیں چیزے نیست۔

غشر گاؤ۔ بالفتح نوعے از گاؤ ست کہ از دو آں پرچم علم و مگس راں سازند و آں گاؤ در کوہستان کہ مابین خطاء و ہندوستان است بہم می رسد بہ ہندی آں را سرا گائے گویند بہ ضم سین مہملہ از صراح حالانکہ در صراح ازیں مضمون چیزے نیست و انچہ در صراح آمدہ ایں است مہاۃ گاؤ دشتی مہا بالقصر جمع مہوات، کذلک در نفائس اللغات در ذیل سرا گائے نوشتہ کہ بہ عربی آں را مہاہ بہ فتح میم وہا بہ الف کشیدہ گوید صاحب منتخب اللغات ترجمہ مہا گاواں وحشی کردہ و از محیط اعظم مستفادمی شود کہ گاؤ وحشی اسم نیم گاؤ است کہبہ فارسی نیلہ گاؤ و بہ عربی بقرالوحش و بہ ہند روجھ نامند فی الجملہ شبیہہ بہ گاؤ است و شاخہائے آں بے شعبہ و مشابہت بہ گوزن ندارد۔

مولوی حکیم نجم الغنی خاں ایک بات کی طرف اور اشارہ کرتے ہیں کہ:

''در بسیارے از لغات معانی لغوی را کہ وظیفۂ ارباب لغت است فروگذاشتہ و معانی اصطلاحی را کہ موضوع فن غیر بود نگاشتہ مثلاً۔

زکوٰۃ۔ در زکوٰۃ می گوید چہلم حصہ از مال کہ بعد از سالے در راہ خدا دہند و اقل درجہ آں مال دو صد درم ست و معنی لغوی زکوٰۃ را نہ نوشتہ در نورالانوار گوید'' الزکوٰۃ معناہ فی اللغت النماء'' در صراح گفتہ نمو بہ ضمتین گوالیدن نماء بالمد مثلہ و گوالیدن بمعنی بالیدن ست پس زکوٰۃ دراصل لغت بمعنی بالیدن است چنانچہ از قاموس وغیرہ نیز ہمیں مستفاد می شود۔

دیجور۔ در دیجور می نویسد کہ برہان بمعنی سیاہ و تاریک نوشتہ و قید شب

نکردہ حالانکہ برہان می گوید دیجور بفتح اول بروزن طیغوز، شبے را گویند کہ بہ غایت سیاہ وتاریک باشد۔

باشد ودر لفظ باز گوید کہ ہر چند لفظ باز، بمعنی وقت ہنگام در لغت نیامدہ مگر در کتب درسی فارسی مثل ظہوری وابوالفضل وغیرہ چند جا واقع شدہ چنانچہ بر متتبع متامل پوشیدہ نیست انتہی، حالانکہ لفظ باز بمعنی وقت و ہنگام در کتب لغت آمدہ است چنانچہ در بہارِ عجم مذکورست، باز جانور معروف ونیز بمعنی وقت وزماں چوں ازاں باز چنانچہ دریں بیت میر معزی کمال دولت عالی ستودہ بورضا کورا نبود اندر بنر

ہمتا ز آدم باز تا اکنوں

زیرہ کرمانی زیرہ کرمانی را کہ رلم زیرہ سیاہ است زیر بکرماں نوشتہ وایں خلاف ست مہاراج۔ می گوید مہاراج بالفتح لقب بادشاہ زنگ وقیاس می خواہد کہ لقب سلاطین خلف باشد انتہی کلامہٗ خلاف تحقیق است وصحیح آں ست کہ معنی مہراج بہ فتح میم راجہ بزرگ است یعنی شاہ بزرگ چہ مہ مخفف مہاست کہ بہ فتح میم وہا بہ الف کشیدہ در لغت ہندی بمعنی بزرت ست وراج در لغت ہندی بمعنی حاکم دغِ عظمت وعزت باشد و ایں لفظ بر راجہئے ہند اطلاق می یا بدو ہندوانِ واجب التعظیم را نیز مہراج می گویند ومہراج بکسر اول در مملکت ہندوستان بادشاہ بزرگ بودہ ودریں ولایت اورا بہ منزلہ جمیشد وفریدوں می شمردند و بلدہ بہار ازابنیہ او بودہ راجہ پیگو وتلنگ و ملا بار از متابعان او بودند و مالچند سپہ سالار او بودہ مملکت مالوہ بہ اسم وے معروف ست وقلعہ گوالیار از بنا ہائے مالچند بودو در آخر عہد مہراج بہو براور زادہ اش از ورنجیدہ بہ ایران آمد وزابلستان وسند بود وگرشاسپ بہ حمایت او باسپاہے بزرگ بہ اذن ضحاک متوجہ شد ودر پنجاب با مالچند سپہ سالار مہراج مقابلہ ومقاتلہ کردہ برا ومظفر شدہ ہندوستان رگتہ بالآخر مہراج بعض از بلاد را بہ برادر زادہ خود گزاشتہ باتر شاسپ مؤدت ومصالحت کردہ ودر گرشاسپ نامہ حکیم اسدی طوسی مسطورست چنانکہ گفتہ اندر۔ا

غالبؔ اور عبدالواسع ہانسوی

عبدالواسع ہانسوی کی ایک غلطی غالبؔ کی نظر میں آگئی۔ اُنھوں نے آسمان سر پر اُٹھالیا۔ کئی شاگردوں اور دوستوں کے نام خطوط میں اس غلطی پر ہانسوی کو برا بھلا کہنا شروع کردیا۔

اردو میں ہانسوی کی اہمیت اُن کی لغت 'غرائب اللغات' کی وجہ سے ہے۔ غالبؔ کو ہانسوی کی لغت کا شاید علم نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو اُس کی لسانی اہمیت سے واقف نہیں تھے۔ کیوں کہ اُنھوں نے غالباً 'غرائب اللغات' کا کہیں ذکر نہیں کیا۔

عبدالواسع ہریانہ کے ایک قصبے ہانسی کے رہنے والے تھے۔ ان کے سوانح کے بارے میں ہمیں کچھ نہیں معلوم۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ "ہم اُن کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ جانتے ہیں کہ وہ اورنگ زیب عالمگیر (سترھویں صدی کے اواخر) کے زمانے کے بزرگ ہیں۔ اُنھوں نے فارسی میں کچھ کتابیں لکھی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تصانیف اُن کے زمانے میں تدریسی حلقوں میں بہت مقبول تھیں مگر تذکروں میں اُن کے حالات نہ ملنے کی وجہ سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ملک کے بلند پایہ علمی حلقوں میں اُن کو ممتاز مقام نصیب نہیں ہوا۔"[1]

'غرائب اللغات' سترھویں صدی کے اواخر یا اٹھارویں صدی کے آغاز میں لکھی گئی۔ یہ اردو کی لغت تو ہے ہی، اس کے علاوہ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ اس لغت کی اہمیت یہ بھی ہے کہ:

> "یہ بڑی مفید کتاب ہے کیوں کہ اس سے ہریانہ، دہلی اور اُس کے مضافات بلکہ شمالی ہندوستان کی رائج الوقت اردو زبان کے ایک تاریخی دور پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ غالباً اسی وجہ سے اپنے زمانے میں 'غرائب اللغات' کی یہ اہمیت تسلیم کی گئی۔ چناں چہ خان آرزو جیسے محققِ فاضل نے اس کو قابلِ اعتنا خیال کیا۔"[2]

سراج الدین علی خاں آرزو نے 'غرائب اللغات' کی اتنی غلطیاں نکالیں کہ پوری ایک کتاب بن گئی۔ آرزو نے اس کتاب کا نام 'نوادرالالفاظ' رکھا۔

خان آرزو نے 'نوادرالالفاظ' کی تصنیف کا سبب اس کتاب کے دیباچے میں یہ بتایا ہے کہ:

> "فقیر حقیر (سراج الدین علی خاں آرزو) کہتا ہے کہ ہندوستان جنّت نشان کے ایک فاضل کامگار اور عالمِ نامدار نے 'غرائب اللغات' کے نام سے ایک لغت تصنیف کی ہے، جس میں ہندی کے اُن الفاظ کے معنی بتائے گئے ہیں جو فارسی، عربی اور ترکی میں کم مستعمل ہیں۔ الفاظ کے معنی میں جو سقم نظر آئے وہ تحریر کردیے، جہاں مولف کے سہو نظر آئے اُن کی نشان دہی کردی ہے۔"[۳]

آرزو نے عبدالواسع ہانسوی کی بے شمار غلطیاں نکالی ہیں۔ اس کے باوجود اُن کا لب ولہجہ بہت شائستہ اور مہذب رہا ہے۔

میر عبدالواسع ہانسوی نے رسالہ عبدالواسع ہانسوی میں لکھا تھا:

> "فرق درمیانِ نفی بکلمہ 'نا' و 'بے' لفظِ 'نامراد' کہ درعرفِ عام شہرت دارد غلط محض است۔ بے مراد...... باید گفت۔"[۴]

یہ حقیقت ہے کہ یہاں ہانسوی کا بیان درست نہیں ہے۔ غالب کی نظر میں ہانسوی کی یہ غلطی آگئی۔ انھوں نے طویل عرصے تک ہانسوی کو نہ صرف برا بھلا کہا بلکہ دشنام طرازی پر اُتر آئے۔

غالب صاحب عالم مارہروی کے نام اپریل ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> "وہ میاں صاحب ہانسی کے رہنے والے، بہت چوڑے چکلے، جناب عبدالواسع فرماتے ہیں کہ "بے مراد" صحیح اور "نامراد" غلط۔ ارے تیرا ستیاناس جائے "بے مراد" اور "نامراد" میں وہ

> فرق ہے جو زمین و آسمان میں ہے۔ ''نامراد'' وہ کہ جس کو کوئی مراد، کوئی خواہش، کوئی آرزو بر نہ آوے۔ ''بے مراد'' وہ کہ جس کا صفحۂ ضمیر نقوشِ مدعا سادہ ہو، از قسم ''بے مدعا'' و ''بے غرض'' و ''بے مطلب'' **حسبۃً للہ**۔ ان دونوں امروں میں کتنا فرق ہے۔ ''ناپروا'' اور ''ناکام'' اور ''نادرست'' اور ''ناچار'' کہ یہ ''مخفف'' ناچارہ اور ''ناہار'' کہ یہ مخفف نہ ''اہار'' ہے اور ''نامراد'' اور ''ناانصاف'' یہ سب درست ہیں، ہاں کہاں گئے ہانسی والے معلم؟''[۵]

مرزا تفتہ کے نام ۲۷ر اگست ۱۸۶۲ء کے خط میں غالبؔ نے عبدالواسع ہانسوی اور قتیلؔ کو گالیوں سے نوازا ہے۔ غالبؔ لکھتے ہیں:

> ''سنو میاں! میرے ہم وطن یعنی ہندی لوگ جو وادیِ فارسی دانی میں دم مارتے ہیں، وہ اپنے قیاس کو دخل دے کر ضوابط ایجاد کرتے ہیں۔ جیسا وہ گھاگھس، اُلّو عبدالواسع ہانسوی لفظ ''نامراد'' کو غلط کہتا ہے اور یہ اُلّو کا پٹھا قتیلؔ ''صفوت کدہ و شفقت کدہ'' و ''نشتر کدہ'' کو اور ''ہمہ عالم'' و ''ہمہ جا'' کو غلط کہتا ہے۔ کیا میں بھی ویسا ہی ہوں جو ''یک زبان'' کو غلط کہوں گا؟ فارسی کی میزان یعنی ترازو میرے ہاتھ میں ہے۔ لِلّٰہِ الحمدُ ولِلّٰہِ الشکر۔''[۶]

غالبؔ نے غلام غوث خاں بے خبر کے نام ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں تقریباً دو صفحے میں ''نامراد'' اور ''بے مراد'' کا فرق بیان کیا ہے۔ حالاں کہ یہ مسئلہ ہرگز اس قابل نہیں تھا کہ اس پر اتنا وقت ضائع کیا جاتا۔

عبدالواسع ہانسوی کا علمی دنیا میں کوئی بڑا مقام نہیں تھا۔ غالبؔ نے چودھری عبدالغفور سرورؔ کے نام ایک خط میں ہانسوی کا ذکر قتیلؔ اور واقفؔ جیسے ممتاز لوگوں کے ساتھ اس طرح کیا ہے۔

"سمجھو، عبدالواسع پیغمبر نہ تھا، قتیلؔ برہما نہ تھا، واقفؔ غوث الاعظم نہ تھا۔ میں یزید نہیں ہوں، شمر نہیں ہوں۔ مانو نہ مانو، تم جانو۔" غالبؔ کے اس بیان سے عبدالواسع، قتیلؔ اور واقفؔ کے ہم مرتبہ ہو گئے۔

نامراد اور بے مراد کے بارے میں ہانسوی کے بیان پر غالبؔ کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ 'نامراد' وہ کہ جس کی کوئی مراد، کوئی خواہش، کوئی آرزو بر نہ آوے 'بے مراد' وہ کہ جس کا صفحۂ ضمیر نقوشِ مدعا سے سادہ ہو۔ بے مدعا، بے غرض و بے مطلب ہو۔"

مگر یہ بات ایسی نہیں تھی، کہ غالبؔ ہانسوی کے خلاف اتنا بڑا طوفان کھڑا کرتے۔ دراصل غالبؔ ہانسوی کا سہارا لے کر ہندستانی فارسی دانوں کو غیر مستند کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

غالبؔ در مدحِ خود

غالبؔ اردو اور فارسی شعروادب کی دنیا میں تاریخی شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ نہ صرف انیسویں صدی کے بلکہ آنے والے زمانوں کے بھی ایک عظیم شاعر ہیں۔ یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہو کہ غالب اپنے عہد میں ہندوستان کی تمام زبانوں کے سب سے سربلند اور ممتاز شاعر تھے۔ غالب اردو کے وہ پہلے شاعر ہیں، جن کی بدولت اردو شاعری کو بین الاقوامی سطح پر قبولیت اور شہرت حاصل ہوئی۔ اُن جیسی شہرت حاصل کرنے والے ان کے بعد اردو میں دوسرے شاعر صرف اقبالؔ ہی ہیں لیکن اُن کی شہرت میں فن شاعری کے علاوہ کچھ اور اسباب کو بھی دخل تھا۔

کسی بھی بڑے فن کار کے ہاں اپنی بڑائی کا احساس ایک فطری سی بات ہے۔ بڑائی کا یہی احساس جب ایک نفسیاتی گرہ بن جاتا ہے اور ایسا زیادہ تر بڑے فن کاروں کے ساتھ ہی ہوتا ہے، تو وہ انانیت کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ شعر میں شاعر کو اس بات کا موقع حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنی انا کا اظہار براہِ راست کرنے کے بجائے تعلّی کے حیلے سے کرسکتا ہے۔ اسی کے ساتھ انا کا تخلیقی اظہار اُسے کریہہ اور بدنما ہونے سے بچالیتا ہے۔ 'ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرف دار نہیں' مصرعے میں شاعر نے (جو خود غالب ہی ہیں) غالب کو ایک طرف کرکے اپنی سخن فہمی کا دعویٰ کیا خوب صورت انداز میں کیا ہے تاہم علمی مباحث میں اپنے مطمحِ نظر کے اظہار کے لیے بالواسطہ اندازِ بیاں یا پیرایۂ اظہار میں بات کرنے کا محل نہیں ہوتا۔ یہاں واضح اور براہِ راست بیان کی ضرورت ہوتی ہے۔ بحث میں اپنے موقف پر اصرار کرتے ہوئے کبھی کبھی انسان حدِ اعتدال سے گزر سکتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات بدکلامی اور دشنام طرازی کی نوبت بھی آجاتی ہے۔ غالبؔ کا معاملہ یہ تھا کہ شاعری میں تو اُن کی انا خود بینی و خود آرائی میں اتنی محو رہتی ہے کہ اس کے حصار سے باہر انھیں کچھ نظر ہی نہیں آتا لیکن بحث و تکرار کے میدان میں اتنی سرکش دکھائی دیتی ہے کہ اُن کی یہی اَنا 'نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں' والا مضمون ہوجاتا ہے۔ اس باب میں غالب کی اسی کمزوری کا ذکر مقصود ہے۔

ہندستان کے فارسی شاعروں، ادیبوں اور فرہنگ نگاروں کی جانب غالبؔ کا رویّہ نہ صرف یہ کہ

غیر منصفانہ اور معروضی نہیں تھا بلکہ بڑی حد تک غیر ادبی اور غیر علمی بھی تھا۔ اس روّیے کے پسِ پشت وہ بُغض وعناد کارفرما تھا، جو غالب ہندوستان کے فارسی دانوں کی طرف سے اپنے دل میں رکھتے تھے۔ یہ بغض وعناد کلکتے کے ادبی معرکے کی دین تھا۔ اسی کے ساتھ اپنی فارسی شاعری اور فارسی دانی کے بارے میں انھیں یہ زُعم بھی ہوگیا تھا کہ ''ہمچو من دیگرے نیست۔'' یہ احساس برتری بھی بڑی حد تک کلکتے کے ادبی معرکے ہی سے پیدا ہوا تھا۔ یوں تو عام طور سے ہم عصر شاعروں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور حرف زنی کا سلسلہ رہتا ہی تھا لیکن تین واقعات ایسے ہیں جنھوں نے باقاعدہ ادبی معرکوں کی شکل اختیار کرلی تھی۔ ان میں پہلا معرکہ کلکتے کے ایک مشاعرے میں ہوا تھا، جس کے بارے میں ہمارے پاس کافی معلومات ہیں۔ دوسرا معرکہ ذوقؔ کے ساتھ ہوا اور تیسرا معرکہ 'قاطعِ برہان' کا تھا۔ ان معرکوں کا صحیح تجزیہ غالب کے ذہن کی نفسیاتی گرہ کشائی کے بغیر ممکن نہیں۔ شاید اسی کے ذریعے صحیح نتائج تک پہنچا جاسکتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ جو حضرات نفسیات کے ماہر ہیں وہ ماہرِ غالب نہیں اور جنھوں نے غالب کے دشتِ حیات کی خاک چھانی ہے، اُن میں شاید ہی کسی کو علمِ نفسیات سے علاقہ ہو۔

میں ماہر نفسیات نہیں ہوں اس لیے غالبؔ کے فکری رویّوں کا نفسیاتی تجزیہ نہیں کرسکتا لیکن نفسیاتی گتھیوں کی تھوڑی بہت تاریخ بیان کرسکتا ہوں۔

کلکتے میں غالبؔ کے ادبی معرکے کا پہلا مشاعرہ یکم جون ۱۸۲۸ء کو منعقد ہوا تھا۔ اس معرکے میں غالب کے دو اشعار پر مخالفوں نے بے بنیاد اعتراض کیے تھے۔ چوں کہ مخالفین کے اعتراضات کا مقصد ادبی نہیں بلکہ غالبؔ کو ذلیل ورسوا کرنا تھا۔ دوسرے ان مخالفوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جب کہ غالب تنہا تھے۔ سید علی اکبر خاں جیسے ایک دو حضرات غالب کے ساتھ تھے، اُن کا سماجی رتبہ ایسا تھا کہ وہ کھل کر اس معرکے میں شرکت نہیں کرسکتے تھے۔ اس معرکے سے غالبؔ کی نفسیات میں پیچیدگی پیدا ہونی شروع ہوئی۔ غالب نے مبالغہ آرائی اور دروغ گوئی سے ذہنی آسودگی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اُنھوں نے اپنے بزرگ دوست باندے کے مولوی محمد علی خاں کے نامِ خط میں معرکے کے بارے میں ایسی باتیں کہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ غالبؔ نے محمد علی خاں کے نام دو خطوں میں سفیرِ ہرات کی زبانی اپنی تعریف کرائی ہے۔

کلکتے میں غالبؔ نے جس تیسرے مشاعرے میں شرکت کی تھی، اس کی تفصیلات بیان کرتے

ہوئے لکھتے ہیں:

''اسی زمانے میں ایک گرانمایہ شخص اعیانِ عجم سے بطور سفیر آیا اور اسی مشاعرے میں منتظمین کی استدعا سے شریک ہوا۔ دوسروں کے اشعار سنے اور میری نوبت آئی تو باوجود ناآشنائی اپنے کو میرا مشتاق ظاہر کیا۔ ایرانی جو قبل سے کلکتے میں موجود تھے، میری تعریف اُس سے کر چکے تھے۔ اس نے کہا کہ اس شخص کی قدر کرو۔ شعروشاعری سے قطع نظر، زبانِ پارسی کا عالم ہے۔''[1]

محمد علی خاں کے نام ایک اور خط میں غالبؔ نے ان ہی سفیر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اچانک بادشاہِ ہرات کے بھیجے ہوئے سفیر اس شہر...... میں وارد ہوئے۔ اُس انجمن میں تشریف لائے اس شہر کے گرامی بقعہ کے فارسی گوشعرا کا کلام سنا۔ میرے کلام کی بلند آواز سے داد دی اور کہا کہ اس کلام کی قدر ہندوستان میں کون کرے گا۔ وہ (غالب) تو اس لائق ہے کہ ایران کے فصحا اس کا کلام سن کر لطف اندوز ہوں، پھر اہلِ محفل کی طرف رُخ کر کے فرمایا کہ تم لوگوں میں یہ شخص مغتنم ہے۔ شعروشاعری سے قطع نظر فارسی زبان کا عالم ہے۔'' (فارسی سے ترجمہ)[2]

میں نے اس کتاب میں 'غالبؔ اور سفیرِ ہرات' کے عنوان کے تحت ثابت کیا ہے کہ سفیرِ ہرات کفایت خاں اس زمانے میں کلکتے میں موجود ضرور تھے لیکن مشاعرے میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ غالب نے اُن سے جو بیاناتِ منسوب کیے ہیں، اُن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اوپر کے دونوں اقتباسات میں غالب نے سفیرِ ہرات کی زبانی خود کو 'فارسی زبان کا عالم' کہلوایا ہے۔ معرکے میں اپنے ذہن و دل میں ہونے والی جنگ میں غالبؔ نے یہ الفاظ پہلی بار سپر کے طور پر استعمال کیے تھے۔ اس سلسلے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ غزل سن کر بحیثیت شاعر تو غالبؔ کی تعریف ممکن ہے لیکن 'زبانِ پارسی کا عالم' کہنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

چوں کہ بحث زبان پر ہوئی تھی، اس لیے غالبؔ نے سفیرِ ہرات کی زبانی 'خود کو' زبان فارسی کا عالم' کہلوایا۔ پہلے تو یہ محض خود آسودگی کے لیے ایک ذہنی ہتھیار تھا لیکن آہستہ آہستہ یہ غالب کا

یقین بنتا گیا کہ وہ زبانِ فارسی کے عالم ہیں۔ 'قاطع برہان' کے قضیے تک پہنچتے پہنچتے غالبؔ ایمان داری سے سوچنے لگے کہ وہ ہندوستان میں فارسی کے سب سے بڑے عالم ہیں۔

مرزا رحیم بیگ کے نام ایک خط میں اہلِ زبان کی طرح خود کو فارسی داں ثابت کرتے ہوئے غالبؔ لکھتے ہیں:

> ''اگر مجھ سے کوئی کہے کہ غالبؔ تیرا بھی مولد ہندستان ہے، میری طرف سے جواب یہ ہے کہ بندہ ہندی مولد و پارسی زباں ہے۔
>
> ہرچہ از دستگہہ پارس بہ یغما بردند
>
> تا بنالم ہم ازان جملہ زبانم دادند
>
> زباں دانیِ فارسی میری ازلی دستگاہ اور یہ عطیۂ خاص من جانب اللہ ہے۔ فارسی زباں کا ملکہ مجھ کو خدا نے دیا ہے۔ مشق کا کمال میں نے استاد سے حاصل کیا ہے۔ ہند کے شاعروں میں اچھے اچھے خوش گو اور معنی یاب ہیں مگر یہ کون کہے گا کہ یہ لوگ دعویٔ زباں دانی کے باب ہیں۔''[۳]

اور بھی کئی موقعوں پر غالبؔ نے کہا ہے کہ ''بندہ ہندی مولد و فارسی زباں ہے۔ بقول قاضی عبدالودود:

> ''غالبؔ جب یہ کہتے ہیں کہ میں اپنا شمار اہلِ زبان میں نہیں کرتا تو اُن کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میری مادری زبان فارسی نہیں اور جب یہ فرماتے ہیں کہ میں ''پارسی زباں'' ہوں تو اُن کی مراد یہ ہوتی ہے کہ فارسی سے اپنی طبعی مناسبت اور تتبعِ کلامِ اساتذہ کی بدولت میں کسی ایرانی سے کم نہیں۔''[۴]

مرزا رحیم بیگ کے نام خط میں غالبؔ ہندوستان کے فارسی شاعروں اور فرہنگ نویسوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''رہے فرہنگ لکھنے والے، خدا ان کے پیچ سے نکالے۔ اشعارِ

قدما آگے دھر لیے اور اپنے قیاس کے مطابق چل دیے، وہ بھی
نہ کوئی ہم قدم، نہ کوئی ہمراہ بلکہ سُو بہ سُو پراگندہ و تباہ رہنما ہو تو
راہ بتائے، استاد ہو تو شعر کے معنی سمجھائے۔'' ۵

علمی مباحث میں اپنے مطمحِ نظر کے اظہار کے لیے بالواسطہ اندازِ بیان یا پیرایۂ اظہار میں بات کرنے کا محل نہیں ہوتا۔ یہاں واضح اور براہِ راست بیان کی ضرورت ہوتی ہے۔ بحث میں اپنے موقف پر اِصرار کرتے ہوئے کبھی کبھی انسان حدِّ اعتدال سے بھی گزر جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات بدکلامی اور دشنام طرازی اور کبھی کبھی فحش گوئی تک کی نوبت آجاتی ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں ہے کہ کلکتے کے ادبی معرکے میں بہت کم درجے کے شاعروں نے مرزا افضل بیگ کی شہ پر غالبؔ کے ساتھ سخت ناانصافی کی تھی، جس کی وجہ سے غالبؔ ہندوستان کے فارسی شاعروں، ادیبوں اور فرہنگ نگاروں کی جانب غالبؔ کا رویّہ نہ صرف یہ کہ منصفانہ اور معروضی نہیں رہا، بلکہ بڑی حد تک غیرادبی اور غیرعلمی بھی ہوگیا۔ سازش اور بدتمیزی مرزا افضل بیگ اور اُن کے حامیوں نے کی تھی لیکن غالبؔ اس کا بدلہ ہندوستان کے تمام فارسی شاعروں اور فرہنگ نویسوں سے چکاتے رہے۔ اس ادبی معرکے کی وجہ سے غالبؔ کو یہ زعم ہوگیا کہ فارسی زبان میں ''ہم چو من دیگرے نیست''۔ شاعری میں تو غالبؔ کا یہ زعم کافی حد تک درست تھا لیکن فارسی دانی میں خود کو اہلِ زبان کے برابر سمجھنا غالبؔ کی غلط فہمی تھی۔ یہ احساسِ برتری ہندستانی فارسی شاعروں اور فرہنگ نویسوں کے خلاف بغض و عناد کلکتے کے ادبی معرکے ہی سے پیدا ہوا تھا۔

فارسی اور اردو میں شاعرانہ تعلّی بہت عام ہے۔ اسے کبھی عیب نہیں سمجھا گیا۔ جب کوئی شاعر شاعرانہ تعلّی سے کام لیتا ہے تو سامعین یا اس شاعری کے پڑھنے والے تعلّی کی داد دیتے ہیں اور

جب یہ لَے زیادہ بڑھ جاتی ہے تو اس کا جواب محض زیرِ لب مسکراہٹ سے دے دیتے ہیں۔ غالبؔ کے ہاں شاعرانہ تعلّی کی مثالیں بہت مل جاتی ہیں اور ایسی مثالیں بھی مل جاتی ہیں جن میں تعلّی حد سے گزر گئی ہے۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ شاعر اپنی بے قدری کی شکایت کرتا۔ اگر شاعر چھوٹا یا معمولی درجے کا ہوتا ہے یہ شکایت ناگوار گزرتی ہے۔ اگر بڑا شاعر ہوتا ہے تو ہمیں اس سے ہمدردی ہو جاتی ہے۔ غالب کے اردو اور فارسی کلام میں اس طرح کے اشعار کافی تعداد میں ہیں اور بعض اشعار ایسے سلیقے اور ہنرمندی سے کہے گئے ہیں کہ اُن کی حیثیت تقریباً ضرب المثل کی ہوگئی ہے۔ غالب اپنی ناقدری کے اظہار کے لیے کیسے کیسے خوب صورت استعارے استعمال کیے ہیں۔

جو چاہیے ، نہیں وہ ، مری قدر و منزلت
میں یوسفِ بقیمتِ اوّل خریدہ ہوں

ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے، مری جگہ
ہوں میں کلامِ نغز، ولے ناشنیدہ ہوں

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

یہی مفہوم غالبؔ نے اس طرح ادا کیا ہے۔

کوکب را در عدم اوجِ قبولی بودہ است
شہرتِ شعرم بگیتی بعدِ من خواہد شدن

میں بے ہنر کہ جوہرِ آئینہ تھا، عبث
پائے نگاہِ خلق میں خارِ خلیدہ ہوں

ان اشعار میں غالبؔ نے ’یوسف بقیمتِ اوّل خریدہ‘، ’ناشنیدہ کلام نغز‘، ’عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ‘ اور ’پائے نگاہِ خلق میں خارِ خلیدہ‘ کے استعاروں سے اشعار میں کیسا غیر معمولی حسن پیدا کیا ہے اور کس طرح ہمارے ہمدردانہ جذبات کو جگایا ہے۔

دیکھیے کیسے خوب صورت انداز میں بالواسطہ طور پر اپنی ناقدری کی شکایت کی ہے:

ہم کہاں کے دانا تھے؟ کس ہنر میں یکتا تھے؟
بے سبب ہوا، غالبؔ، دشمن آسماں اپنا

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا
سمجھا ہوں دلپذیر متاعِ ہنر کو میں

غالبؔ کی ایک فارسی رباعی ہے:

گر ذوقِ سخن بدہر آئیں بودے
دیوانِ مرا شہرت پرویں بودے
غالب اگر ایں فنِ سخن دیں بودے
آن دیں را ایزدی کتاب ایں بودے

اس رباعی میں غالبؔ نے جو کچھ کہا ہے، اس کی حیثیت محض تعلّی کی ہے، اسی لیے غالبؔ کے کسی مخالف نے اس رباعی پر کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔

غالبؔ کے کچھ اور ایسے اشعار ملاحظہ ہوں، جن میں انھوں نے شاعرانہ تعلّی سے کام لیا ہے۔

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فنِ ما

....

فرجامِ سخن گوئی غالبؔ بہ تو گویم
خونِ جگر است از رگِ گفتار کشیدن

....

سخن ماز لطافت نہ پذیرد تحریر
نشود گرد نمایاں زرمِ توسنِ ما

....

غالبؔ، بشعر کم ز ظہوری نیم، ولے
عادل شہ سخن رس دریا نوال کو؟

....

در لعیمی شہرۂ دہراز تہدستی است چرخ
رفتہ مسکین را ز یاد و گنج پنہانش منم

تعلیٰ میں غالبؔ کے کچھ اور اشعار ملاحظہ ہوں:

ہم بعالم از ہمہ عالم بر کنار افتادہ ام
چون امام سبحہ بیروں از شمار افتادہ ام

....

ہمچومن شاعر و صوفی و نجوی و حکیم
نیست در دہر قلم مدعی و نکتہ گواہ ست

....

ریختہ کے تمہی استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

....

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

....

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا
سمجھا ہوں دل پذیر متاعِ ہنر کو میں

یا رب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرف مکرّر نہیں ہوں میں

پایۂ من، جز بچشم من نیاید در نظر
از بلندی ، اخترم روشن نیاید در نظر

....

اگر خواہی کہ بینی چشمۂ حیواں بتاریکی
سواد نظم و نثر غالبؔ شیریں بیاں بینی

غالبؔ کو یہ بھی یقین ہوگیا کہ وہ اقلیمِ سخن کے بادشاہ ہیں۔ انھیں یہ بھی یقین ہوگیا کہ بقول اُن کے ''پیشنیاں چراغاں بودہ اند و من آفتابم۔'

'مہر نیم روز' کے دیباچے کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے:

آنچہ در مبدءِ فیاض بود آنِ من است
گل جدا ناشدہ از شاخ بدامانِ من است

از سوادِ شبِ قدر است مدادم بدوات
آسماں صفحہ و انجم خطِ پاشانِ من است

مستیم سیل مداں دردشم عام گیر
ناقۂ شوقم و جبریل حُدی خوانِ من است

جادۂ عرفیؔ و رفتار شفائیؔ دارم
دہلی و آگرہ، شیراز و صفاہانِ من است

خامہ گرنیست سروشی زیروشانِ بہشت
از چہ درمرحلۂ خاک زباں دانِ من است

’مہرِ نیم روز‘ کے دیباچے سے غالبؔ کے یہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں:

بچشم کم منگر گرچہ خاکِ راہِ توام
کہ آبروی دیارم دریں خلافت گاہ

کمال بین کہ بدین غصہ ہای جاں فرسا
ہنرنگر کہ بدین فتنہ ہای طاقت گاہ

مربی سخنم من بمایہ داری فکر
ز نطق من بودش عیش ہای خاطر خواہ

باخذ فیض ز مبدا فزدنم از اسلاف
کہ بودہ ام قدری دیر تر دراں درگاہ

نزول من بجہاں بعد یکہزار و دویست
ظہورِ سعدی و خسرو بہ ششم صد و پنجاہ

سخن ز نکتہ سرایانِ اکبری چہ کنی
چومن بخوبی عہد توام ز خویش گواہ

کنوں نشاہی و من مدح گو تعال تعال
گذشت دورِ نظیری و عہدِ اکبرشاہ

بفنِ شعر چہ نسبت بمن نظیری را
نظیر خود بہ سخن ہم فہم سخن کوتاہ

تعلّی کی حد تک تو بات قابلِ اعتراض نہیں تھی لیکن غالبؔ اپنی شاعری کے بارے میں اس طرح کے دعوے کرنے لگے۔

مسیح شوکت عرفی کہ بود شیرازی

مشو اسیر ز لالی کہ بود خوانساری

بہ سومناتِ خیالم در آئی تابنی

رواں فروز برو دوش ہاے زناری

شاعری میں تو غالبؔ کے اس طرح کے دعوے قابلِ برداشت تھے۔ ستم یہ ہے کہ اُنھوں نے نثر میں بھی اپنی شاعری اور فارسی دانی کے ایسے دعوے کیے جو مناسب نہیں ہیں۔

غالبؔ کا دعویٰ ہے کہ وہ مستند فارسی میں اعلا شاعری کرتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے فارسی دیوان کی تقریظ میں لکھا ہے کہ اساتذہ ایران کی طرح مستند فارسی میں اعلیٰ شاعری کرنے کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ:

> ''اگر چہ طبیعت ابتدا سے نادر اور برگزیدہ خیالات کی جو یاتھی لیکن آزادروی کے سبب زیادہ تر ان لوگوں کی پیروی کرتا رہا جو راہ صواب سے نابلد تھے۔ ان لوگوں نے جو اس راہ میں پیشرو تھے دیکھا کہ باوجودیکہ ان کے ہمراہ چلنے کی قابلیت رکھتا ہوں اور پھر بھٹکتا پھرتا ہوں ان کو میرے حال پر رحم آیا اور اُنھوں نے مجھ پر مربیانہ نگاہ ڈالی۔ شیخ علی حزیںؔ نے مسکرا کر میری بے راہ روی مجھ کو بتائی، طالب آملیؔ اور عرفیؔ شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا مادّہ جو میرے اندر تھا اس کو فنا کردیا، ظہوریؔ نے اپنے کلام کی گیرائی سے میرے بازو پر تعویذ اور میری کمر پر زادِراہ باندھا اور نظیری نے اس خاص روِش پر مجھ کو چلنا سکھایا۔ اب اس گروہ والاشکوہ کے فیض تربیت سے میرا کلک چال میں کبک ہے تو راگ میں موسیکار، جو ے میں طاؤس تو پرواز میں عنقا۔ (تقریظ دیوان فارسی از قلم غالب)۔''[6] (فارسی سے ترجمہ قاضی عبدالودود کا کیا ہوا)

غالبؔ اپنی فارسی دانی کا دعویٰ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

'' فارسی کے ساتھ ایک مناسبت ازلی و سرمدی لایا ہوں، مطابق اہل فارسی کے منطق کا بھی مزہ ابدی لایا ہوں۔ مناسبت خداداد، تربیت استاد، حسن و قبح ترکیب پہچاننے، فارسی کے غوامض جاننے لگا (اردوے معلیٰ)'' تاکہ لوگ یہ نہ کہیں کہ خود ہندی نژاد ہونا اور دوسرے ہندی نژادوں کی زباندانی اور شاعری کو مسلم نہ سمجھنا اور اپنا زبان دانی کا علم بلند کرنا کیسی بات ہے۔ عرض ہے کہ میرا خاندان ماوراءالنہر کا تھا۔ میرے والد دہلی میں پیدا ہوئے اور میں آگرے، میں پیدا ہوا۔ میں اپنے کو اہلِ زبان ہرگز نہیں کہتا۔ میری زباندانی خدا کی تین عنایتوں کی وجہ سے ہے۔ اول سلامتِ طبع جو غلطی قبول نہیں کرتی اور سوائے سچائی کے کسی سے مطمئن نہیں ہوتی۔ دوم طبیعت کا سچائی کے ساتھ فارسی سے لگاؤ۔ سوم ہرمزد کی صحبت کہ جن سے دو سال تک کمال، و دانش اکتساب کیا۔ اس کے بعد قدیم کتابوں کا مطالعہ کیا۔ چودہ سال کی عمر میں ایک اُستاد ملا۔ باون سال شعرگوئی میں سر مارا۔ (قاطع برہان)''

انھیں اپنی زبان سے خود کو 'فارسی کا عالم' کہتے ہوئے کوئی عار نہیں تھا۔ مرزا تفتہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

'' کاتب اُن اجزا کا، جن کی رو سے کاپی لکھی جاتی ہے، فارسی کا عالم ہے۔ علم اُس کا غیاث الدین رام پوری اور حکیم محمد حسین دکنی سے زیادہ ہے۔ تصحیح سے غرض یہ ہے کہ کاپی سراسر موافق اُن اوراق کے ہو نہ یہ کہ فرہنگوں میں دیکھا جائے۔''[۷]

'دستنبو' لکھنے کے وقت غالبؔ نے بعض فرہنگوں کا مطالعہ کیا تھا اور اُسی وقت انھیں ہندستانی فرہنگ نویسوں سے اختلاف ہوا تھا۔

غالبؔ نے ہندوستان کے فارسی گو شاعروں، ادیبوں اور فرہنگ نگاروں کے بارے میں اپنی جس رائے کا اظہار کیا ہے، اس کی مثال ملاحظہ ہو:

'' رہے فرہنگ لکھنے والے، خدا ان کے پیچ سے نکالے۔ اشعار

قُدما آگے دھر لیے اور اپنے قیاس کے مطابق چل دیے، وہ بھی نہ کوئی ہم قدم، نہ کوئی ہمراہ، بلکہ سُو بسُو پراگندہ و تباہ، رہنما ہوتو راہ بتائے استاد ہوتو شعر کے معنی سمجھائے۔ نہ آپ شیرازی، نہ استاد اصفہانی، زہے رگِ گردن و خبطِ دعوی زبان دانی! میرا یہ قولِ خاص ہے نہ عام ہے۔ مجموع۔ فرہنگ نگاروں کے محقق ہونے میں کلام ہے۔ یہ کیا بات ہے کہ جامع برہان کا ماخذ فرہنگِ رشیدی و جہانگیری ہے۔ عبدالرشید کی کیا شیخی اور میاں انجو میں کیا پیری ہے؟ قطب شاہ و جہانگیر کے عہد میں ہونا اگر منشاءِ برتری ہے تو بے چارہ جعفر زٹلی بھی فرخ سیری ہے۔'' [۸]

غالب موقع بے موقع اپنی فارسی دانی کی تعریف میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتے۔ نواب علی بہادر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اگر پنج آہنگ میری تصنیف نہ ہوتی تو کہتا کہ فارسی زبان کے لیے یہ کتاب خود پسند قانون کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں فکر انگیز نکتے بیان کیے گئے ہیں۔ نادر ترکیبوں اور لغت ہائے نغز استعمال کیے گئے ہیں۔'' [۹] (فارسی سے ترجمہ)

اپنے ایک شاگرد قدر بلگرامی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''غلام نے بہت خونِ جگر کھا کر فارسی کی تحقیق کو اس پائے پر پہنچایا ہے کہ اس سے بڑھ کر متصور نہیں۔'' [۱۰]

مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط میں غالب نے اپنی فارسی دانی کا دعویٰ ان الفاظ میں کیا ہے۔

''فارسی میں مبداِ فیاض سے مجھے وہ دستگاہ ملی ہے کہ اس زبان کے قواعد و ضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاں گزیں ہیں، جیسے فولاد میں جوہر۔ اہلِ پارس اور مجھ میں دو طرح کے تفاوت ہیں۔ ایک تو یہ کہ اُن کا مولد ایران اور میرا ہندوستان ۔دوسرے یہ کہ وہ لوگ آگے پیچھے سو، دو سو، چار سو، آٹھ سو برس

پیدا ہوئے ہیں۔"[۱۱]

غالبؔ نے 'قاطع برہانِ' کی ایک جلد مفتی محمد عباس کو بھیجی۔ مفتی صاحب نے خط کی وصول یابی کی اطلاع دی تو غالب نے انھیں جواب لکھا، جس میں 'قاطع برہان' کے حوالے سے اپنی فارسی دانی کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "مبداء فیاض کا مجھ پر احسانِ عظیم ہے۔ ماخذ میرا صحیح اور طبع میری سلیم ہے۔ فارسی کے ساتھ ایک مناسبتِ ازلی و سرمدی لایا ہوں۔ مطابق اہلِ پارس کے منطق کا بھی مزہ ابدی لایا ہوں۔ مناسبتِ خدا دادا تربیتِ استاد سے حسن و قبح ترکیب پہچاننے لگا۔ فارسی کے غوامض جاننے لگا۔"[۱۲]

مولوی نعمان احمد کے نام ایک خط میں غالبؔ خود کو محقق اور صاحبِ طرزِ جدید کہتے ہیں:

> "غایت مافی الباب یہ ہے کہ سخنوران گزشتہ کا طرز شناس اور اُن نازک خیالوں کا پیرو ہوں اور مبدأ فیاض سے مجھ کو اُن کی تقلید میں پایۂ تحقیق ملا اور میں صاحب طرزِ جدید ہوں۔"[۱۳]

'قاطع برہان' کا قضیہ

محمد حسین تبریزی نے (جنھیں غالبؔ حقارت سے دکنی کہتے ہیں) ۱۶۵۲ء میں 'برہان قاطع' نام سے ایک فارسی لغت مرتب کی تھی۔ کلکتے کے معرکے کے تیس سال بعد غالب نے 'قاطع برہان' لکھی۔ غالبؔ کے خیال سے محمد حسین تبریزی سے اپنی لغت 'برہانِ قاطع' میں جو غلطیاں سرزد ہوئی تھیں اُن کی نشان دہی کی گئی تھی۔ ۱۸۶۲ء میں جب یہ کتاب شائع ہوئی تو ہر طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہوگئی۔ بقول غالبؔ 'معتقدانِ و برہانِ قاطع' برچھیاں اور تلواریں پکڑ پکڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔

غالبؔ کی قاطعِ برہان' کے جواب میں سب سے پہلے 'محرقِ قاطعِ برہانِ' شائع ہوئی، جس کے مولف سید سعادت علی تھے۔ اس کتاب کے جواب میں حامیانِ غالب کی طرف سے تین کتابیں شائع ہوئیں۔ فارسی میں مولوی نجف علی خاں کے 'دافعِ ہذیان' اردو میں میاں داد خاں سیاحؔ کی 'لطائفِ غیبی' اور عبدالکریم'۔ غالبؔ کے تمام محققین کو یقین ہے کہ 'لطائفِ غیبی' اور

'سوالاتِ عبدالکریم'۔ خود غالبؔ کی تصنیفات تھیں جنھیں اُنھوں نے دوسروں کے نام سے شائع کیا تھا۔

'قاطعِ برہان' کے جواب میں دوسری کتاب مرزا رحیم بیگ رحیؔم میرٹھی نے 'ساطع برہان' نام سے ایک کتاب شائع کی۔ غالبؔ نے اس کا جواب 'نامۂ غالب' کے نام سے شائع کیا۔ اس کے بعد 'قاطع برہان' کے جواب میں پٹیالہ کے ایک مدرس امین الدین امین دہلوی کی وہ کتاب 'قاطع القاطع' شائع ہوئی جو 'قاطع برہان' کے جواب میں سب سے پہلے لکھی گئی تھی لیکن چھپی بعد میں۔ دوسری کتاب تھی آغا احمد علی احمد کی 'موید برہان'۔ 'موید برہان' کے جواب میں غالبؔ نے اردو میں 'تیغِ تیز' نام سے ایک کتاب شائع کی۔ اس کے بعد غالب کی حمایت میں 'ہنگامہ دل آشوب' (حصہ اوّل) اور 'ہنگامہ دل آشوب' حصہ دوم شائع ہوئیں۔ حصہ اوّل کے جواب میں عبدالصمد فدا نے 'تیغ تیز تر' کے جواب میں ایک کتاب شائع کی۔

اس سلسلے کی آخری کتاب مولوی احمد علی کی 'شمشیر تیز تر' ہے جو فارسی میں لکھی گئی۔

'قاطع برہان' اور اس سلسلے کی غالبؔ کی دیگر کتابیں اس حقیقت کا اظہار ہیں کہ غالبؔ ہندوستانی فرہنگ نویسوں کو غیر مستند سمجھتے تھے۔ 'قاطع برہان' میں بقول قاضی عبدالودود غالب نے 'بہ بانگِ دہل اعلان کیا ہے کہ ہندوستان کی فارسی میں میرے سوا کوئی مستند نہیں'۔ اپنے دل کی بات کہنے اور اپنی حمایت کے لیے غالب نے دو اہلِ زبان ایرانی شخصیتوں کا سہارا لیا۔ ایک تو سید حسین علی خاں معروف بہ کفایت خاں اور دوسرے سفیرِ ہرات کفایت خاں کا ذکر اسی باب میں پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔

کفایت خاں کلکتے میں والی ہرات کے وکیل تھے اور دوسرے عبدالصمد۔ غالبؔ نے کلکتے سے باندے کے محمد علی خاں کے نام دو خطوں میں کفایت سے قول منسوب کیا، اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ غالب تو اس قابل ہیں کہ ایران کے فصحا ان کا کلام سنیں اور لطف اُٹھائیں۔ غالب کی شخصیت مغتنم ہے۔ شعر و شاعری سے قطع نظر وہ فارسی زبان کے عالم ہیں'۔

اس کتاب میں 'غالب اور سفیرِ ہرات' کے عنوان کے تحت میں نے ایک باب میں یہ ثابت کیا ہے کہ کفایت خاں نام کا وکیلِ رئیسِ ہرات کلکتے میں موجود ضرور تھے لیکن وہ ادبی معرکوں کے تین مشاعروں میں سے ایک میں بھی شریک نہیں تھے۔ غالبؔ نے اپنی شکست خوردہ شخصیت کی آسودگی کے لیے کفایت خاں سے وہ بات منسوب کی تھی جو اُنھوں نے کہی ہی نہیں تھی لیکن آہستہ آہستہ یہ منسوب شدہ قول غالب کے ذہن و قلب پر اس طرح چھا گیا کہ غالبؔ کو واقعی

یقین ہوگیا ہے کہ وہ فارسی پر اہلِ زباں جیسی قدرت رکھتے ہیں۔ 'قاطع برہان' کی تالیف اسی جذبے کا اظہار تھا۔ دوسری ایرانی الاصل شخصیت عبدالصمد کی تھی۔ صمد کا خارجی وجود نہیں تھا۔ یہ 'قاطع برہان' کے ادبی معرکے میں غالبؔ کی ذہنی تخلیق تھی۔

غالبؔ زندگی بھر نظم اور نثر دونوں میں اہلِ زباں جیسی فارسی دانی کا دعویٰ کرتے رہے۔ اس کتاب میں 'درمدحِ خود' کے باب میں اس طرح کی کافی مثالیں پیش کی جا چکی ہیں۔

عبدالصمد

عبدالصمد کا ذکر غالباً سب سے پہلے مولوی ضیاء الدین خاں ضیاؔ کے نام غالبؔ کے اس خط میں آیا ہے، جس پر تاریخ تحریر تو درج نہیں ہے، البتہ غالبؔ کی ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) کی مہر ثبت ہے۔ اس کے بعد 'قاطع برہان' (۱۸۶۲ء)۔ درفش کاویانی (۱۸۶۵ء)، لطائفِ غیبی ۱۸۶۵ء، نواب کلب علی خاں کے نام خط ۷/اکتوبر ۱۸۶۶ء، تیغِ تیز (۱۸۶۷ء) وغیرہ میں عبدالصمد کا ذکر ہے۔ اگر عبدالصمد کا خارجی وجود ہوتا تو ممکن نہیں تھا کہ غالبؔ اُن کا ذکر کلکتے کے معرکے کے دوران نہ کرتے۔ ادبی معرکہ ۱۸۲۸ء میں ہوا تھا اور 'قاطعِ برہان' ۱۸۶۲ء میں لکھی گئی۔ اس چونتیس سال کے عرصے میں کسی بھی تحریر میں غالبؔ کے قلم سے عبدالصمد کا نام نہیں نکلا۔ دراصل 'قاطعِ برہان' میں جب غالبؔ نے 'برہانِ قاطع' پر اعتراضات کی بوچھاڑ کی اور ہندوستان کے تمام فرہنگ نویسوں کو غیر مستند قرار دیا تو انھیں یہ ثابت کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اگرچہ وہ اہلِ زبان نہیں ہیں لیکن اُنھوں نے ایران نژاد عالم سے فارسی سیکھی ہے۔ اس مقصد کے لیے غالبؔ نے عبدالصمد نامی ایک ایران نژاد عالم کی تخلیق کی تاکہ جس طرح اُنھوں نے کلکتے کے ادبی معرکے میں کفایت خاں سفیرِ ہرات کا استعمال کیا ہے۔ اس طرح وہ عبدالصمد کو سپر کے طور پر استعمال کر سکیں۔

ہمارے زمانے میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں کہ لوگ اپنی تعریف میں خود مضامین لکھ کر دوسروں کے نام سے چھپواتے ہیں۔ فراقؔ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُنھوں نے اپنے بارے میں کچھ مضامین لکھ کر دوسروں کے نام سے چھاپے تھے۔ ہمارے ہی زمانے میں بعض حضرات نے اپنی مدح میں خود ضخیم کتابیں لکھ کر اپنے دوستوں اور شاگردوں کے نام سے شائع کرائی ہیں۔ غالبؔ نے بھی 'قاطع برہان' کے معرکے میں 'لطائفِ غیبی' اور 'سوالاتِ عبدالکریم' نام سے دو کتابیں لکھیں۔ پہلی کتاب میاں داد خاں سیاح اور دوسری عبدالکریم کے نام سے

شائع کرائی۔ ان میں سے ایک کتاب اُن کے شاگرد اور دوسری ایک گمنام شخص کے نام سے شائع کرائی تھی۔ 'لطائفِ غیبی' میں غالب کو مبالغے کے ساتھ اپنی تعریف کرنے کا پورا موقع ہاتھ آ گیا۔

'لطائفِ غیبی' میں غالبؔ سیاح کی طرف سے اپنے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اللہ اللہ! غالبِ نام آورِ نامدار کوئی شہر ایسا نہیں دیکھا، جس میں اُن کے دو چار شاگرد، اور دس بیس معتقد نہ دیکھے ہوں۔ ایک عالم اُن کی فارسی دانی اور شیوہ بیانی کا معترف۔ نظم میں ظہوری، نظیری و عرفیؔ کے برابر، نثر میں نثّارانِ سابق و حال سے بہتر کلیاتِ نظم نسخۂ سحرِ سامری، نثر میں پنج آہنگ یا سِلکِ دُرِ خویش آب، دستنبو گوہرِ نایاب، مہرِ نیم روز غیرتِ آفتاب، ہر نکتہ ایک کتاب۔''[۱۴]

اس کتاب میں غالبؔ نے میاں داد خاں کی زبانی خود کو محققِ اکمل، محققِ مدقق اور ہمہ دانِ عدیم النظیر لکھا ہے۔

پنج آہنگ کا جب دوسرا اڈیشن شائع ہوا تو اس کی سرورق کی عبارتؔ میں ان کے نام کے ساتھ شہنشاہِ ممالکِ علوم فارسی و عربی'' لکھا گیا۔ یہ عبارت یا تو خود غالبؔ نے لکھ کر دی ہوگی اور اگر کسی اور نے لکھی ہوگی تو اس نے غالب سے یقیناً اجازت لی ہوگی۔

غالبؔ کے بعض محققوں اور نقادوں نے بارہا یہ بات دہرائی ہے کہ غالبؔ اپنی اردو شاعری کو فارسی شاعری کے مقابلے میں کم تر درجے کا سمجھتے تھے۔ حالاں کہ یہ حقیقت نہیں ہے۔ ذوق کے ساتھ معرکے میں غالب نے اپنی اردو شاعری کے بارے میں جو کچھ کہا اس پر ہمیں یقین نہیں کرنا چاہیے۔ اپنی اردو شاعری کے بارے میں غالب کا یہ بیان محض ادبی معرکے میں ذوق پر ایک حملہ ہے اور بس۔

غالبؔ کی فارسی دانی کے دعوے پر تبصرہ کرتے ہوئے قاضی عبدالودود لکھتے ہیں۔ اگرچہ یہ اقتباس طویل ہے لیکن غالبؔ کی فارسی دانی پر بہت اچھا تبصرہ ہے اس لیے پورا اقتباس نقل کیا جاتا ہے:

> ''پہلی بات تو یہ ہے کہ غالبؔ شاعر تھے اور بہت شاذ و نادر ایسا

ہوتا ہے کہ ایک ہی شخص شاعر اور محقق بھی ہو۔ یہاں ان لوگوں سے بحث نہیں، جو پیشِ ملا طبیب و پیشِ طبیب، ملا و پیش ہیچ ہر دو و پیشِ ہر دو، ہیچ، کے مصداق ہیں۔ یہ حضرات بہ یک وقت سب کچھ ہو سکتے ہیں۔ دوسری یہ کہ غالب کی باقاعدہ تعلیم زیادہ نہیں ہوئی (خطِ غالب بنام ضیاء الدین شائع کردہ جناب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ہندستانی الہ آباد (جنوری ۱۹۳۴ء) اور بعد کے ذاتی مطالعے سے جو استاد کی رہنمائی کے بغیر ہوا، ان کی بنیادی کمزوریاں دور نہ ہو سکیں۔ تیسری یہ کہ ان میں اعوجاجِ ذہن، ضعفِ حافظہ، خود پرستی، ناتوان بینی، بے پروائی، سہل نگاری اور ضد انتہائی درجے کی ہے اور جن طبائع میں یہ خصوصیات پائی جائیں، اُنھیں تحقیق سے کچھ سروکار نہیں ہو سکتا۔ چوتھی یہ کہ غالب ان اخلاقی قیود سے بھی آزاد ہیں جن کی پابندی دبستانِ تحقیق کا ابجد خواں بھی اپنے لیے لازمی سمجھتا ہے۔ ہندوستان کے مشہور فارسی داں عبدالرشید، آرزو، وارستہ، بہار، قتیل اور صہبائی جو اُن کے طعن وطنز کے زہر آلود تیروں کی آماج گاہ رہے ہیں، فارسی دانی میں ان سے بہ مراتب بہتر تھے، یہ دوسری بات ہے کہ ادبی حیثیت سے وہ غالب کے مقابل نہیں۔ افسوس کی جگہ ہے غالب نے یہ محسوس نہیں کیا کہ ان کی شاعری، ان کی انشاپردازی اور ان کی ظرافت انھیں زندگیِ جاوید بخشنے کے لیے کافی تھے اور ایسے کام میں ہاتھ ڈالا جس کے لیے نہ وہ طبعاً موزوں تھے اور نہ جس کے لیے اُنھوں نے کچھ زیادہ تیاری کی تھی۔ غالب اپنی زبان سے اپنے کو محققِ اکمل، اور ہمہ دانِ عدیم النظیر کہیں اور اپنے منزہ عن الخطا ہونے کا اعلان کریں، ان کے مدّاح انھیں شہنشاہِ ممالکِ علوم عربی و فارسی'' کا لقب دیں، لیکن ان کے معلومات اتنے قلیل ان کے اغلاط اتنے مختلف الانواع اور کثیر التعداد ہیں کہ بزمِ محققین کی صفِ نعال میں بھی ان کے لیے جگہ نکالنی مشکل ہے۔''[۱۵]

میں نے اپنی کتاب 'غالبؔ اور شاہانِ تیموریہ' میں ذوقؔ اور غالبؔ کے ادبی معرکے کے بارے میں جو لکھا تھا، اُسے یہاں نقل کر رہا ہوں:

''ذوقؔ عمر میں غالبؔ سے تقریباً آٹھ سال بڑے تھے۔ جب غالبؔ نے ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۲۔۱۸۱۳ء) میں دلّی میں مستقل سکونت اختیار کی تو ان کی عمر لگ بھگ پندرہ سال تھی۔ دلّی آنے سے چار پانچ سال پہلے سے وہ شعر کہہ رہے تھے۔ گویا جب وہ دلّی پہنچے ہیں تو ان کا ادبی شعور خاصا پختہ تھا۔ حکیم ثناء اللہ خاں فراقؔ، حافظ عبدالرحمٰن خاں (احسانؔ، میر قمرالدین منّتؔ، مرزا عظیم بیگ عظیمؔ، میر نظام الدین ممنونؔ، حکیم قدرت اللہ قاسمؔ وغیرہ اکبر شاہ ثانی کی بزم ان کی رونق تھے۔ بہادر شاہ ظفرؔ کو شعر و سخن سے اپنے والد سے کہیں زیادہ دل چسپی تھی۔ وہ نہ صرف شاعروں کی سرپرستی کرتے تھے بلکہ خود بھی شاعر تھے۔ ۱۲۲۴ھ میں اُن کا دیوان شائع ہو چکا تھا۔ انھیں شاہ نصیرؔ، عزت اللہ عشقؔ اور میر کاظم حسین بیقرارؔ سے تلمذ رہ چکا تھا۔ غالباً ۱۲۲۳ھ کے لگ بھگ ذوقؔ کی رسائی بہادر شاہ ظفرؔ تک ہوئی۔

بہر حال یہ یقینی ہے کہ ذوقؔ ۱۲۲۵ھ سے قبل قلعۂ معلّٰی کے متوسل ہو چکے تھے۔ کیوں کہ شہزادہ جہانگیر کی شادی پر اُنھوں نے قصیدۂ تہنیت پیش کیا تھا، جس میں یہ شعر بھی شامل تھا:

کہو سرِ لب بستہ سے شادیِ فرزند

مبارک آپ کو ہو، اے شہِ سپہر وقار!

گویا غالبؔ کے دلّی آنے سے قبل ہی ذوقؔ کو بہادر شاہ ظفرؔ کے استاد ہونے کا شرف حاصل ہو چکا تھا یا کم از کم وہ ظفرؔ کے مقربوں میں شمار ہونے لگے تھے۔ غالبؔ جیسے کم عمر لڑکے کی اکبر شاہ ثانی کے دربار میں رسائی آسان نہیں تھی۔ وہاں بڑے بڑے اساتذۂ فن موجود تھے۔ اس لیے غالبؔ نے بہادر شاہ ظفرؔ کے ہاں باریاب ہونے کی جدوجہد کی ہوگی۔ ظفرؔ پر ذوقؔ کا اثر تھا ہی، غالبؔ کی مخصوص افتادِ طبع اور مزاجِ شعری دونوں ان کے راستے میں رکاوٹ بنے ہوں گے۔ ابتدا میں کلامِ غالبؔ شہر اور قلعہ دونوں جگہ بہت زیادہ مقبول نہیں تھا۔ اس کے علاوہ

ایک سیاسی وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ غالبؔ کے چچا نصراللہ بیگ خاں نے ۱۸۰۳ء میں آگرے کا قلعہ لارڈ لیک کے حوالے کر دیا تھا۔ انگریزوں کی طرف سے نصراللہ بیگ کی وفات کے بعد ان کے وارثوں میں جن لوگوں کو پنشن ملتی تھی، اُن میں غالبؔ بھی تھے۔ انھیں مغل حکومت نے نہیں، مرہٹوں نے صوبہ دار مقرر کیا تھا لیکن ایک ضعیف سا امکان اس کا بھی ہے کہ قلعے میں اس بنیاد پر بھی غالبؔ کی مخالفت ہوئی ہو۔ بہرحال غالب اپنے آپ کو ذوقؔ کے مقابلے میں بڑا شاعر سمجھتے تھے اور یہ حقیقت بھی ہے مگر غالب کی شاعری اپنے عہد سے زیادہ آنے والے عہد کی شاعری تھی۔ غالب کا خیال بالکل درست تھا:

میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

اردو میں یہ روایت تو رہی ہے کہ کسی شاعر نے ابتدا فارسی سے کی لیکن بعد کو اردو میں شعر کہنے لگا لیکن غالب اور اقبالؔ کے علاوہ شاید ہی کوئی مثال ملے کہ اردو میں شعر کہنے والا بعد میں فارسی میں شعر کہنے لگا ہو۔ (اگر چہ غالبؔ کے ابتدائی عہد کی ایک فارسی غزل کا سراغ بھی ملتا ہے لیکن آغاز میں ان کی بیشتر توجہ اردو ہی کی طرف تھی) اقبالؔ نے فارسی گوئی اس لیے اختیار کی تھی کہ وہ سیاسی افکار کے لیے مسلمانوں کے ایک بڑے حلقے کو مخاطب بنانا چاہتے تھے۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ غالب فارسی زبان کے اچھے مزاج شناس تھے۔ انھیں فارسی پر بہت قدرت حاصل تھی۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اس تبدیلی کی وجہ اس عہد میں غالبؔ کی نامقبولیت اور خاص طور سے قلعۂ معلیٰ میں ذوقؔ کی عزت افزائی تھی۔

قصائدِ ذوق مرتبہ سر شاہ سلیمان میں دس ایسے قصیدے شامل ہیں جو ذوقؔ نے اکبر شاہ ثانی کی مدح میں کہے تھے، یہ سب قصیدے اردو میں ہیں۔ اس کے برعکس غالبؔ کی نامقبولیت اور خاص طور سے قلعۂ معلیٰ میں ذوق کی عزت افزائی تھی۔

غالبؔ نے اکبر شاہ ثانی کی مدح میں جو قصیدہ کہا تھا، وہ فارسی میں ہے۔ عین ممکن ہے کہ غالبؔ بتانا چاہتے ہوں کہ ان کا اصلی میدان فارسی میں ہے نہ کہ اردو میں۔ اس لیے انھیں اپنے معاصرین پر فوقیت حاصل ہے۔

ذوقؔ کو خاقانیِ ہند کا خطاب اکبر شاہ ثانی نے دیا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ذوقؔ نے جو قصیدہ شاہزادہ سلیم کی شادی کے موقع پر لکھ کر اکبر شاہ ثانی کے سامنے پیش کیا تھا۔ اس میں یہ شعر بھی تھا:

مدحِ حاضر کے لیے حاضرِ دربار ہو ذوق

تو ہے خاقانیِ ہند، اور وہ ہے خاقانِ زماں

یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہنا تو بہت مشکل ہے لیکن اگر ذوقؔ کو واقعی خاقانی ہند کا خطاب ملا تھا یا اُن کے مداحوں اور شاگردوں نے انھیں خاقانی ہند کہنا شروع کر دیا تھا۔ امکانِ قوی یہ ہے کہ غالبؔ کو اردو سے برگشتہ کرنے میں اس خطاب کو بھی اچھا خاصا دخل تھا۔ کچھ عرصے بعد غالب اس پر فخر کرنے لگے کہ ان کا اصل میدان فارسی ہے۔ اُنھوں نے ایک فارسی قطعے میں اپنی فارسی گوئی پر فخر کرتے ہوئے غالباً ذوق پر چوٹ کی ہے۔ اُنیس اشعار کے اس قطعے میں ذوقؔ کو جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں:

اے کہ در بزمِ شہنشاہِ سخن رس گفتۂ

کے بہ پُرگوئی فلاں در شعر ہمسنگِ منست

راست گفتی، لیکن میدانی کہ نبود جاے طعن

کمتراز بانگِ دہل گر نغمۂ چنگِ منست

نیست نقصاں، یکدجزوست ارسوادِ ریختہ

کان وژم برگے زنخلستانِ فرہنگِ منست

فارسی بیں، تابہ بینی نقشہای رنگ رنگ

بگزر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگِ منست

فارسی بیں تابدانی کاندر اقلیم خیال

مانی وارژنگم دآں نسخہ ارتنگِ منست

کے درخشد جوہرِ آئینہ تا باقیست زنگ

صیقلی آئینہ ام ایں، جوہر، آں زنگِ منست

ہاں، من ویزداں بنائے شکوہ برمہرو وفاست

تا نہ پنداری پرخاشِ تو آہنگ منست
دوست بودی ، شکوہ سرکردم، ولے جرمِ تونیست
کانہمہ بیداد برمن از دلِ رنگِ منست
بخت من ناساز و خوے دوست زاں ناسازتر
تاچہ پیش آید کنوں بابختِ خود جنگِ منست
دشمنی را ہمفنی شرط است و آں دانی کہ نیست
از تو نبود نغمہ در سازی کہ در چنگِ منست
در سخن چوں ہمزباں و ہمنواے من نۂ
چوں دلت را پیچ و تاب از رشکِ آہنگِ منست؟
راست میگویم من و از راست سر نتواں کشید
ہرچہ در گفتار فخرِ تُست، آں ننگِ منست
میفرستم، تانظرگاہِ جہاندار ، ایں ورق
نامہ برباد اگر خود سائرِ رنگِ منست
دیدہ درسلطاں سراج الدین بہادر شہ کہ اُو
آں شرر بیند کہ پنہاں در رگِ سنگِ منست
جم حشم شاہی کہ در ہنگامۂ عرض سپاہ
میتواند گفت دارا را کہ سرہنگِ منست
انوری و عرفی وخاقانی سلطاں منم
بادشہ، طہمورث و جمشید و ہوشنگِ منست
شاہ میداند کہ من مدّاحِ شاہم، باک نیست

گر تو اندیشی کہ این دستان و نیرنگِ منست

از ادب دورم ز خاقان، ورنہ در اظہارِ قرب

خطوہ دگامِ تو، گویی، میل و فرسنگِ منست

مقطعِ این قطعہ زیں مصرع مصرّع بادو بس

''ہرچہ درگفتارِ فخرِ تُست، آں ننگِ منست'' [١٦]

غالبؔ کی مشکل یہ ہے کہ وہ ایک عظیم فن کار ہیں لیکن اس پایے کے فن کار کا جو رویّہ زندگی کی طرف ہونا چاہیے، وہ اس سے محروم ہیں۔ عام طور پر عظیم فن کار ''شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا'' کی مجسّم تفسیر ہوتا ہے۔ وہ فن کو خونِ جگر سے سینچتا ہے اور ایسا کرنے کے لیے اسے تمام مادّی ضرورتوں اور آسائشوں سے بے نیاز ہونا پڑتا ہے۔ غالب کا المیہ یہ ہے کہ ایک طرف ان کا آدرش عظیم فن کی تخلیق ہے لیکن دوسری طرف ذوقؔ کا سماجی وقار بھی اُن کے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ غالب بخوبی واقف تھے کہ ان کا فن ذوقؔ اور ظفرؔ دونوں کے فہم و ادراک سے بلندتر ہے لیکن بادشاہ سے قربت حاصل کرنے کی تمنّا نے انھیں زندگی بھر انگاروں پر لوٹایا۔ اس قطعے میں غالب اپنی شاعری کو نغمۂ چنگ اور ذوقؔ کے فن کو بانگِ دہل کے مماثل کہتے ہیں۔ وہ اس پر ناز کرتے ہیں کہ اُن کا اصلی میدان اردو نہیں، فارسی ہے بلکہ وہ اپنی اردو شاعری کو آئینے پر لگے ہوئے زنگ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ غالب کہتے ہیں، جس اردو شاعری پر تم کو ناز ہے، وہ میرے لیے تو باعثِ شرم ہے۔ اسی ضمن میں وہ بہادر شاہ کی مدّح کرتے ہوئے یہ بھی کہتے ہیں کہ میں انوری، عرفیؔ اور خاقانیؔ ہوں۔ گویا اکبر شاہ ثانی کے دربار سے ذوقؔ نہیں، غالب تھے۔ اس قطعے سے ایک اور اہم بات کا پتہ چلتا ہے کہ ذوقؔ نے غالب کے خلاف بادشاہ کے کان بھرے تھے۔ ممکن ہے اُنھوں نے دوسرے موقعوں پر بھی یہ کیا ہو۔ اسی لیے غالب کو کہنا پڑا کہ بادشاہ جانتے ہیں کہ میں اُن کا مدّاح ہوں، اگر تم اسے میرے فریب پر محمول کرو تو کیا ہے۔ اسی قطعے میں غالب نے وہ بات بھی کہہ دی، جس نے زندگی بھر انھیں چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ وہ ذوقؔ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تمھارا کوئی قصور نہیں، قصور تو میرے دلِ تنگ کا ہے جو مجھ پر ظلم ڈھاتا ہے۔ کیا کروں میری قسمت ناساز گار ہے اور خوے دوست (یعنی بہادر شاہ ظفرؔ) اور بھی زیادہ ناساز گار...... اس قطعے میں غالب کی شخصیت کا پورا تضاد اُبھر کر سامنے آگیا ہے۔ تماشے اہلِ کرم دیکھنے کے لیے انھیں طرح طرح کے بھیس بدلنے پڑے۔ ان کے بہت سے ارمان پورے ہوئے لیکن سیری نہ ہو سکی۔ غالب اکثر دشمنی

میں یہ بھول جاتے تھے کہ ذوقؔ کو استادِ شہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اُن کی اردو شاعری کا مذاق اُڑانے کا مطلب ظفرؔ کی شاعری کا مذاق اُڑانا ہے۔ انھیں جاہل بتانا خود بادشاہ کو جاہل ثابت کرنے کے مترادف ہے۔ ظاہر ہے کہ غالبؔ کے اس قسم کے اشعار سے ظفرؔ اور بھی کبیدہ خاطر ہوتے ہوں گے۔

غالبؔ کو جب بھی کوئی موقع ہاتھ آیا، اُنھوں نے ذوقؔ کو کمتر ثابت کرنے میں کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ ایک طویل قصیدے کے چند اشعار میں کسی شاعر سے اپنا مقابلہ ان الفاظ میں کیا ہے:

بالد بخویش خواجہ، چو گویی سخنورش
غافل کہ این ترانہ بہ بہتاں برابر است
نے ہر ترانہ سنج، نکتیا نوا بود
نے ہر سخن سرای، بہ سحباں برابر است
نے ہر شتر سوار، بہ صالح بود ہمال
نے ہر شبان، بموسیٔ عمراں برابر است
نے ہر کہ گنج یافت، ز پرویز گوی بُرد
نے ہر کہ باغ ساخت، برضواں برابر است
گفتی کہ این و آن بود از نطق مایہ ور
این در شمارِ شیوہ نہ با آں برابر است
گیرم کہ ہر گیا برداز ابر و باد فیض
خر زہرہ کے بسنبل و ریحاں برابر است
امروز من نظامی و خاقانیم بدہر
دہلی زمن بہ گنجہ و شرواں برابر است[16]

غالبؔ کا ایک مقطع ہے:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

اس شعر میں غالبؔ نے اپنی اردو شاعری کو 'رشکِ فارسی' کہا ہے۔ یہ شعر 'نسخۂ بھوپال' کے حاشیے پر درج ہے۔ نسخۂ بھوپال کی کتابت ۱۸۲۱ء میں ہوئی تھی، جس کا مطلب ہے 'بیرنگِ منت' والے شعر سے کئی سال پہلے یہ شعر کہا گیا تھا۔ دراصل ذوقؔ سے ادبی معرکے میں غالبؔ ذوقؔ سے کہنا چاہتے تھے کہ تم تو اردو کے شاعر ہو میں فارسی کا شاعر ہوں، اس لیے مجھے تم پر فوقیت حاصل ہے۔

غالبؔ نبی بخش حقیرؔ کو اپنی اردو شاعری کے بارے میں ایک خط مورخہ اپریل ۱۸۵۱ء میں لکھتے ہیں:

''داد دینا کہ اگر ریختہ پایۂ سحر یا اعجاز کو پہنچے تو اس کی یہی صورت ہوگی یا کچھ اور شکل ۱۷؎

حقیرؔ کے نام ایک اور خط مورخہ اگست ستمبر ۱۸۵۲ء میں غالبؔ اپنی شاعری کی مخصوص انداز میں اس طرح تعریف کرتے ہیں:

''بھائی! خدا کے واسطے غزل کی داد دینا۔ اگر ریختہ یہ ہے تو میرؔ و مرزا کیا کہتے تھے۔ اگر وہ ریختہ تھا تو پھر یہ کیا ہے۔'' ۱۸؎

ان اشعار اور اقتباسات سے پتا چلتا ہے کہ غالبؔ اپنی اردو شاعری کو اعجاز اور سحر کہتے تھے، وہ نیز اردو میں میر تقی میر اور مرزا محمد رفیع سودا سے بہتر شاعر ہونے کے مدعی تھے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ غالبؔ فارسی اور اردو کے دونوں زبانوں کے عظیم شاعر تھے۔ اگر غالبؔ 'قاطع برہان' لکھ کر اور ہندوستان کے تمام فارسی شاعروں اور فرہنگ نویسوں کو غیر مستند کہہ کر اپنے خلاف بے وجہ محاذ قائم نہ کرتے تو یہ قلعی ہرگز نہ کھلتی کہ وہ فارسی کے محقق نہیں ہیں اور فارسی زبان پر انھیں وہ قدرت حاصل نہیں ہے، جس کے وہ زندگی بھر مدعی رہے ہیں۔ ان ادبی معرکوں کے باوجود غالبؔ کی شاعرانہ مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

غالبؔ کو اپنی فارسی دانی کا اتنا زعم ہوگیا تھا کہ وہ اپنے محسنوں اور سرپرستوں پر بھی براہِ راست یا بالواسطہ چوٹ کرنے سے باز نہیں رہتے تھے۔ اُنھوں نے اُنیس اشعار کا ایک فارسی قطعہ کہا، جس میں بالواسطہ طور پر بہادر شاہ ظفر کے استاد محمد ابراہیم ذوقؔ پر چوٹ کی گئی تھی پھر جب

غالبؔ مغل شہزادے جوان بخت کا سہرا لکھا تو اس کا مقطع تھا:

ہم سخن فہم ہیں، غالبؔ کے طرفدار نہیں

دیکھیں، اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

کہا جاتا ہے کہ ظفرؔ اپنے استاد پر غالبؔ کی چوٹ ناگوار گزری بقول محمد حسین آزادؔ ظفرؔ کے اشارے پر ذوقؔ نے سہرے کا جواب دیا۔ ذوقؔ کے سہرے میں یہ شعر بھی تھا:

جن کو دعویٰ ہو سخن کا، یہ سنادو اُن کو

دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

غالبؔ کے فارسی کے قطعے میں یہ شعر بھی تھا:

راست می گویم و از راست سر نتواں کشید

ہر چہ در گفتار فخر تست، آں ننگِ من است

اس شعر میں بھی ذوقؔ پر چوٹ تھی۔ نوبت یہ آئی کہ غالبؔ کو بارہ اشعار کی ایک غزل کہہ کر معافی مانگنی پڑی۔ اس غزل کا مطلع

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی

اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے

اس غزل کے دو اور شعر ہیں:

استادِ شہ سے ہو، مجھے پرخاش کا خیال

یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ

سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے

یہ معرکہ ۱۸۵۲ء میں ہوا۔ اس واقعے کے چودہ سال بعد غالبؔ فارسی دانی کے زعم میں اپنے مربی اور محسن رام پور کے نواب کلب علی خاں سے اُلجھ گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب پنشن کے علاوہ غالبؔ کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ وہ سو روپے ماہوار تھے، جو انھیں دربارِ رام پور سے ملتے تھے۔ اگر یہ روپے آنے میں کچھ دیر ہو جاتی تو غالبؔ نواب صاحب کو خط لکھ کر یاددہانی کراتے۔ ایسا بھی ہوتا کہ رام پور سے ماہانہ وظیفے کی ہنڈی آئی اور غالب نے تاریخِ ادائیگی سے پہلے ہی متی منہا کرا کے مہاجن سے رقم وصول کر لی۔ اس کے باوجود غالبؔ نواب صاحب کو لکھتے ہیں:

''فقیر اشعارِ قدما کا معتقد، اُن کے کلام کا عاشق، مگر جو لغات اُن کے کلام میں ہیں، اُن کے معنی تو اہلِ ہند نے اپنے قیاس سے نکالے ہیں۔ میں اُن کے قیاس پر کیوں کر تکیہ کروں۔ اب جو پیر و مرشد نے لکھا ہے کہ ارتنگ و وارژنگ متحد المعنی اور ''آشیاں ساختن و بستن و چیدن'' گھونسلا بنانے کے معنی پر ہے تو میں نے بے تکلف مان لیا لیکن نہ اُن صاحبوں کے قیاس کے بموجب بلکہ اپنے خداوند نعمت کے حکم کے مطابق۔''[۱۸]

نواب صاحب نے فوراً غالبؔ کے اس خط کا جواب دیا، جس میں ناخوشی و ناراضگی کا اظہار کیا۔ یہ خط 'مکاتیب غالب' (ص ۱۷۵) میں شامل ہے۔ غالب نواب صاحب کا خط پڑھ کر پریشان ہو گئے۔ سو روپے ماہوار آمدنی کا معاملہ تھا۔ غالب اور اُن کے خاندان کے افراد کا دار و مدار بہت حد تک اس آمدنی پر تھا۔ اُنھوں نے فوراً نواب صاحب کو خط لکھا۔ معافی مانگی لیکن دل سے نہیں۔ اُن کی فارسی دانی کا زعم اب بھی مانع تھا۔[۱۹]

مکاتیب غالب، ص ۱۷۵، نواب صاحب کا ناراضگی کا خط (یہ خط حواشی میں دیا گیا ہے)

غالبؔ ۱۶/ اکتوبر ۱۸۶۶ء کے خط میں نواب صاحب سے معافی ان الفاظ میں مانگتے ہیں:

''بعد تسلیم معروض ہے۔ آج سہ شنبہ سولہ ماہِ اکتوبر کی، دن کو بارہ بجے کھانا کھا کر بیٹھا تھا کہ توقیعِ وقیع آیا۔ پڑھتے ہی کانپ اُٹھا اور عالم نظر میں تیرہ و تار ہو گیا۔ اگر حضور کے ارشادات کو بحث تعبیر کیا ہو تو مجھے جنابِ الٰہی اور حضرتِ رسالت پناہی کی قسم۔! اگر چہ فاسق و فاجر ہوں مگر وحدانیتِ خدا اور نبوتِ خاتم الانبیا کا بہ دل معتقد اور بہ زبان معترف ہوں۔ خدا و رسول کی قسم جھوٹی نہ کھاؤں گا۔ انکارِ بحث سے مراد یہ تھی کہ شعرائے ہند

کے کلام میں جو غلطیاں نظر آتی ہیں یا ندی فرہنگ لکھنے والوں کے بیان میں جو نادرستی اور باہم جو اُن کے عقول میں اختلاف ہیں، اُس میں، میں کلام نہیں کرتا۔ اپنی تحقیق کو مانے ہوئے ہوں، اوروں سے مجھے بحث نہیں۔ باہمہ ضعفِ حافظہ یاد ہے کہ آخر میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ: ''ان دونوں باتوں کو میں نے مانا لیکن نہ فرہنگ لکھنے والوں کی رائے کے بہ موجب بلکہ اپنے خداوند کے حکم کے مطابق، یہ کلمہ موجب عتاب نہیں ہوسکتا اور اگر اس کو گناہ سمجھا جائے:

آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

گناہ معاف کیجیے اور نویدِ عفو سے مجھ کو تقویت دیجیے:

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

چند اہم دستاویزیں

نقشہ سفر مرزا غالب (کانپور سے باندہ تک)
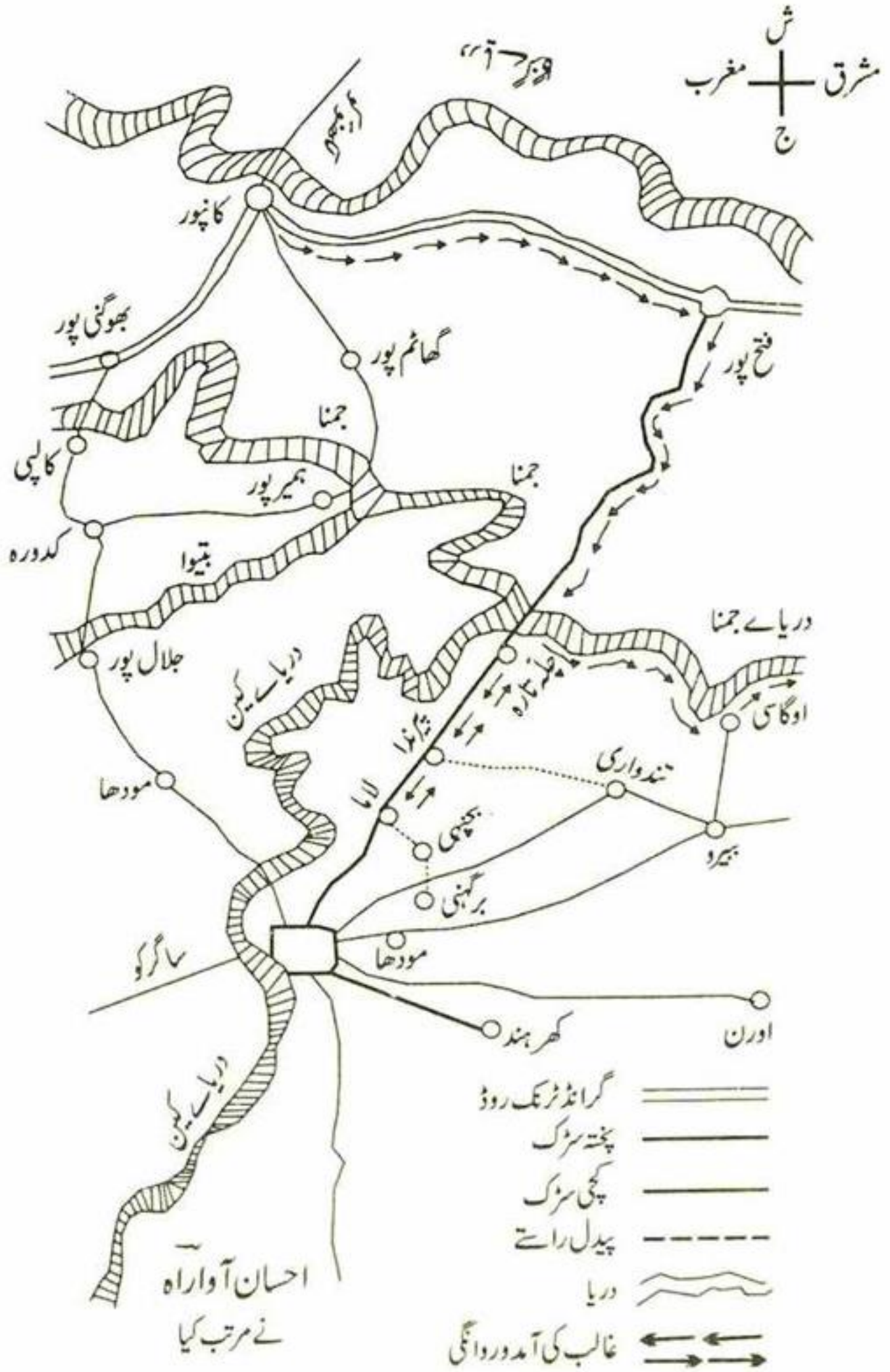
ذرائع آمدورفت باندہ
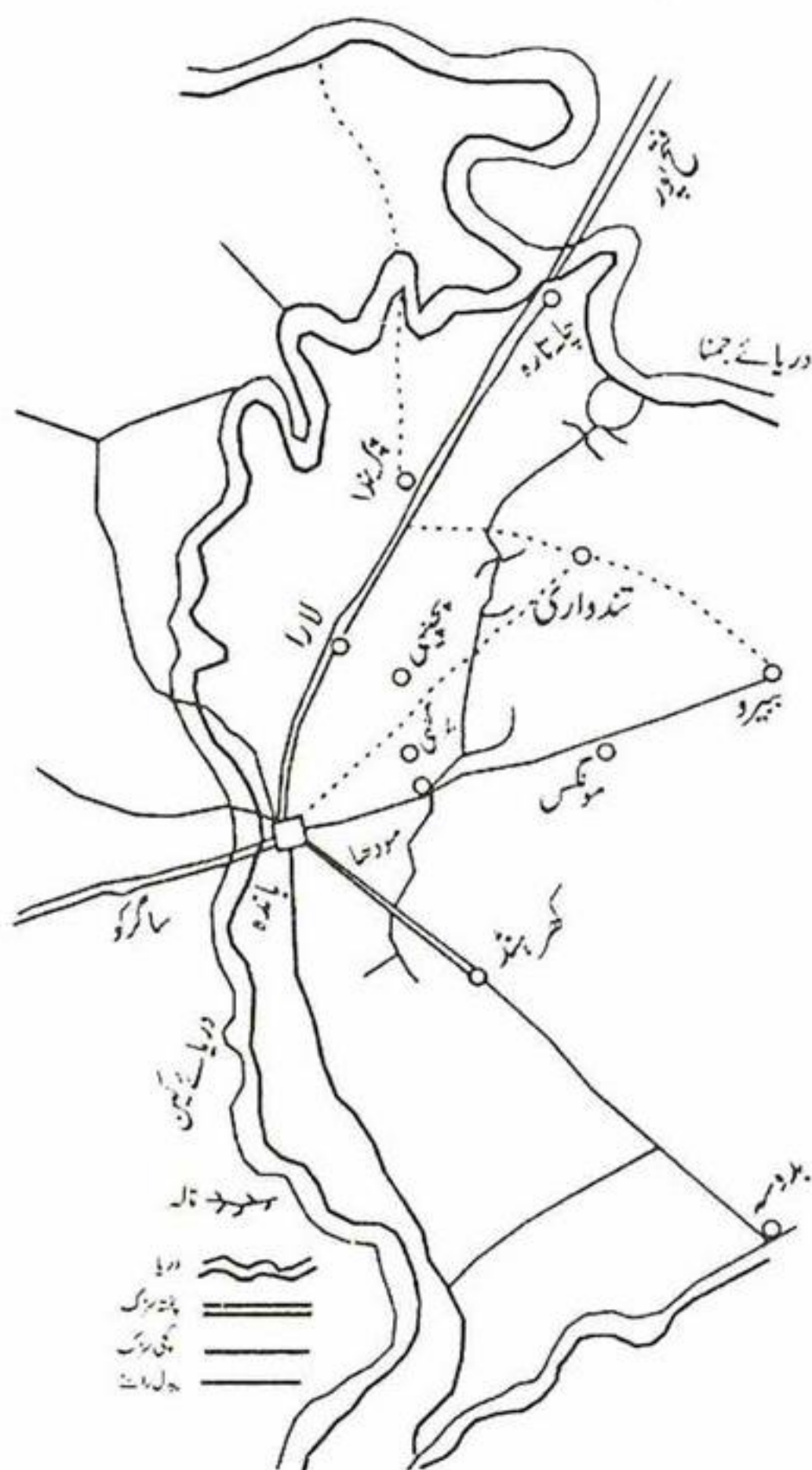
••• بہ شکریہ: صالحہ بیگم قریشی •••

ضمیمہ (۱)

(نقل عرضداشت غالب بنام (ولیم) فریزر صاحب معروضہ بیست و ہشتم اپریل ۱۸۲۸ء)

Ghalib's Petition to Mr. Fraser

صاحب والا مناقب والا شان، داور دادرس فیض رساں دام شوکتہ،

بہ عزّ عرض عالی .... می رساند

فدوی از متوسلانِ سرکارِ جہاں مدار کمپنی انگریز بہادر دام اقبالہٗ و نمک خواران و پرورش یافتگان اِین دولتِ ابدمدت است عمِ حقیقی فدوی موسوم بہ نصر اللہ بیگ خاں در عہدِ جرنیل صاحب والا مناقب جرنیل لارڈ لیک صاحب بہادر رسالہ چہار صد سوار از سرکار داشت و جاگیر لک روپیہ از سرکار یافتہ بود، و بعد از وفات اُو برای پرورشِ متعلقانِ اُو نقدی از سرکار شاملِ جاگیرِ احمد بخش خاں جاگیردار میوات قرار یافتہ، چون من بندہ از تعین مقدار و وضعِ تقسیمِ احمد بخش خان راضی نیستم، برائے عرضِ حالِ خود بہ کلکتہ آمدہ ام، و عرضی بہ حضور لامع النور نواب معلّی القاب نواب گورنر جنرل بہادر گزرانیدن می خواہم نہ رسیدن فدوی بخدمت صاحب ریذیڈنٹ شاہجہاں آباد، دو وجہ دارد، یکی ازاں در ضمنِ جفاہاے احمد بخش خاں کشیدن، و تا فتحِ بھرت پور بہ توقعِ وعدۂ احمد بخش خاں دران سفر سرگشتہ آمدن و حجت خود بر احمد بخش خاں تمام کردن و از بیم غوغای قرض خواہاں و اندیشۂ آبروی بہ شاہجہاں آباد نہ رفتن و رہ گرای کانپور گشتن و در کانپور بیمار گردیدن، مفصّل در عرضداشتِ بندگانِ حضور پُرنور معروض و مرقوم است۔ وجہ دوم این کہ کاغذے کہ مناط دعوے فدوی بر آں است در دفتر خانۂ رزیدنٹی شاہجہاں آباد نیست یعنی رپوتے کہ جناب جرنیل صاحب والا مناقب جرنیل لارڈ لیک صاحب بہادر در ۱۸۰۶ء عیسوی در بابِ جاگیرِ احمد بخش خاں، و مُعافیِ زرِ استمراری سرکار بر او شاں، از کانپور بہ کلکتہ ارسال داشتہ اند، و ہر آئینہ نقل آن رپوت و کیفیت منظوری آں در دفتر خانۂ کلکتہ خواہد بود، و معہذا در دہلی و کلکتہ و جمیع بلاد ہندوستان ہماں یک حکم سرکار دولت مدار است، لہذا فدوی بہ توقع دادرسی و کامیابی در عالم بی سروسامانی و بیماری و ناتوانی، دو صد فرسنگ راہ، طی کردہ، خود را بدین دادگاہ رسانیدہ است، و با ایں ہمہ مقدمہ فدوی از دولت خواہی و خیر اندیشی اہالیِ سرکارِ جہان مدار خالی نیست۔ چنانچہ از ملاحظۂ عرضداشت مفصل واضح خواہد گردید، اُمید کہ عرضیِ فدوی را از نظرِ فیض اثر بندگانِ حضور لامع النور، بگزرانند۔ واجب بود عرض نمود۔ آفتابِ دولت و اقبال تاباں و درخشاں باد۔

عرضے

اسد اللہ خان عُرف مرزا نوشہ

برادر زادہ نصراللہ بیگ خاں

جاگیردار سونک سونسا

(شرح لفافہ)

ازنظرِ فیض مظہر صاحب والا مناقب والا شان داور داد رس فیض رساں جناب فریزر صاحب بہادر دام شوکتہٗ بگزرد

عرضداشت اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ۔ برادر زادۂ مرزا نصراللہ بیگ خاں جاگیردارِ سونک سونسا۔

معروضہ بیست وہشتم اپریل ۱۸۲۸ء

ضمیمہ (۲)

(گورنمنٹ کا شقہ بنام نواب احمد بخش خاں مشتمل بر حکم منظوری تجویز جنرل لارڈ لیک بہادر کی نقل)

Lord Lake's Parwanah of 4 May 1806

شہامت وعوالی مرتبت احمد بخش خاں بہادر در حفظِ الٰہی محفوظ باشند

چون از حضور صمصام الدولہ اشجع الملک خان دوران خان جنرل جرارد لارد لیک بہادر سپہ سالار فتح جنگ، مدِ نظرِ خدمت گزاری و خیر اندیشی و جانفشانی ایشاں، محالاتِ فیروز پور جھرکہ و پتہ سانگرس و پونا ہانہ و نچھورو نگینہ۔ معہ مال و سایر دروبست، سوای باغات و املاک و آیمہ و جاگیر و مُعافی و پنارتہ و روزینہ وغیرہ کہ از قدیم مقرر است، بہ صیغۂ استمرار بہ آن عوالی مرتبت مشروط بر این معنی کہ مُعاونت از حضور نہ طلبند و بندوبستِ محالاتِ مذکورہ را از جمعیتِ خود بہ خوبی دُرست دارند، و پرورش و پرداخت خواجہ حاجی وغیرہ متوسلانِ مرزا نصراللہ بیگ خاں مرحوم بہ ذمۂ ایشاں است۔ وموازیِ پنجاہ سوار بہ وقتِ ضرورت حسب الطلب در سرکار حاضر سازند و ہموارہ در خیر اندیشی و جان فشانی نسبت سرکار دولت مدار کمپنی انگریز بہادر دام اقبالہم مصروف باشند مقرر نمودہ بودند۔ این

معنی بہ حضور نیز منظور و مقبول شدہ، نظر بر نیک طینتی و دولت خواہی و جانفشانی و خدمت گزار یہای نمایاں آن عوالی مرتبت نسبت سرکار ممدوح، کہ از نوشتۂ سپہ سالار موصوف بہ وضوح پیوست بہ جلدوی آن محالات، رقوم دروبست معہ مال و سایر، سوای منہائی کہ بالا مرقوم گردید، مشروط بہ شرائطِ مذکورہ من ابتدای فصل ربیع ۱۲۱۳ فصلی بر سبیل دوام نسلاً بعد نسلٍ بہ ایشاں معاف و مرفوع القلم فرمودیم۔ بعد ازین اہالیِ سرکارِ دولت مدار ممدوح را بہ وجہی من الوجوہ از محالات مرقوم سروکاری نہ خواہد بود کہ ہموارہ در تصرف ایشاں و فرزندانِ ایشاں خواہد ماند و چون مکان زر طلب است نالش احدی از مردمانِ محالات مذکورہ مسموع نہ خواہد گشت۔ می باید کہ بہ غایت این عطیۂ عظمیٰ مرہونِ منتِ حضور و پیوستہ در خیر اندیشی و جانفشانی بہ نسبتِ سرکار معظم الیہ مصروف بودہ باشند، کہ موجب سود و بہبود ایشاں خواہد بود۔ مرقوم چہارم ماہ مئی ۱۸۰۶ء عیسوی مطابق چہاردہم صفر ۱۲۲۱ ہجری المقدسہ۔

ضمیمہ (۳)

(نواب احمد بخش خاں کے نام لارڈ لیک کے خط مورخہ ۷ر جون ۱۸۰۶ء کی نقل)
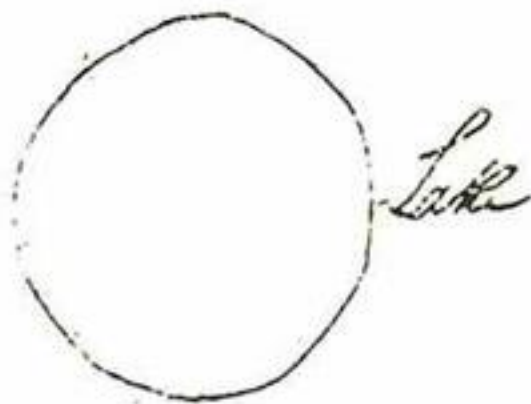
Disputed Parwaneh of 7 June 1806

شہامت وعوالی مرتبت نواب صاحب مہربان دوستان نواب احمد بخش خاں بہادر سلمہٗ اللہ تعالیٰ

چون غور و پرداخت واماندگان مرزا نصراللہ خاں مرحوم، اہالیِ سرکارِ دولت مدار کمپنی انگریز بہادر دام اقبالہٗ را مرکوز و منظور است و سابق ازین سند کہ از حضور گورنر جنرل بہادر بہ ایشاں مرحمت گردیدہ' درآں نیز بر سبیلِ اجمال مندرج و مرقوم است۔ لہٰذا نگارش می رود کہ مبلغ پنج ہزار روپیہ سکہ رائجِ پرگنہ کہ بآں شہامت مرتبت از حضور مرحمت گردیدہٗ بہ موجبِ تفصیلِ ذیل بہ ہریک از متوسلانِ مرزا مرحوم مذکور بہ موجبِ حساب ماہ بہ ماہ و سال بہ سال رسانیدہ باشند، کہ آنہا صرفِ معیشت خودہا نمودہ، بہ دعای از دیار عمرِ و دولت اہالی ممدوح، مشغول و موظف باشند۔ دریں باب تاکیدِ مزید دانستہ حسب المسطور بہ عمل آرند۔

خواجہ حاجی　　　والدہ وہمشیرہ مرزا مرحوم　　　مرزا نوشہ (غالب) و مرزا یوسف

برادر زادہا مرزا مرحوم

مرقوم ہفتم ماہ جون ۱۸۰۶ءعیسوی مطابق نوزدہم ربیع الاول ۱۲۲۱ ہجری

حواشی

حرفِ آغاز

۱- نامہ ہائے فارسی غالب، مرتبہ سید اکبر علی ترمذی، نئی دہلی، ص ۱۰۶
۲- قاضی عبدالودود، غالب بہ حیثیت محقق مشمولہ نقدِ غالب، مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد، علی گڑھ، ۱۹۵۶ء، ص ۳۹۴
۳- غالب اور ظفر کے ادبی معرکے کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: خلیق انجم: غالب اور شاہانِ تیموریہ، نئی دہلی، ۱۹۷۴ء، ص ص ۱۵-۳۱

غالبؔ کے سفرِ کلکتہ کا آغاز

۱- غالب کی خاندانی پنشن، مرتبہ مقتدرہ، اسلام آباد، ۱۹۹۷ء، ص ۲۸
۲- غالب کی خاندانی پنشن، ص ۲۸
۳- مالک رام، فسانۂ غالب، نئی دہلی ۱۹۷۱ء، ص ۱۱۳
۴- غالب کی خاندانی پنشن، ص ۳۲
۵- غالب، پنج آہنگ، دہلی ۱۸۵۳ء ص ص ۳۲۸-۳۲۹
۶- غالب کی خاندانی پنشن، ص ص ۲۸، ۲۹
۷- افکار، غالب نمبر، ۱۸۶۹ء ص ۴۹
۸- غالب کی خاندانی پنشن، ص ۲۹
۹- غالب کی خاندانی پنشن، ص ۲۹
۱۰- مالک رام، فسانۂ غالب، ص ۱۱۰
۱۱- غالب کی خاندانی پنشن، ص ۲۹
۱۲- غالب کی خاندانی پنشن، ص ۳۰
۱۳- غالب کی خاندانی پنشن، ص ۳۲
۱۴- نامہ ہائے فارسی غالب (فارسی متن)، سید اکبر علی ترمذی، ص ۱۰

غالبؔ کان پور اور لکھنؤ میں

۱-'' جب مرزا نے دلّی سے کلکتے جانے کا ارادہ کیا تھا، اس وقت راہ میں ٹھہرنے کا قصد نہ تھا، مگر چوں کہ لکھنؤ کے بعض ذی اقتدار لوگ مدّت سے چاہتے تھے کہ مرزا ایک بار لکھنؤ آئیں، اس لیے کان پور پہنچ کر ان کو خیال آیا کہ لکھنؤ بھی دیکھتے چلیے۔ اس زمانے میں نصیرالدین حیدر فرماں روا اور روشن الدولہ نائب السلطنت تھے۔''

(حالیؔ، یادگارِ غالب، نئی دہلی ۱۹۶۶ء، ص ص ۳۷-۳۸)

غالبؔ لکھنؤ کے بعض ذی اقتدار کی خواہش پر لکھنؤ نہیں گئے بلکہ اپنے علاج کے لیے گئے تھے۔ جب غالبؔ لکھنؤ پہنچے ہیں تو اس وقت لکھنؤ کے بادشاہ نصیرالدین حیدر نہیں غازی الدین حیدر اور نائب سلطنت روشن الدولہ نہیں معتمد الدولہ تھے۔

۲- غالب کی خاندانی پنشن، ص ۳۰

۳- مختارالدین احمد آرزو، غالب کا ایک غیر مطبوعہ فارسی مکتوب مشمولہ سہ ماہی اردو ادب (علی گڑھ، جولائی تا دسمبر ۱۹۵۲ء) ص ص ۹۶-۹۹

۴- پنج آہنگ، ص ۳۳۱

۵- غالب کی خاندانی پنشن، ص ۳۰

۶- نامہ ہاے فارسی غالب، ص ۱۳

۷- نامہ ہاے فارسی غالب، ص ۱۳

۸- نامہ ہاے فارسی غالب، ص ۱۳

۹- ماہِ نو، کراچی، غالب نمبر، جنوری فروری ۱۹۶۹ء، ص ۲۰۵

۱۰- اس قصیدے کے سلسلے میں ملاحظہ ہوں۔ قاضی عبدالودود، غالب کے ایک قصیدے کا اولین ممدوح، مشمولہ کچھ غالب کے بارے میں، حصہ اول، پٹنہ ۱۹۹۵ء، ص ص ۱۰۰/۱-۱۰۰/۷۔ قاضی عبدالودود، غالب کی راست گفتاری، علی گڑھ میگزین، ۱۹۴۸ء۔ مالک رام، غالب کی راست گفتاری، نقوش، مارچ ۱۹۶۳ء غالب، غالب کے خطوط مرتبہ خلیق انجم خط بنام مرزا ہرگوپال تفتہ، مورخہ ۱۹/اگست ۱۸۶۱ء ص ص ۳۲۷-۳۲۸

۱۱- کلیاتِ فارسی غالب مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، جلد دوم، لاہور ۱۹۶۷ء ص ص ۱۱۲-۱۲۱

۱۲- پنج آہنگ، ص ص ۳۳۰-۳۳۱

غالبؔ کا باندہ، الہ آباد، بنارس اور مرشد آباد کا سفر

۱-محمد مشتاق شارق، غالب اور بندیل کھنڈ، مشمولہ سہ ماہی
تحریر (اپریل رجون) ۱۹۷۷ء، ص ص ۳-۱۸
۲-صالحہ بیگم قریشی، باندہ اور غالب، باندہ ۱۹۹۴ء
۳-غالبؔ، غالب کے خطوط: جلد ۳، مرتبہ خلیق انجم، دہلی، ۱۹۹۰ء، ص ۹۸۰
۴- باندہ اور غالب، ص ص ۲۵-۲۶
۵-باندہ اور غالب، ص ۵۲
۶-غالب کی خاندانی پنشن، ص ۳۰
۷-غالب کی خاندانی پنشن، ص ۳۰
۸-غالب اور باندہ، ص ص ۴۷-۷۵
۹-غالب اور باندہ، ص ۴۱
۱۰-نامہ ہاے فارسی غالب، ص ۴۱
۱۱-نامہ ہاے فارسی غالب، ص ۱۶
۱۲-نامہ ہاے فارسی غالب، ص ۴۱
۱۳-مالک رام، ذکرِ غالب، دہلی ۱۹۷۶ء، ص ۶۷
۱۴-قاضی عبدالودود، غالب کے بارے میں، حصہ ۲، پٹنہ ۱۹۹۵ء، ص ۵۳۹
۱۵-غالب، غالب کے خطوط، جلد چہارم، مرتبہ خلیق انجم، دہلی، ۱۹۹۳ء، ص ۱۵۲۲
۱۶-نامہ ہاے فارسی غالب، ص ۲۰
۱۷-نامہ ہاے فارسی غالب، ص ۲۰
۱۸-اوراق معانی، ترجمہ، پنج آہنگ از ڈاکٹر تنویر احمد علوی، دہلی ۱۹۹۲، ص ص ۶۷-۶۸
۱۸ (الف)-نامہ ہاے فارسی غالب، ص ۲۱-۲۲
۱۹-نامہ ہاے فارسی غالب، ص ص ۲۳-۲۴
۲۰-نامہ ہاے فارسی غالب، ص ص: ۲۴-۲۵
۲۱- قاضی عبدالودود، کچھ غالب کے بارے میں، حصہ اوّل، پٹنہ، ۱۹۹۵ء، ص ۲۲۰
۲۲-غالب، گلِ رعنا مرتبہ مالک رام، دہلی، ۱۹۷۰ء، ص ۲۷

۲۳- پنج آہنگ، ص ص ۳۴۱-۳۴۲
۲۴- پنج آہنگ، ص ۶۵
۲۵- قاضی عبدالودود، مآثر غالب، پٹنہ، ۱۹۹۵ء، ص ص ۲۸-۲۹

غالبؔ کلکتے میں

۱- نامہ ہائے فارسی غالب، ص ۲۶
۲- پنج آہنگ، ص ۳۵۸
۳- قاضی عبدالودود، مآثر غالبؔ، پٹنہ، ۱۹۹۵ء، ص ص ۲۸-۲۹
۴- پنج آہنگ میں شامل نواب محمد علی خاں کے نام ایک خط میں غالبؔ نے اس مکان کا کرایا دس روپے ماہوار بتایا ہے۔
۵- نامہ ہائے فارسی غالب، ص ۵
۶ - ابوالکلام آزاد، نقشِ آزاد، مرتبہ غلام رسول مہر، لاہور، سنہ اشاعت ندارد، ص ۲۷۳
۷- نامہ ہائے فارسی غالب، ص ۲۷
۸- نامہ ہائے فارسی غالب، مترجمہ پرتوِ روہیلہ، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ص ۸۹-۹۹
۹- نامہ ہائے فارسی غالب، ص ۳۲-۳۳
۱۰- نامہ ہائے فارسی غالب، مترجمہ پرتو روہیلہ، ص ۲۴
۱۰(الف)- نامہ ہائے فارسی غالب، ص ۳۲
۱۱- نامہ ہائے فارسی غالب، ص ۳۷
۱۲- نامہ ہائے فارسی غالب، ص ص ۶۸-۶۹
۱۳- نامہ ہائے فارسی غالب، ص ۶۹
۱۴- نامہ ہائے فارسی غالب، مترجمہ پرتو روہیلہ، ص ۱۱۸
۱۵- نامہ ہائے فارسی غالب، مترجمہ پرتو روہیلہ، ص ۱۲۳
۱۶- نامہ ہائے فارسی غالب، مترجمہ پرتو روہیلہ، ص ۱۳۸

غالبؔ کی پینشن کا قضیہ

۱- ماہانہ افکار، کراچی، مارچ ۱۹۶۹ء، ص ص ۴۶-۵۴

۲- غالبؔ نے عرض داشت کلکتے سے واپسی کے وقت نہیں بلکہ کلکتے پہنچتے ہی پیش کی تھی۔
۳- نصراللہ بیگ خاں کی بیوی احمد بخش خاں کی بیٹی نہیں بہن تھیں۔ نصراللہ بیگ خاں احمد بخش خاں کے داماد نہیں بہنوئی تھے۔
۴۔۵- عرض داشت کا ترجمہ فارسی سے انگریزی میں ہوا تھا۔ اس لیے رشتوں کا ترجمہ غلط ہوا ہے۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ نصراللہ بیگ خاں نواب احمد بخش خاں کے داماد نہیں بہنوئی تھے۔
۶- خواجہ حاجی کے دو لڑکے تھے۔ خواجہ شمس الدین عرف خواجہ جان اور خواجہ بدرالدین عرف خواجہ امان۔
۷- اصل نام قوقان بیگ تھا۔ یہ فارسی سے انگریزی میں ترجمے کا کرشمہ ہے۔
اس کے بعد کی تمام تفصیلات 'غالبؔ کی خاندانی پنشن' اور 'نامہ ہائے فارسی غالبؔ' سے لی گئی ہیں۔

ادبی معرکے کے تین مشاعرے

۱- نامہ ہائے فارسی غالبؔ، مترجمہ، پرتو روہیلہ، ص ۱۵۷
۲- نامہ ہائے فارسی غالب (پرتو روہیلہ) ص ص ۳۴۔۳۵
غالبؔ نے اپنے تخلص کے بارے میں منشی شیونرائن آرامؔ کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

> ''میں نے تو کوئی دو چار برس ابتدا میں اسدؔ تخلص رکھا ہے ورنہ غالبؔ ہی لکھتا رہا ہوں۔'' (غالبؔ کے خطوط: ۳: ۱۰۷۳)۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشیؔ نے لکھا ہے۔ ''لیکن یہ دو چار برس صحیح تخمینہ نہیں۔ کیوں کہ وہ اپنی شعرگوئی کی پہلی منزل 'بیدلی رنگ' کے زمانے میں 'اسدؔ' ہی لکھتے رہے ہیں۔ البتہ فارسی میں سرے سے 'غالبؔ' ہی تخلص ہی استعمال کیا ہے، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اُنھوں نے فارسی کے لیے یہ تخلص پسند کیا تھا، بعد میں ریختے کے انداز بھی لکھنے لگے۔
>
> (دیوانِ غالب اردو، نسخۂ عرشی، علی گڑھ، ۱۹۵۸ء ص ص ۱۳۔۱۴)

۳- نامہ ہائے فارسی غالب، مترجمہ پرتو روہیلہ، ص ص ۱۰۲۔۱۰۳
۴- نامہ ہائے غالب فارسی، مترجمہ، ص ۴۰
۵- نامہ ہائے فارسی غالب، پرتو روہیلہ: ص ۹۰

۳-نامہ ہائے فارسی غالب (مترجمہ پرتو روہیلہ)، ص ۱۵۸
۴-نامہ ہائے فارسی غالب (مترجمہ پرتو روہیلہ)، ص ۱۵۸
۴ (الف)-غالب کے خطوط: ۲: ص ص: ۸۴۰_۸۴۱
۶-نامہ ہائے فارسی غالب (مترجمہ پرتو روہیلہ)، ص ۱۵۸
۷-نامہ ہائے فارسی غالب (مترجمہ پرتو روہیلہ)، ص ۱۵۸
۷ (الف)-نامہ ہائے فارسی غالب، ص ۱۵۸
۸-قاطع برہان، مشمولہ قاطعِ برہان ورسائلِ متعلقہ، ص ۱۵۵
۹-سید لطف الرحمٰن، غالب اور اُن کے معترضین، کلکتہ، ۱۹۷۳ء، ص ۹۷
۱۰-غالب کے خطوط: ۲: ص ص ۸۴_۸۴۱
۱۱-سید اکبر علی ترمذی، غالب اور سفیرِ ہرات، مشمولہ سہ ماہی تحریر، ۱۹۷۲ء، شمارہ ۱، ص ص ۵۷_۶۰

سفرِ کلکتہ میں غالبؔ کی صحت

۱-مختار الدین احمد، غالب کا ایک غیر مطبوعہ مکتوب، مشمولہ اردو ادب، جولائی تا دسمبر ۱۹۵۲ء، ص ۹۹
۲-باندہ اور غالبؔ، ص ۷۵
۳-نامہ ہائے فارسی غالب، ص ۶۹
۴-تحقیق نامہ، ص ۲۹
۵-پنج آہنگ، ص ۳۴۳
۶-'کلیات غالب' فارسی مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل میں اس رباعی کا پہلا مصرع اس طرح ہے:
غالب ہر پردہ ای نوای دارد
۷-نامہ ہائے فارسی غالب، ص ۱۹۲

سفرِ کلکتہ میں غالبؔ کی مالی حالت

۱-نامہ ہائے فارسی غالب، ص ۴۱

۲-نامہ ہاے فارسی غالب، ص ۴۱

۳-نامہ ہاے فارسی غالب، ص ۴۲

۴-نامہ ہاے فارسی غالب، ص ۴۴-۴۵

۵-غالب، ۳۳، فارسی مکاتیب الخ مرتبہ پرتوِ روہیلہ مشمولہ تحقیق نامہ، لاہور، ۱۹۹۷ء-۱۹۹۸ء، ص ۳۰

غالبؔ کی تخلیقی سرگرمیاں سفرِ کلکتہ کے دوران

۱-کلیاتِ نثر اور کلیاتِ نظم کے یہ دونوں حوالے میں نے سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی سے لیے ہیں۔

۲-غالبؔ کے خطوط ۴: ۱۴۱۵

۳-مالک رام، ذکرِ غالبؔ، طبع چہارم، دلی، ۱۹۶۴ء ص ۳۴

۴-دیوانِ غالب، نسخۂ حمیدیہ، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۱

۵-غالبؔ، نامہ ہاے فارسی غالب، پرتو روہیلہ، ص ۶۵

۶-نامہ ہاے فارسی غالب، ص ص ۱۴-۱۵

۶(الف)-نامہ ہاے فارسی غالب، ص ۲۹

۷-غالبؔ نے اس قصیدے کے بارے میں اپنے ایک دوست محمد حسن کے نام ایک خط میں لکھا ہے۔

> ''میں نے اس سے پہلے خانِ والا شاں سبحان علی خاں کے نام ایک خط، حضور والاے وزارت پناہ (معتمد الدولہ) کی خدمت میں ایک عرض داشت اور بادشاہ (شاہِ اودھ نصیر الدین حیدر) کی مدح میں لکھا گیا قصیدہ۔ یہ تمام کاغذات ایک ساتھ شاہِ اودھ کے وکیل ......راجا صاحب رام صاحب کی خدمت میں ارسال کر دیے تھے۔''

۸-نامہ ہاے فارسی غالب، ص ۲۹

۹-غالبؔ، گل رعنا، مرتبہ سید قدرت نقوی، کراچی، ۱۹۷۵ء ص ۱۷

۱۰-نقوش، لاہور، غالب نمبر حصہ دوم، ص ص ۳۲۷-۳۲۹

۱۱-گل رعنا، مرتبہ مالک رام، ص ۲۷

۱۲-غالبؔ نے لکھا ہے کہ میں نے اسٹرلنگ کی مدح میں پچپن اشعار کا قصیدہ کہا ہے۔ 'گل رعنا' اور 'کلیات فارسی' دونوں میں یہ قصیدہ نقل ہوا ہے۔ یہ پہلا قصیدہ ہے جو غالب نے کسی انگریز کی مدح میں کہا تھا۔

۱۳-دہلی کے ریذیڈنٹ کول بروک کو مالی بدعنوانیوں کی وجہ سے معطل کردیا گیا تھا۔ اُن کی جگہ اکتوبر ۱۸۲۹ء میں فرانسس ہاکنس کا بطور قائم مقام ریذیڈنٹ تقرر عمل میں آیا۔ (۱۸۳۱ء تک یہ اس عہدے پر فائز رہے) غالب نے کلکتے سے اپنے مقدمے کے کاغذات فرانسس ہاکنس کو بھیجے تھے۔ ہاکنس کے نواب شمس الدین سے گہرے مراسم تھے، اسی لیے شاید اُنھوں نے غالب کے خلاف رپورٹ بھیجی۔ غالب نے غصّے میں تین اشعار کا ان پر ہجو یہ قطعہ لکھا، جس کا پہلا شعر ہے:

ایا ستم زدہ غالبؔ ! ز ہاکنس

منہ بہ سینۂ بے کینہ از شکایت داغ

بعد میں غالبؔ نے ہاکنس کی مدح میں کہے گئے قصیدے کے ابتدائی اشعار میں تبدیلی کر کے اسے چارلس مٹکاف کی مدح میں کردیا۔

۱۴-گل رعنا، مرتبہ مالک رام، ص ۱۱۴

اس قطعے میں کلکتے کے بارے میں غالبؔ کا شعر ہے:

حالِ کلکتہ باز جستم ، گفت

باید اقلیمِ ہشتمش گفتن

کلکتے میں جو ادبی معرکہ ہوا تھا، اس کے حوالے سے یہ شعر ہے۔

گفتم ایں جا چہ کار باید کرد

گفت: قطع نظر زِ شعرو سخن

قطعے کے یہ تین شعر بھی اس ادبی معرکے کے بارے میں ہیں۔

گفتم: ' از بہرِ داد آمدہ ام'

گفت: بگریز و سربسنگ مزن

گفتم: ' اکنوں مرا چہ زیبد؟ گفت

آستین بردو عالم، زمشاندن

گفتمش : باز گو طریقِ نجات
گفت: غالبؔ ! بہ کربلا رفتن

۱۵- اس غزل کا مقطع ہے:

کاش ، کان بتِ کاشی در پزیرم، غالبؔ
" بندۂ توام، گویم ، گویدم زناز ، آری'

اس شعر سے پتا چلتا ہے کہ کاشی کے کسی حسین کے عشق میں گرفتار ہو گئے تھے، اسی لیے وہ تقریباً ایک مہینے تک بنارس میں مقیم رہے۔

۱۶- اس غزل کا مقطع ہے:

غالبؔ ! رسیدہ ایم بہ کلکتہ وہ بہ مے
از سینہ داغِ رحلتِ نواب شستہ ایم

اس مقطع سے اندازہ ہوتا ہے کہ کلکتے کے پہنچنے کے کچھ ہی دن بعد یہ غزل کہی گئی۔ 'نوابؔ' سے مراد غالباً باندے کے محمد علی خاں ہیں۔

۱۷- یہ زمین ہمام کی ہے۔ کلکتے کے پہلے طرحی مشاعرے میں غالبؔ کو فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے مصرعے دیے گئے تھے۔ غالب نے فارسی میں گیارہ شعر کی غزل کہی تھی۔ اس غزل کے ایک شعر پر دو اعتراضات کیے گئے' ادبی معرکے' کے عنوان کے تحت اعتراضات کی تفصیل بیان کی جا چکی ہے۔ اس غزل کا مقطع ہے۔

گرد ہم شرحِ ستم ہاے عزیزاں، غالبؔ
رسمِ امید ہمانا ز جہاں برخیزدؔ

مرزا افضل بیگ خاں غالبؔ کے بہنوئی کے چھوٹے بھائی تھے۔ پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں یہ صاحب غالبؔ کی زبردست مخالفت کر رہے تھے۔ اس مقطع میں بظاہر اُن کی طرف اشارہ ہے۔

۱۸- نامہ ہاے فارسی غالب، ص ۲۰

۱۹- یہ قطعہ 'گل رعنا' اور 'کلیات فارسی' میں نہیں ہے۔ صرف نامہ ہاے فارسی غالبؔ، مترجمہ پرتو روہیلہ، (ص ۱۳۴) میں نقل ہوا ہے۔

۲۰- یہ قطعہ 'گل رعنا' اور 'کلیاتِ فارسی' میں نہیں ہے۔ صرف نامہ ہاے فارسی غالب، مترجمہ پرتو روہیلہ، میں ہے۔

غالبؔ نے اس قطعۂ تاریخ کے بارے میں لکھا ہے کہ

''جب لفظ ('' نالہ'' کے اعداد) '' تعزیت سرائے'' کے اعداد (پر)
بڑھائے جائیں تو ۱۲۴۴ ہو جائیں گے۔''

پرتوِ روہیلہ غالبؔ کے اس بیان کے بارے میں لکھتے ہیں:

'' یہاں جو عبارت ہے (چون عدد لفظِ '' تعزیت سرای'' بفزایند ۱۲۴۴ می شود) اس سے بات اُلجھ جاتی ہے اور مطلوبہ عدد حاصل نہیں ہوتا۔ یہ سہوِ کاتب معلوم ہوتا ہے۔ غالباً اصل عبارت یوں ہوگی: چون عدد لفظِ '' نالہ'' '' تعزیت سرای'' بفزایند ۱۲۴۴ می شود۔

'' تعزیت سرای'' کے اعداد ۱۱۵۸ پر جب '' نالہ'' کے اعداد ۸۶ بڑھائے جائیں تو حاصل جمع ۱۲۴۴ ہو جاتا ہے) 'نامہ ہائے فارسی غالب (اردو ترجمہ) ص ۱۳۴

۲۱- مرزا ابوالقاسم خاں نے غالبؔ کو پانچ اشعار کا درجِ ذیل قطعہ بھیجا تھا۔

قطعہ

'ابوالقاسم خان باسد اللہ خان غالب'
ای مسیحِ زمان، تو می دانی
بجنابت ارادتی کہ مراست
و علی کی رسد بہ تشخیصت
کی فلاطون مثال تو داناست
می سزد ، گر بگویمت بقراط
ور فلاطون بخوانمت ، زیباست
مسہلی دادی و بفرمودی
عمل آر بیگان کہ شفاست
زان عمل دور شد مرض بالکل
گر بگویم توئی مسیح ، بجاست

۲۲- متفرقاتِ غالب، طبع دوم، ص ص ۱۰۸-۱۱۴

۲۳- بعد میں غالبؔ نے رباعی کا پہلے مصرعے میں الفاظ کی رد و بدل کر دی ہے۔ 'نامہ ہائے فارسی غالب' میں یہ مصرع اس طرح ہے۔

ہر پردۂ زندگی نوائے دارد

غالبؔ کے مطبوعہ 'کلیاتِ فارسی' میں یہ مصرع اس طرح ملتا ہے ۔

غالب ، ہر پردہ نوائے دارد

۲۴- 'کلیاتِ فارسی' میں بھی یہ رباعی شامل ہے لیکن غالبؔ نے اس میں خاصی تبدیلی کر دی ہے۔کلیات میں یہ رباعی اس طرح ہے۔

سرتا سر دھر عشرتستانِ تو باد
صد رنگ گلِ طرب بدامانِ توباد
عیداست و بہار خرمی ہا دارد
جانِ من و صد چوں من بقربان تو باد

۲۵- کلیات فارسی میں نوشعر کی یہ غزل موجود ہے مگر اس کی ردیف کا عتباری داشتیم، اشکباری داشتیم کے بجائے کا عتباری داشتم۔اشکباری داشتم ہے۔

۲۶- کلیات غالبؔ میں دس شعر کی یہ غزل موجود ہے۔

۲۷- بارہ شعر کی یہ غزل 'گل رعنا' میں نہیں ہے لیکن کلیاتِ فارسی میں شامل ہے۔اس غزل کے بارے میں غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

"مولانا ابوالکلام کے پاس عبدالغفور خاں نساخ کے دیوان کا ایک نسخہ ہے جسے مصنف نے سادہ اوراق کے اضافے کے ساتھ مجلد کرالیا تھا، اس میں وہ اپنا کلام بھی لکھتے تھے۔ کہیں کہیں یادداشتیں بھی قلم بند کی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے مطبوعہ تذکرے کے لیے مزید مواد جمع کر رہے تھے۔ ایک یادداشت میں لکھتے ہیں کہ جب غالب کلکتہ میں مقیم تھے تو شاہ اودھ کے وکیل (سید کرم حسین) نے کئی مشاعرے اپنے یہاں منعقد کیے تھے اور کلکتہ کے ایرانیوں کی بڑی تعداد ان میں شریک ہوتی تھی۔ ایک مشاعرے کی طرح یہ تھی۔ "جانوشتہ ایم۔" غالب نے غزل پڑھی۔

تا فصلے از حقیقتِ اشیا نوشتہ ایم
آفاق را مرادف عنقا نوشتہ ایم

حاجی عبدالکریم اصفہانی کلکتہ کے بہت بڑے تاجر تھے۔ ان کے یہاں ایک ایرانی فاضل مرزا کوچک نام مقیم تھے، جنھوں نے مجلس میں کھڑے ہو کر کہا: اس درجہ کا شاعر آج سرزمین ایران میں بھی کوئی نہیں۔"

(غلام رسول مہر، غالبؔ، لاہور، ۱۹۴۴ء، ص ۱۲۳)

۲۸- یہ غزل 'گل رعنا' اور 'کلیاتِ فارسی' دونوں میں ہے۔ مقطع بتا رہا ہے کہ یہ غزل کلکتے میں کہی گئی تھی۔

۲۹- اس غزل کے 'گل رعنا' میں سات اور 'کلیاتِ فارسی' میں نو شعر ہیں۔ مقطع سے پتا چلتا ہے کہ یہ غزل کلکتے میں کہی گئی تھی۔

۳۰- بارہ اشعار کی یہ غزل 'گل رعنا' کے انتخاب میں شامل نہیں کی گئی۔ البتہ 'کلیاتِ فارسی' میں شامل ہے۔ کلکتے میں غالبؔ کا جو ادبی معرکہ ہوا تھا، اُس میں اس غزل کے ایک شعر پر بھی اعتراض کیے گئے تھے۔ ان اعتراضات کی تفصیل اس کتاب میں 'ادبی معرکے' کے عنوان کے تحت بیان کی جا چکی ہے۔

۳۱- یہ کہنا مشکل ہے کہ غالبؔ نے یہی شعر کہا تھا یا یہ پوری غزل تھی۔

'گل رعنا' اور 'کلیاتِ فارسی' میں یہ غزل نہیں ہے۔

۳۲- اس غزل کے آخر میں غالبؔ نے تین شعر کا یہ قطعہ کہا تھا جو نسخۂ شیرانی کے حاشیے پر درج ہے:

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا، غالب
ہوسِ سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو
طاقتِ رنجِ سفر ہی نہیں پاتے اتنی
ہجرِ یارانِ وطن کا بھی الم ہے ہم کو
لائی ہے معتمدالدولہ بہادر کی امید
جادۂ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

جب معتمدالدولہ سے غالبؔ کو مایوسی ہوئی تو اُنھوں نے مقطع کی صورت بدل کر اس طرح کر دی۔

لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع، غالبؔ
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

اور مقطع سے پہلے اس شعر کا اضافہ کر دیا۔

مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

۳۳- غالبؔ نے حاتم علی بیگ مہر کے نام اس قطعے کے بارے میں ایک خط میں لکھا ہے:

’’ایک میرا قطعہ ہے کہ وہ میں نے کلکتے میں کہا تھا۔تقریب یہ کہ مولوی کرم حسین صاحب ایک میرے دوست تھے۔اُنھوں نے ایک مجلس میں چکنی ڈلی بہت پاکیزہ اور بے ریشہ، اپنے کفِ دست پر رکھ کر مجھ سے کہا کہ اس کی کچھ تشبیہات نظم کیجیے۔ میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا قطعہ لکھ کر اُن کو دیا اور صلے میں وہ ڈلی اُن سے لی۔‘‘غالب کے خطوط : ۲:۱۴ے۔۱۵ے

۳۴- یہ غزل پہلی بار متفرقاتِ غالب، مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب میں نقل ہوئی ہے۔متفرقاتِ غالب،ص ص۱۳۴۔۱۳۵

غالب اور ہندوستانی فارسی شاعر اور فارسی فرہنگ نویس

۱- غالب کے خطوط:۲:۶۵۲

۱(الف)-متفرقاتِ غالب،ص۱۳۰

۲- غالب کے خطوط:۱:۲۳۶۔۲۳۷

۳- غالب کے خطوط:۲:۵۹۴

۴- غالب کے خطوط:۱:۳۳۷

۵- غالب کے خطوط:۳۳۳

۶- غالب کے خطوط:۲:۷۴۵

۷- غالب کے خطوط:۳:۱۰۱۸

۸- غالب کے خطوط:۱:۳۳۶

۹- غالب کے خطوط:۱:۲۹۶

۱۰- غالب کے خطوط:۳:۱۰۱۹

غالب کی بعض ہندوستانی فارسی دانوں کی مدح سرائی

۱- غالب کے خطوط:۱:۲۳۷

۲- غالب کے خطوط:۱:۳۲۷

۳- غالب کے خطوط:۳:ص۱۰۰۳

۴- اوراقِ معانی، مترجمہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی،ص ۱۶۹

۵-پنج آہنگ (۱۸۵۳ء) ص ۳۹۰
۶-پنج آہنگ، ص ۳۹۰
۷-اوراقِ معانی، ص ۱۶۵
۸-پنج آہنگ، ص ص ۴۰۳-۴۰۴
۹-غالب کے خطوط: ۴: ۱۴۴۵
۱۰-پنج آہنگ، ص ص ۳۸۹-۳۹۰
۱۱-مکاتیب غالب، ص ۵۷
۱۲-پنج آہنگ، ص ۳۸۸

غالبؔ اور قتیلؔ

۱-جہانِ غالب،، ص ۶۱
۲-فسانۂ غالب، ص ص ۱۲۲-۱۱۸
۳-غلام ہمدانی مصحفیؔ، عقدِ ثریا۔ مرتبہ مولوی عبدالحق، اورنگ آباد دکن، ۱۹۳۴ء، ص ۴۶
۴-نگار (مصحفی نمبر) جنوری ۱۹۳۹ء، بحوالہ فسانۂ غالب، ص: ۱۱۹
۵-فسانۂ غالب، ص ۱۱۹
۶-فسانۂ غالب، ص ۱۲۱
۷-دریائے لطافت، مترجمہ پنڈت دتاتریہ کیفی، ص۔ ۱۵۸
نیز ملاحظہ ہوں:
(i) سید ہاشمی فریدآبادی، قتیلؔ کا وطن، مشمولہ اردو، جنوری ۱۹۴۵ء
(ii) نقوش، لاہور (ادب عالیہ نمبر) اپریل ۱۹۶۰ء، ص ص ۶۹-۷۰
(iii) سید اسد علی انوری، قتیلؔ کا وطن، مشمولہ ماہنامہ نگار، لکھنؤ، مئی ۱۹۴۲ء
۸-عقدِ ثریا، ص ۴۶
۹-عقدِ ثریا، ص ۴۶
۱۰-تذکرہ خوش معرکہ زیبا، جلد اوّل، ص ۲۹۷
۱۱-تذکرہ خوش معرکۂ زیبا، ص ۵۱۶
۱۲-قتیلؔ کا یہ شعر اردو کے کئی تذکروں میں نقل ہوا ہے۔

۱۳- تذکرہ خوش معرکۂ زیبا، ص ۲۹۸
۱۴- تذکرہ خوش معرکۂ زیبا، ص ۳۰۰
۱۵- تذکرہ خوش معرکۂ زیبا، ص ۳۰۷
۱۶- تذکرہ خوش معرکۂ زیبا، ص ۳۰۲
۱۷- گلشن بے خار، ص ۲۷۰
۱۸- تذکرہ خوش معرکۂ زیبا، ص ۳۲۶
۱۹- تذکرۂ ماہ و سال، ص ۳۰۶
۲۰- متفرقاتِ غالب، ص ۱۳۰
۲۱- تذکرۂ ماہ و سال، ص ۳۸۰
۲۲- غالب کے خطوط: ۱: ۳۲۷-۲۳۶
۲۳- غالب کے خطوط: ۲: ۵۹۲
۲۴- غالب کے خطوط: ۲: ۵۸۷
۲۵- غالب کے خطوط: ۲: ص ۵۸۷
۲۶- غالب کے خطوط: ۳: ۱۰۱۹
۲۷- غالب کے خطوط: ۳: ۱۰۱۹
۲۸- غالب کے خطوط: ۲: ۵۹۴
۲۹- غالب کے خطوط: ۴: ۱۴۹۷
۳۰- غالب کے خطوط: ۲: ۴۵۷
۳۱- غالب کے خطوط ۲: ۴۹۵
۳۲- غالب کے خطوط ۱: ۳۳۳
۳۳- غالب کے خطوط: ۲: ۶۵۲
۳۴- غالب کے خطوط: ۲: ۶۱۳-۶۱۴
۳۵، ۳۶- تیغِ تیز، مشمولہ قاطع برہان و رسائل متعلقہ، ص ص ۲۷۶-۲۷۷
۳۷- غالب کے خطوط: ۲: ۵۷۰
۳۸- غالب کے خطوط: ۲: ۵۸۷-۵۸۸
۳۹- مرزا قتیل، چار شربت، ص ۵۹، بحوالہ سید اسد علی انوری، قتیل اور غالب، دہلی ۱۹۳۹ء، ص

۴۰-غالب کے خطوط:۲: ۵۸۷

۴۱-غالب کے خطوط:۱: ۳۳۶

۴۲-قاطعِ برہان، ص ۱۳۷ بحوالہ جہانِ غالب، ص ۴۵

۴۳-بقولِ قاضی عبدالودود نہرالفصاحت کا ایک قلمی نسخہ ۱۲۲۸ھ کا لکھا ہوا کتب خانہ مشرقیہ (خدا بخش لائبریری) میں ہے، جس کا تعلق قتیلؔ کے ایک شاگرد مرزا محمد شفیع سے رہ چکا ہے۔ اس میں حواشی ہیں مگر 'کدہ' سے متعلق کوئی عبارت حاشیے میں نہیں۔

۴۴-جہانِ غالب: ص ۴۵

۴۵-جہانِ غالب، ص ص ۴۵۔۴۶

۴۶-حکیم ابوالعلا ناطق، قتیلؔ اور غالبؔ، مشمولہ، زمانے کی غالبیات، پٹنہ۱۹۹۴ء، ص ص ۱۳۹۔۱۴۰

۴۷-غالب کے خطوط:۴: ۱۴۲۸

۴۸-ثمرات البدائع: ص ۲۳۲

۴۹-غالب کے خطوط:۱: ۲۴۴

۵۰-غالب کے خطوط:۳: ۵۹۵

۵۱-سید اسد علی انوری فرید آبادی، قتیل اور غالب، دہلی ۱۹۳۹ء، ص ص ۸۵۔۸۶

۵۲-غالب کے خطوط:۴: ۱۴۱۶۔۱۴۱۷

۵۳-غالب کے خطوط:۴: ۱۴۱۶۔۱۴۱۷

۵۴-جہانِ غالب، ص ۴۶

۵۵-جہانِ غالب، ص ۴۶

غالبؔ اور بیدلؔ

۱-تذکرہ مسرت افزا، مترجمہ ڈاکٹر مجیب قریشی، دہلی، ۱۹۶۸ء، ص ۵۳

۲-شمع انجمن، بھوپال، ص ۸۲

۳-خزانۂ عامرہ، ص ۸۲

۴-بیدلؔ، شاعرِ زمانہ ہا، ص ۲

۵-عقدِ ثریا، ص ۱۶
۶-تذکرہ نصر آبادی، ص ۴۵
۷-کلمات الشعرا، ص ۸۱
۸-سفینہ خوشگو، ص ۱۰۴
۹-علی ابراہیم خاں، گلزارِ ابراہیم مرتبہ علامہ شبلی، لاہور، ۱۹۰۶ء ص
۱۰-ریاض العارفین، مطبعِ زہرہ، ۱۳۴۴-۱۹۲۶ء میلادی، بحوالہ بیدلؔ شاعرِ زمانہ ہا، ص ۴
۱۱-سخن شعرا، ص ۳۱
۱۲-مجموعہ نغز، لاہور، ص ۱۱۵
۱۳-شامِ غریباں، ص ص ۵۲-۵۳
۱۴-تذکرہ گلزارِ ابراہیم، ص ۶۴
۱۵-عقدِ ثریا، ص ۱۶
۱۶-دکتور اسد اللہ حبیب، بیدل، شاعرِ زمانہ ہا، کابل، ۱۳۶۳ھ، ص ۲
۱۷-شاعرِ زمانہ
۱۸-شامِ غریباں، لچھمی نرائن شفیق، ص ص ۵۲-۵۳
۱۹-شامِ غریباں، ص ص ۵۲-۵۳
۲۰-بیدل۔ شاعرِ زمانہ ہا۔ ص ص ۲-۱۲
۲۱-علی ابراہیم خاں، گلزارِ ابراہیم، ص ۶۳-۶۴
۲۲-گلزارِ ابراہیم، ص ۶۳
۲۳-عمدۂ منتخبہ یعنی تذکرۂ سرور، ص ۱۲۱
۲۴-تذکرہ ماہ و سال، ص ۹۰
۲۵-مجمع النفائس، ص ۲۶
۲۶-تذکرہ شعراے اردو،
۲۷-غالب کے خطوط: ۲: ۸۴۵-۸۴۶
۲۸-غالب کے خطوط: ۲: ۵۹۴
۲۹-غالب، نسخہ عرشی زادہ، مرتبہ اکبر علی خاں، رام پور، ص ۱۵
۳۰-عبدالمغنی، فیضِ بیدل، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص ص ۸۳-۸۶

۳۱-نامہ ہائے فارسی غالب، ص ۴۰
۳۲-باغِ دودر، مرتبہ و مترجمہ وزیر الحسن عابدی، لاہور، ۱۹۶۱ء، اردو ترجمہ۔ ص ۷۲
۳۳-غالب کے خطوط: ۳: ص ص ۹۸۲۔۹۸۳
۳۴-غالب کے خطوط: ۲: ۶۲۶۔۶۲۷
۳۵-غالب کے خطوط: ۱: ۳۰۶
۳۶-غالب کے خطوط: ۲: ۶۱۰
۳۷-غالب کے خطوط: ۳: ۱۰۰۲
۳۸-غالب بحیثیت محقق، ص ۴۵
۳۸ (الف) قاضی عبدالودود، غالب بحیثیتِ محقق، پٹنہ، ۱۹۹۵ء، ص ۴۵
۳۹-فیضِ بیدل، ص ص ۱۰۔۱۱
۴۰-غالب کے خطوط: ۲: ۵۹۴
۴۱-غالب کے خطوط: ۱: ۳۳۷
۴۲-غالب کے خطوط: ۲: ۶۱۳۔۶۱۴
۴۳-اس کتاب کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: محمد ایوب قادری، غالب اور عصرِ غالب، کراچی، ۱۹۸۲ء
۴۴-دس صفحے کا یہ کتابچہ عبدالقوی دسنوی صاحب کی ملکیت ہے۔

مولوی غیاث الدین عزّت

۱-امیر مینائی، انتخابِ یادگار، رام پور، ۱۲۹۷ھ، ص ۲۷۷
۲-احمد علی شوق، تذکرہ کاملانِ رام پور (ری پرنٹ)، ۱۹۸۶ء، ص ص ۳۰۵۔۳۰۶
۳-مولوی غیاث الدین عزّت، غیاث اللغات و منتخب اللغات، لکھنؤ، ۱۹۴۰ء، ص ۲
۴-تذکرہ کاملانِ رام پور، ص ص ۳۰۵۔۳۰۶
۵-غالب، مکاتیبِ غالب، مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی، رام پور، ۱۹۳۷ء، ص ۲ ص ۴۸
۶-انتخابِ یادگار، ص ۲۲۶
۷-تذکرۂ کاملانِ رام پور، ص ۳۰۶
۸-اردوئے معلیٰ، حصّہ ۲، ص ۵۷۵
۹-بزمِ غالب، ص ۳۷۰

۱۰- غالب اور ہم عصر غالب، ص ص ۴۸-۷۵
۱۱-غیاث اللغات، کان پور، ۱۸۷۳ء، ص ۳
۱۲-تذکرۂ کاملانِ رام پور، ص ۷۳
۱۳- کچھ غالب کے بارے میں، حصہ اوّل، ص ص ۱۳-۱۴
۱۴-غیاث اللغات، مرتبہ منصور ثروت، ایران، ص ۳
۱۵-غیاث اللغات، ص ۴
۱۶-غیاث اللغات، ص ص ۳-۴
۱۷- کچھ غالب کے بارے میں، ص ۱۶
۱۸- غالب کے خطوط: ۳: ۹۷۹-۹۸۰
۱۹- غالب کے خطوط: ۲: ۴۵۷
۲۰- تیغِ تیز، مشمولہ افاداتِ غالب، مرتبہ سید وزیر الحسن عابدی، لاہور، ص ۲۹
۲۱- غالب کے خطوط: ۱: ۲۹۶-۲۹۷
۲۲- غالب کے خطوط: ۲: ۵۹۲
۲۳- غالب کے خطوط: ۲: ۵۹۲
۲۴- غالب کے خطوط: ۳: ۱۰۱۹
۲۵- غالب کے خطوط: ۴: ۱۴۹۷
۲۶- غالب کے خطوط: ۱: ۳۳۳
۲۷- غالب، تیغِ تیز، مشمولہ قاطع برہان، ملقب بہ درفشِ کاویانی و رسائل متعلقہ مرتبہ قاضی عبدالودود، پٹنہ، ۱۹۶۷ء، ص ص ۲۷۶-۲۷۷
۲۸- غالب اور غیاث اللغات، مشمولہ غالب اور عصرِ غالب،

غالبؔ اور عبدالواسع ہانسوی

۱- نوادر الالفاظ، ص ۴
۲- نوادر الالفاظ، ص ۱۱
۳- نوادر الالفاظ، ص ۴
۴- رسالہ عبدالواسع ہانسوی، ص ۴۰

۵- غالب کے خطوط: ۳: ۱۰۱۸

۶- غالب کے خطوط: ۱: ۳۳۶

۷- غالب کے خطوط: ۲: ۶۴۷ - ۶۴۸

غالبؔ: در مدح خود

۱- قاضی عبدالودود، مجموعہ دہلی اور غالب''، مشمولہ سہ ماہی اردو (غالب نمبر) کراچی، ۱۹۶۹ء، ص ۱۳۷

۲- پنج آہنگ، ص ص ۳۴۶ - ۳۴۷۔ اس خط کی عبارت دوسرے ابواب میں بھی نقل کی گئی ہے۔

۳- غالبؔ کے خطوط: ۴: ۱۴۷۶ - ۱۴۷۷

۴- غالبؔ بہ حیثیت محقق، ص ۵

۵- غالبؔ کے خطوط: ۴: ۱۴۷۷

۶- فارسی سے اردو میں ترجمہ قاضی عبدالودود نے کیا ہے۔

۷- مرزا تفتہ کے نام، غالب کے خطوط: ۱: ۲۹۷ - ۲۰ ستمبر ۱۸۵۸ء

۸- غالب کے خطوط: ۴: ۱۴۷۷

۹- پنج آہنگ، ص ۴۲۹

۱۰- غالب کے خطوط: ۴: ۱۴۲۱

۱۱- غالب کے خطوط: ۱: ۳۳۵: ۴: ۱۴۲۱

۱۲- غالب کے خطوط: ۴: ۱۴۴۷

۱۳- غالب کے خطوط: ۴: ۱۴۵۱

۱۴- لطائفِ غیبی، مشمولہ افاداتِ غالب، مرتبہ سید وزیرالحسن عابدی، ص ۲

۱۵- غالب بحیثیتِ محقق، ص ص ۲۷۷ - ۲۲۸

۱۶- خلیق انجم، غالبؔ اور شاہانِ تیموریہ، دہلی، ۱۹۷۴ء، ص ص ۱۵ - ۲۲

۱۷- غالبؔ کے خطوط: ۳: ۱۰۹۸

۱۸- غالب کے خطوط: ۳: ۱۱۱۳ - اگست ستمبر ۱۸۵۲ء

۱۹- مکاتیب غالب، اسداللہ غالب، مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی، رام پور، ۱۹۴۹ء، ص ۶۱

۲۰- غالب کے خطوط: ۳: ۱۲۳۵

تعلیقات

بیشتر برٹش افسروں کے حالات سی۔ ای۔ بگ
لینڈ کی کتاب Dictionary of Indian
Bibliography سے لیے گئے ہیں۔ اس کتاب
کا پہلا اڈیشن ۱۹۰۶ء میں لندن میں اور دوسرا
۱۹۷۱ء میں وارانسی سے شائع ہوا تھا۔ میں نے
دوسرے اڈیشن سے استفادہ کیا ہے۔

AMHERST OF ARAKAN, WILLIAM PITT, FIRST EARL (1773-1857)

جنوری ۱۷۷۳ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۱۶ء میں سفارت کے لیے چین بھیجے گئے۔ یکم اگست ۱۸۲۳ء کو گورنر جنرل کی حیثیت سے کلکتے پہنچے۔ فروری ۱۸۲۴ء میں برمیوں نے بنگال کے قریب کے علاقوں پر قبضہ کرکے برطانوی علاقے پر حملہ کردیا۔ ایمہرسٹ نے اعلان جنگ کردیا اور برما پر فوج کشی کردی۔ فوج نے رنگون، مرتابان اور پروم پر قبضہ کرلیا۔ ۱۸۲۶ء میں Yandaboo کی صلح ہوئی، جس کے مطابق آسام اور Tenasserim کے علاقے برٹش گورنمنٹ کو دے دیے گئے۔ جنوری ۱۸۲۶ء میں لارڈ کومبرمیئر Combermere نے ہندوستان میں بھرت پور پر قبضہ کرلیا اور کم سن راجا بلونت سنگھ کو حکومت سونپ دی۔ دُرجن سال، بلونت سنگھ کا چچازاد بھائی تھا۔ اس نے ریاست پر قبضہ کرلیا تھا۔ برطانوی فوج نے بلونت سنگھ کو ریاست واپس دلائی۔

لارڈ ایمہرسٹ کو ارل بنادیا گیا۔ ایمہرسٹ پہلے گورنر جنرل تھے جنھوں نے شملے میں گرمیوں کا موسم گزارا۔

۱۰/مارچ ۱۸۲۸ء کو وہ دہلی سے چلے گئے۔ ۱۳/مارچ ۱۸۵۷ء کو اُن کا انتقال ہوگیا۔

ملاحظہ ہو:

D.I.B. P12

AUCKLAND GEORGE EDEN

گورنر جنرل تھے۔ یہ لارڈ آکلینڈ کے دوسرے بیٹے تھے۔ ۲۵/اگست ۱۷۸۴ء کو پیدا ہوئے۔ آکسفورڈ کے کرائسٹ چرچ میں تعلیم پائی۔ ۱۸۰۹ء میں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ ۴/اپریل ۱۸۳۶ء کو ہندوستان کے گورنر جنرل بنائے گئے۔ ۳۷-۱۸۳۶ء میں کابل پر روس کا اثر بہت بڑھنے لگا تو کابل کے امیر دوست محمد نے روس کے ایک افسر (Vitkievitch) وتکے وچ کا استقبال کیا تو برطانوی حکومت کے دباؤ پر روس کے اثر کو ختم کرنے کے لیے ایمہرسٹ نے دوست محمد کو تخت و تاج سے محروم کرکے امیر کی حیثیت سے شاہ شجاع کو تخت نشیں کردیا۔

ایمہرسٹ نے افغانستان سے جنگ کا اعلان کردیا۔ اگست ۱۸۳۹ء میں دوست محمد افغانستان سے فرار ہوگئے۔ اگرچہ شاہ شجاع ۱۸۳۹ء میں تخت نشین ہوئے اور ۱۸۴۱ء تک تخت نشیں رہے۔افغانوں نے بغاوت کردی۔ سر۔اے برنز(Sir. A.Burns) کو۲رنومبر۱۸۴۱ء کو اور افغانستان میں برطانوی سفیر سرڈبلیومیکناگھٹنW.Macnaghten کو۲۳ردسمبر ۱۸۴۱ء کو قتل کردیا گیا۔

ملاحظہ ہو:

D.I.B. pp. 19-20

⁂⁂⁂

BAYLEY, WILLIAM BUTTERWORTH(1860-1782)

آئی سی ایس تھے۔ تھامس بٹرورتھ کے بیٹے تھے۔ایٹن اور کیمبرج میں تعلیم حاصل کی۔۱۷۹۹ء میں ہندوستان آئے۔۱۸۰۳ء میں گورنر جرنل کے دفتر میں ملازم ہوئے۔۱۸۰۷ء میں صدر کورٹ کے رجسٹرار رہے۔ بردوان اور دوسرے مقامات پر جج کی حیثیت سے کام کیا۔۱۸۱۴ء میں محکمۂ عدالت و محاصل میں سکریٹری رہے۔۱۸۱۹ء میں حکومت کے چیف سکریٹری بنے جولائی ۱۸۲۲ء سے دسمبر ۱۸۲۲ء تک سپریم کونسل کے عارضی رُکن رہے اور پھر ۱۸۲۵ء سے ۱۸۳۰ء تک مستقل ممبر رہے۔ مارچ سے جولائی ۱۸۲۸ء کے درمیان عارضی گورنرجنرل بھی رہے۔۱۸۳۰ء میں بورڈ آف ٹریڈ کے وائس پریزیڈنٹ بنے اور پھر گورنر بنگال ہوگئے۔ ۱۸۳۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹر اور ۱۸۴۰ء میں کورٹ کے ڈائرکٹر رہے۔ ۱۸۵۸ء میں ریٹائر ہوگئے۔۲۹رمئی ۱۸۶۰ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔

ملاحظہ ہو:

D.I.B. p.31

⁂⁂⁂

BENTINCK , LORD WILLIAM CAVEN DISH(1774-1

گورنر جنرل تھے۔ پورٹ لینڈ کے تیسرے ڈیوک کے لڑکے تھے۔۱۴رستمبر۱۷۷۴ء کو ولادت ہوئی۔۱۷۹۱ء میں فوج میں بھرتی ہوئے۔نیدر لینڈ،اٹلی،آسٹرین فوج میں کام کیا۔ اگست ۱۸۰۳ء سے ستمبر ۱۸۰۷ء تک مدراس کے گورنر رہے۔ویلور میں سپاہیوں نے اپنے افسروں کے خلاف بغاوت کردی۔بینٹک کو اس بغاوت کا ذمہ دار قرار دیا گیا اور انھیں گورنر کے عہدے سے برطرف کردیا گیا۔اس کے بعد وہ پرتگال اور کرونا(Corunna) میں ایک بریگیڈ کے کمانڈر بنادیے گئے۔ پھر سسلی میں لفٹنٹ جرنل کی حیثیت سے کمانڈران چیف کے عہدے پر فائز ہوگئے۔۱۸۱۱ء میں سپین چلے گئے۔ ۱۸۲۸ء میں بنگال کے گورنر اور مئی ۱۸۳۳ء سے کمانڈران چیف رہے۔۱۸۳۴ء سے ۱۸۳۵ء تک ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل رہے۔ ۱۷رجون ۱۸۳۹ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔

ملاحظہ ہو:

D.I.B. p.36

❋❋❋❋❋❋❋❋❋

COLVIN, JOHN RUSSELL(1807-1857)

لفٹنٹ گورنر تھے۔ کلکتے کے ایک تاجر جمیز کالون کے صاحب زادے تھے۔۲۹رمئی ۱۸۰۷ء کو کلکتے میں پیدا ہوئے۔ہیلی بری میں سینٹ اینڈریوز میں تعلیم پائی۔۱۸۲۶ء میں بنگال پہنچے۔۱۸۲۷ء میں حیدرآباد گئے۔حکومت ہند کے محکمۂ عدالت و محاصل میں ۱۸۳۱ء سے ۱۸۳۵ء کے دوران ڈپٹی سکریٹری رہے۔۱۸۳۶ء سے ۱۸۴۲ء تک گورنر جنرل لارڈ آکلینڈ کے پرائیویٹ سکریٹری کی حیثیت سے کام کیا۔۱۸۴۵ء میں نیپال کے ریذیڈنٹ بنے ۱۸۴۶ء میں Tenasserim میں کمشنر کے عہدے پر فائز رہے، صدر کورٹ کے جج رہے۔۷رنومبر ۱۸۵۳ء سے N.W.P کے لفٹنٹ گورنر ۹رستمبر ۱۸۵۷ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔

ملاحظہ ہو:

D.N.B. p.90

EDMONSTONE, NEIL BENJAMIN(1765-1841)

آئی سی ایس تھے۔ ۶/دسمبر ۱۷۶۵ء کو پیدا ہوئے۔ سر آرچیبالڈ اڈمنسٹن کے لڑکے تھے۔۱۷۸۳ء میں سول سروس میں ملازمت کے لیے کلکتے پہنچے جہاں حکومت کے فارسی مترجم کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔۱۰/اپریل ۱۷۹۸ء میں قائم مقام گورنر جنرل سر ایلورڈ کلارک(Sir Alured Clarke) کے پرائیویٹ سکریٹری مقرر ہوئے۔فروری ۱۸۰۷ء میں جی ایچ بارلو کے پرائیویٹ سکریٹری بنے۔فروری ۱۸۰۷ء میں ٹیپوسلطان کے خلاف مہم میں لارڈ ویلزلے کے ساتھ مدراس میں تھے۔۱۸۰۱ء میں محکمہ خارجہ میں سکریٹری تھے۔ ۱۸۰۹ء میں حکومت ہند کے چیف سکریٹری بنے،۳۰/اکتوبر ۱۸۱۲ء کو سپریم کونسل کے رُکن بنے۔۱۸۲۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔۴/مئی ۱۸۴۱ء کو انتقال ہو گیا۔

ملاحظہ ہو:

D.I.B.p.132

※※※※※※※※※※※

ELLENBOROUGH, EDWARD LAW,FIRST EARL 1790-1871)

ہندوستان کے گورنر جنرل تھے۔اڈورڈ بیرن ایلن برو کے لڑکے تھے۔ ایٹن (ETON)اور کیمبرج میں تعلیم پائی۔۸/ستمبر ۱۷۹۰ء کو پیدا ہوئے۔۱۸۲۸ء میں لارڈ پریوی سیل بنے ۱۸۲۸ء سے ۱۸۳۰ء تک بورڈ آف کنٹرول کے پریذیڈنٹ رہے۔اکتوبر ۱۸۴۱ء میں ہندوستان کے گورنر جنرل مقرر ہوئے۔۱۵/جون ۱۸۴۴ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔

۲۲/دسمبر ۱۸۷۱ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

ملاحظہ ہو:

D.I.B. p.175

※※※※※※※※※※※

FRANCIS HAWKINS

دہلی کے ریذیڈنٹ کولبروک کو مالی بدعنوانیوں کے الزام میں برطرف کر کے ولیم فریزر کو اس عہدے پر مقرر کیا گیا۔ کچھ ہی دن بعد ستمبر ۱۸۲۹ء میں فرانسس ہاکنس کا اس عہدے پر تقرر ہوا جب ہاکنس ریذیڈنٹ بنا تو غالب نے اس کی مدح میں قصیدہ کہا۔

فرانسس ہاکنس کے نواب احمد بخش خاں سے بہت اچھی دوستی تھی اس لیے اس مقدمے میں وہ احمد بخش خاں کی حمایت کرر ہا تھا۔ غالب نے سراج الدین احمد کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ فرانسس ہاکنس نے نواب لوہارو سے 'پیمانِ یک دلی' باندھ رکھا ہے۔اس لیے مقدمے کی رپورٹ نواب کی مرضی کے مطابق صدر کو بھیجی گئی ہے۔فرانسس ہاکنس کے اس خاندان سے ایسے گہرے مراسم تھے کہ اس ہی کی وجہ سے اپنے بھائیوں نواب امین الدین احمد خاں اور نواب ضیاء الدین سے نواب شمس الدین خاں کو لوہارو کا علاقہ واپس ملا۔

ہاکنس ہی کی سفارش پر کلکتے میں غالب کے مطالبے کو مسترد کیا گیا۔ غالب کو جب اس کا علم ہوا تو انھیں ہاکنس سے نفرت ہوگئی۔ ہاکنس بڑا بد دماغ اور مغرور قسم کا شخص تھا۔ اس پر حکومت کا نشہ سوار تھا۔ مغل بادشاہت کی اس کی نظر میں کوئی وقعت نہیں تھی۔ اس سے پہلے جتنے بھی ریذیڈنٹ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے وہ کھڑے رہتے تھے۔ہاکنس پہلا ریذیڈنٹ تھا جس نے بیٹھنے کے لیے کرسی طلب کی۔یوسف حسین خاں نے 'غالب اور آہنگِ غالب' میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ہاکنس کسی مہمان کو دربارِ خاص دکھانے کے لیے لایا تو بادشاہ کی اجازت کے بغیر گھوڑا اندر تک لے گیا۔ بادشاہ نے حکومت میں اس کی شکایت کی۔ جب حکومت کو ہاکنس کے گستاخانہ رویے کا پتا چلا تو اسے واپس بلالیا گیا۔

حکومت نے دہلی کے ریذیڈنٹ سے غالب کے مقدمے کی رپورٹ مانگی تھی۔ چوں کہ ہاکنس دہلی کا ریذیڈنٹ تھا اور وہ نواب لوہارو کے حق میں تھا اس لیے اس نے غالب کے خلاف رپورٹ بھیجی۔ اس رپورٹ کے پہنچنے پر کلکتے کے اعلا افسران نے ہاکنس سے غالب کے مقدمے کی پوری کیفیت اور ۷رجون ۱۸۰۶ء کی متنازعہ دستاویز طلب کرلی۔ ہاکنس کے غالب کے مخالفانہ رویے نے غالب کو بہت نقصان پہنچایا۔ ہاکنس نے اپنی رپورٹ میں یہاں تک لکھا کہ ''گورنمنٹ اس (اسد اللہ خاں) کے جھوٹے دعوے پر یقین نہ کرے۔اس نے اپنی کاروائی سے گورنمنٹ کو سخت زحمت میں مبتلا کردیا ہے اور نواب شمس الدین کی توہین کی ہے۔ اس لیے

یہ ضروری ہے کہ اس شخص کو قرار واقعی سزادی جائے۔'' جب ہاکنس ریٹائر ہوگیا تو غالب نے اس کی ہجو میں ایک قطعہ کیا جو فارسی کلیات میں موجود ہے۔

ملاحظہ ہوں:

پنج آہنگ، ص ص ۲۸۸۔۲۸۹۔۔نامہ ہائے فارسی غالب،مترجمہ پرتوِ روہیلہ، ص ص ۲۱۸۔۲۱۹، بزمِ غالب، ص ص ۳۰۴۔۳۰۶۔۔۔ذکرِ غالب،آج کل، فروری ۱۹۵۶ء۔ غالب اور آہنگِ غالب، ص ص ۱۶، ۱۷اور ص ص ۶۵۔۶۶

GEORGE MAXWELL BATTEN

۱۸۲۷ء میں ہندوستان آئے۔اسی سال پہلی فروری کو الہ آباد کے مجسٹریٹ اور کلکٹر کے اسسٹنٹ مقرر ہوئے۔۱۸رفروری ۱۸۲۷ء کو پرشین سکریٹری کا اسسٹنٹ بنادیا گیا۔ اسی حیثیت سے ۱۸رنومبر ۱۸۲۹ء تک کام کرتے رہے۔۲۱رجولائی ۱۹۳۴ء کو کلکتے میں انتقال ہوا۔

ملاحظہ ہو:

نامہ ہائے فارسی غالب، مترجمہ پرتو روہیلہ، ص ۲۱۳

GEORGE SWINTON

جارج سوئنٹن ۱۴رجولائی ۱۸۰۲ء کو ہندوستان آئے۔۱۸۰۵ء میں پرشین سکریٹری کے دفتر میں بحیثیت سکریٹری ملازم ہوئے۔ نو سال بعد گورنر جنرل کے پرشین سکریٹری مقرر ہوئے۔۷ردسمبر ۱۸۲۷ء کو حکومت کے چیف سکریٹری مقرر ہوئے۔وفات یکم مئی ۱۸۳۳ء تک اسی عہدے پر فائز رہے۔

ملاحظہ ہو:

نامہ ہائے فارسی غالب، مترجمہ پرتو روہیلہ، ص ۲۱۶

GUBBINS,MARTIN RICHARD(1812-1863)

آئی سی ایس تھے۔ہیلی بری میں تعلیم پائی۔۱۸۳۰ء میں ہندوستان آئے۔جب ۱۸۵۶ء میں برطانوی حکومت نے اودھ پر قبضہ کیا تو یہ اودھ میں ملازم تھے۔اُنھوں نے برطانوی حکومت کی طرف سے لکھنؤ میں ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب میں حصّہ لیا۔انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کے انچارج ہوگئے۔غدر کے دوران اُنھوں نے بہت سے مشورے دیے تھے۔حکومت نے کچھ مشورے قبول کرلیے اور کچھ رَد کردیے۔غدر کے بعد وہ کانپور میں سرکولین کیمپبل کے ساتھ ہوگئے۔خرابی صحت کی وجہ سے انگلینڈ چلے گئے۔۶/مئی ۱۸۶۳ء کو انتقال ہوگیا۔

ملاحظہ ہو:

D.I.B.p.182

HAMILTON,SIR ROBERT NORTH COLLIE BARONE (1802-1887)

سر فریڈرک ہیملٹن کے لڑکے تھے۔۷/اپریل ۱۸۰۲ء کو پیدا ہوئے۔ہیلی بری میں تعلیم پائی۔۱۸۱۹ء میں ہندوستان آئے۔مختلف عہدوں پر کام کرکے ہالکر کے ساتھ اندور کے ریذیڈنٹ مقرر ہوئے۔۱۸۵۴ء میں وسطی ہندوستان کے لیے گورنر جنرل کے ایجنٹ مقرر ہوئے۔۱۸۵۹ء میں سپریم کونسل کے رُکن منتخب ہوئے۔اسی سال ریٹائر ہوئے۔۳۰/مئی ۱۸۸۷ء کو انتقال ہوا۔

ملاحظہ ہو:

D.I.B.p.187

HARDINGE, HENRY,FIRST VISCOUNT, OF LAHORE(1785-1856)

گورنر جنرل اور فیلڈ مارشل تھے۔۳۰/مارچ ۱۷۸۵ء کو پیدا ہوئے۔ہینری ہارڈنگ کے

صاحب زادے تھے۔ ۱۷۹۹ء میں فوج میں بھرتی ہوئے۔ مختلف لڑائیوں میں حصہ لیا۔ کئی بار زخمی ہوئے۔ جنگ میں ایک ہاتھ جاتا رہا تھا۔ فرانس میں کمشنر رہے۔ ۱۸۴۱ء میں ہندوستان میں لفٹنٹ جرنل بنے جولائی ۱۸۴۴ء سے جنوری ۱۸۴۸ء تک گورنر جرنل رہے۔

۲۴ر ستمبر ۱۸۵۶ء کو انتقال ہوا۔

D.I.B.p.189

LAKE, LORD, GERARD (1744-1808)

لارڈ گیرڈ لیک لانسلوٹ چارلس لیک کے بڑے صاحب زادے تھے۔ ۲۷ر جولائی ۱۷۴۴ء کو پیدا ہوئے۔

۱۷۵۸ء میں فرسٹ فٹ گارڈ میں ملازم ہوئے اور ۱۸۰۲ء میں جنرل کے عہدے تک پہنچ گئے۔ ۹۴-۱۷۹۳ء میں فرانس سے جنگ میں شامل ہوئے۔ ULSTER اور آئرلینڈ میں رہے۔ ۱۸۰۱ء سے ۱۸۰۵ء تک ہندوستان میں کمانڈر ان چیف رہے۔

۴ر ستمبر ۱۸۰۳ء کو دہلی پر حملہ کر کے مرہٹوں پر فتح حاصل کی۔

مرہٹوں سے جنگ کر کے دہلی پر قبضہ کرنے پر شاہ عالم نے انھیں صمصام الدولہ، اشجع ملک خان دوراں، خاں بہادر فتح جنگ کے خطاب سے نوازا۔

(غالبؔ، مکاتیب غالب، مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی، رام پور، ۱۹۴۹ء، ص ۱۲۳)

۱۸۰۲ء میں ساسنی۔ بجگھر، کٹ چورا پر فتح حاصل کی اور ۱۸۰۳ء میں دو مہینے تک علی گڑھ میں مرہٹوں سے جنگ میں مصروف رہے۔ ۴ر ستمبر ۱۸۰۳ء کو مرہٹوں کو دہلی میں شکست دی۔ جنرل پیرون کے تحت آگرے میں سندھیا کی فوج کو ہرایا۔ فرخ آباد میں ہالکر کو شکست دی۔ دسمبر ۱۸۰۴ء میں ڈیگ پر قبضہ کیا۔ اوائل ۱۸۰۵ء میں بھرت پور پر چار بار حملہ کیا مگر ناکام رہے۔ مسلسل حملوں سے تنگ آ کر راجا صلح کرنے پر مجبور ہوگیا۔ لیک انگلینڈ واپس چلے گئے اور ۲۰ر فروری ۱۸۰۸ء کو وہیں اُن کا انتقال ہوگیا۔

ملاحظہ ہو:

مکاتیب غالب، ص ۶ اور ص ۱۲۳، تاریخ ہندوستان، D.I.B. p.242۔ غالب کے خطوط:
۴:۸۰ ۱۷۔ ۱۷۰۹ء۔ غالب کی خاندانی پنشن، ص ۲۸۰؟

※※※※※※※※※※

LUSHINGTON CHALES (1785-1866)

آئی سی ایس تھے۔ سٹیفن لشنگٹن کے لڑکے تھے۔ ۱۷۸۵ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۰۱ء میں ہندوستان آئے۔ ۱۸۰۴ء میں گورنر جنرل کے دفتر میں اسسٹنٹ تھے۔ ۱۸۰۹ء میں خفیہ سیاسی خارجی شعبے میں سکریٹری بنے۔ ۱۸۲۳ء میں گورنر جنرل جان ایڈم (Aadam) کے پرائیویٹ سکریٹری تھے۔ ۱۸۲۵ء میں حکومت کے چیف سکریٹری مقرر ہوئے۔ اس کے بعد مختلف عہدوں پر کام کیا۔ ۱۸۲۷ء میں ریٹائر ہوئے۔ ۲۳ ستمبر ۱۸۶۶ء کو انتقال ہوا۔

ملاحظہ ہو:

D.I.B. p 256

※※※※※※※※※※

MALCOLM SIR JHON(1769-1833)

جارج مالکم کے لڑکے تھے۔ ۲ مئی ۱۷۶۹ء کو ولادت ہوئی۔ ویسٹر کرک میں تعلیم پائی۔ ۱۷۸۲ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجی ملازمت اختیار کی۔ ۱۷۸۳ء میں مدراس پہنچے۔ سرنگا پٹنم پر قبضے کے وقت کارنوالس کے ساتھ فارسی ترجمان کی حیثیت سے تھے۔ سرالیلورڈ کلارک کے سکریٹری رہے جو ۹۷۔ ۱۷۹۵ء کے دوران مدراس میں کمانڈر ان چیف تھے۔ ۱۷۹۸ء میں حیدرآباد میں نائب ریذیڈنٹ بنے۔ لارڈ ویلزلے نے انھیں Envoy of Persia منتخب کیا۔ اعلا عہدوں پر فائز رہے۔

۲۰ جولائی ۱۸۳۳ء کو انتقال ہوا۔

ملاحظہ ہو:

D.I.B.p.271

MANSEL, CHARLES, GRENVILLE(1806-1886)

آئی سی ایس تھے۔ ۱۸۰۶ء میں ولادت ہوئی۔ ۱۸۲۶ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم ہوئے۔ آگرے میں مختلف عہدوں پر کام کیا۔ ۱۸۳۵ء میں مجسٹریٹ کلکٹر تھے۔ ۴۱۔۱۸۳۸ء کے دوران Settlement Officer تھے۔ ۱۸۵۰ء۔ ۱۸۴۹ء کے دوران پنجاب میں بورڈ آف اڈمنسٹریشن کے رکن بنے۔ ۵۴۔۱۸۵۲ء کے دوران ناگپور کے ریذیڈنٹ رہے۔

۱۹ر نومبر ۱۸۸۶ء کو انتقال ہوا۔

D.I.B.p.274

XXXXXXXXXX

MEDDOCK, SIR THOMAS HERBERT (1790-1870)

یہ آئی سی ایس تھے۔ والد کا نام تھامس میڈرک تھا۔ ۱۷۹۰ء میں پیدا ہوئے۔ مانچسٹر کے فری گرامر اسکول اور ہیلی بری میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۳۔۱۸۱۲ء کے دوران ہندوستان آئے۔ ۱۸۱۴ء میں ساگر اور نربدا کے علاقوں میں ملازمت کی۔ ۳۱۔۱۸۲۹ء کے دوران بھوپال میں پالیٹکل ایجنٹ اور پھر لکھنؤ میں پالیٹکل ریذیڈنٹ کے عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۸۳۱ء میں نیپال میں پالیٹکل افسر بنے ۴۳۔۱۸۳۴ء تک قانونی، عدالتی اور محاصل کے شعبے میں گورنمنٹ کے سکریٹری رہے۔ ۴۹۔۱۸۴۳ء کے دوران سپریم کونسل کے ممبر رہے۔ ۱۸۴۵ء اور پھر ۱۸۴۸ء میں بنگال کے ڈپٹی گورنر بنے۔ ۱۸۴۹ء میں ریٹائر ہوئے۔ غالب نے ان کی مدح میں فارسی میں پچاس اشعار کا ایک قصیدہ کہا تھا جو 'کلیاتِ فارسی' میں شامل ہے۔ ۱۵ر جنوری ۱۸۷۰ء کو انتقال ہوا۔

ملاحظہ ہوں:

D.I.B.p.285

XXXXXXXXXX

MELVILL, SIR JAMES COSMO(1792-1861)

۱۷۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ کیپٹن فلپ مِل وِل کے بیٹے تھے۔ ۱۸۰۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہوم سروس میں تھے۔ ۱۸۲۴ء میں انڈین اکاؤنٹس کے آڈیٹر مقرر ہوئے۔ ۱۸۳۴ء میں فائنشل سکریٹری بنے۔ ۱۸۳۶ء سے ۱۸۵۸ء تک چیف سکریٹری رہے۔ ۱۸۵۸ء میں انڈین ریلویز کے ڈائرکٹر بنے۔ ۲۳ر جولائی ۱۸۶۱ء کو انتقال ہوگیا۔

ملاحظہ ہو:

D.I.B. p. 285

XXXXXXXXXXX

METCALFE, CHARLES THEOPHILUS, BARON

تھیوفلس بیرن مٹکاف (۱۸۴۶ـ۱۷۸۵ء) عارضی گورنر جنرل آئی۔ سی۔ ایس۔ ۱۷۸۵ء کو پیدا ہوئے۔ میجر تھامس تھیوفلس مٹکاف کے صاحب زادے تھے۔ برو ملے اور ایٹن مین تعلیم پائی۔ جنوری ۱۸۰۱ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی میں محرر کی حیثیت سے ملازم ہوئے۔ ۱۸۰۳ء میں گورنر جنرل کے دفتر میں دولت راؤ سندھیا کی کورٹ میں ملازم ہوئے ۱۸۰۴ء میں مرہٹوں کے ساتھ جنگ کے موقع پر لارڈ لیک کے پالیٹکل افسر تھے۔ ۱۸۰۶ء میں دہلی کے ریذیڈنٹ کے اسٹنٹ ہوئے۔ ۱۸۰۸ء میں لاہور میں رنجیت سنگھ کے پاس خاص مشن پر رہے۔

۱۸۱۰ـ۱۸۰۹ء کے دوران لارڈ منٹو کے ڈپٹی سکریٹری کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۸۱۱ء سے ۱۸۱۹ء تک گوالیار اور دہلی کے ریذیڈنٹ رہے پھر دہلی میں ریذیڈنٹ ہوئے۔ ۲۰ـ۱۸۱۹ء کے دوران پالیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے خُفیہ سیکشن میں سکریٹری رہے۔ ۱۸۲۷ء میں سپریم کونسل ہوئے۔ ۱۸۳۴ء میں آگرے کے گورنر مقرر ہوئے۔ مارچ ۱۸۳۵ء میں قائم مقام گورنر جنرل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ جون ۱۸۳۶ء سے ۱۸۳۸ء تک صوبہ شمال مغرب میں لیفٹنٹ گورنر رہے، اس کے بعد مدراس کے گورنر ہوئے مگر اس عہدے سے بددل ہوکر مستعفی ہوگئے۔

۱۸۳۹ء سے ۱۸۴۲ء تک جمیکا کے گورنر اور ۱۸۴۳ء سے ۱۸۴۵ء تک کینیڈا کے گورنر جنرل رہے۔ کچھ ہی عرصے بعد کینسر کے مرض کے شکار ہوگئے اور ۵ر ستمبر ۱۸۴۶ء کو کلکتے میں انتقال

ہو گیا۔

ملاحظہ ہو:

D.I.B p.287

XXXXXXXXXXX

OCHTERLONY, SIR DAVID, BARONET(1758-1825)

آکٹرلونی ہندوستان میں اختر لونی کے نام سے مشہور تھے۔۱۲رفروری ۱۷۵۸ءکو پیدا ہوئے۔ والد کا نام ڈیوڈ لونی تھا۔آکٹرلونی ۱۷۷۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنگال آرمی میں ملازم ہوئے۔ کڈالور کے محاصرے کے وقت ۱۷۸۳ء میں گرفتار کرلیے گئے۔ ۱۷۸۴ء میں رہا ہوئے ۔لارڈلیک کے تحت دوآبے میں ۱۸۰۳ء میں ایک رجمنٹ کے کمانڈر بنے۔کول (علی گڑھ)، دہلی کے ڈپٹی ایڈجوٹنٹ جرنل کے عہدے پر فائز ہوئے۔۱۸۰۳ء میں ان کا دہلی کے ریذیڈنٹ کے عہدے پر تقرر رہا۔ جب ۱۸۰۴ء میں ہولکر نے دہلی پر حملہ کیا تو آکٹرلونی نے اس کا مقابلہ کیا۔ ۱۸۰۸ء میں ستلج میں رنجیت سنگھ کا مقابلہ کیا۔۱۸۱۴ء میں میجر جرنل بنے۔۱۵۔۱۸۱۴ء میں نیپال کی لڑائی میں حصہ لیا۔آکٹرلونی کی فوجی فتوحات بہت زیادہ ہیں۔ جب ۱۸۲۵ء میں بھرت پور کے چھ سالہ راجا بلونت سنگھ کے خلاف دُرجن لال نے بغاوت کی تو آکٹرلونی نے فوجی طاقت سے راجا کی مدد کی۔اس وقت کے گورنر جرنل ایمہر سٹ کو آکٹرلونی کا یہ اقدام پسند نہیں آیا۔آکٹرلونی نے استعفیٰ دے دیا۔انھیں ایمہر سٹ کے اس رویّے سے بہت صدمہ ہوا تھا۔۱۵رجولائی ۱۸۲۵ءکو اُن کا انتقال ہوگیا۔کلکتے میں اُن کی یاد میں ایک مینار موجود ہے۔

ملاحظہ ہو:

D.I.B. p 321

XXXXXXXXXXX

PERRON, PIERRE CUILLIER

پائرے کیولر پیرون فرانس نژاد تھے۔۱۷۸۰ء میں معمولی افسر کی حیثیت سے ہندوستان آئے اور جرنل کے عہدے تک پہنچے ۔۱۷۸۱ء میں ہندوستان میںRana of Gohud کی ملازمت کرلی۔اس کے بعد بھرت پور چلے گئے۔۱۷۹۰ء میں De Bigno کے ساتھ مادھو جی سندھیا کی فوج میں ملازم ہو گئے۔کسی لڑائی میں ایک ہاتھ جاتا رہا۔

ملازمت سے سبکدوشی کے بعد فرانس واپس چلے گئے، جہاں ۱۸۳۴ء میں اُن کا انتقال ہو گیا۔

ملاحظہ ہو:

D-I.B. p 334 ------ غالب کی خاندان پنشن، ۲۷۹

***

PRINSEP, HENRY THOBY(1792-1878)

جان پرنسیپ ایم۔پی کے صاحب زادے تھے۔آئی سی ایس تھے۔۱۵ر جولائی ۱۷۹۲ء کو ولادت ہوئی۔ ۱۸۰۹ء میں بنگال آئے۔ ۱۸۱۴ء میں گورنر جرنل مارکوئس آف ہیسٹنگز کے اسسٹنٹ سکریٹری مقرر ہوئے جن کے ساتھ اُنھوں نے اودھ، صوبہ شمال مغربی، نیپال پنڈاری کا دورہ کیا اور مرہٹوں سے لڑائی میں شریک ہوئے۔ ۱۸۲۰ء میں گورنمنٹ کے پرشین سکریٹری مقرر ہوئے۔ ۱۸۲۶ء میں ٹیریٹوریل ڈیپارٹمنٹ میں سکریٹری بنے۔۱۸۳۴ء میں چیف سکریٹری ہوئے۔ ۱۸۳۵ء میں سپریم کونسل کے عارضی رکن بنے اور پھر ۱۸۴۰ء سے ۱۸۴۳ء تک مستقل عہدے پر کام کیا۔۱۸۴۳ء میں ریٹائر ہوئے۔غالب نے اُن کی مدح میں فارسی میں ۳۹ اشعار کا قصیدہ کہاتھا جو'کلیات فارسی' میں موجود ہے۔ ۱۱رفروری ۱۸۷۸ء کو وفات پائی۔

ملاحظہ ہو:

D.I.B.p.344

***

ROSSALEXANDER

آئی۔سی۔ایس تھے۔۹۶۔۱۷۹۵ء کے دوران ہندوستان آئے۔ ۱۸۱۱ء میں بریلی میں پرووِنشل کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ ۱۸۲۰ء سے ۱۸۲۳ء تک دہلی کے ریذیڈنٹ رہے۔ ۱۸۲۵ء میں صدر عدالت میں جج بنے۔ جنوری ۱۸۳۳ء میں سپریم کونسل کے رُکن بنائے گئے۔ دسمبر ۱۸۳۵ء سے جون ۱۸۳۶ء تک آگرہ کے گورنر رہے۔ ۲۰/اکتوبر ۱۸۳۷ء سے ۱۵/اکتوبر ۱۸۳۸ء تک بنگال کے ڈپٹی گورنر رہے اور اسی عہدے سے ریٹائر ہوگئے۔

ملاحظہ ہو:

D.I..B.p363

※※※※※※※※※※

STIRLING ANDREW

اینڈریو سٹرلنگ آئی۔سی۔ایس، ۱۷۹۳ء کے آس پاس پیدا ہوئے۔ اڈمیرل اسٹرلنگ کے صاحب زادے تھے۔ ہیلی بری میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۱۳ء میں ہندوستان پہنچے۔ پالیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں گورنمنٹ کے معتمدِ فارسی اور ڈپٹی سکریٹری تھے۔ ۱۸۲۸ء میں جب W.B. Bayley قائم مقام گورنر جنرل تھے تو یہ اُن کے پرائیویٹ سکریٹری رہے۔ اڑیسہ پر ان کی کتاب اعلیٰ درجے کی سمجھی جاتی ہے۔ یہ غالب کی بہت سرپرستی کرتے تھے اور غالب کو اپنے مقدمے کے سلسلے میں ان سے بہت امیدیں تھیں۔ ۲۳/مئی ۱۸۳۰ء کو کلکتے میں ان کا انتقال ہوگیا۔ غالب نے اُن کی مدح میں 'درستائش مستر اندرو استرلنگ بہادر صاحب سکریتر' کے عنوان سے فارسی میں پچپن اشعار کا قصیدہ کہا تھا جو کلیات میں شامل ہے۔ بیس اشعار کا قطعۂ تاریخ وفات بھی کہا تھا۔

اردوے معلیٰ، مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل: حصہ ۱: جلد:، ص ۲۸۲۔ گل رعنا: مرتبہ سید قدرت نقوی، ص ۲۹۵، پنج آہنگ، ص ۲۸۸، نامہ ہاے فارسی غالب، ص ۳۹، ۴۰۵ D.I.B. p.405

※※※※※※※※※※

TREVELYAN, SIR CHARLES EDWARD, BARONET (1807-1886)

آئی۔سی۔ایس تھے ہندوستان کے گورنر رہے۔ٹریولیان جارج کے صاحب زادے تھے۔ ٹانٹن، چارٹر ہاؤس اور ہیلی بری میں تعلیم حاصل کی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سول سرونٹ کی حیثیت سے ۱۸۲۶ء میں ہندوستان آئے۔ دہلی میں اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے پر مقرر ہوئے۔ ۱۸۳۱ء میں حکومت ہند کے شعبۂ خارجہ میں انڈر سکریٹری کے عہدے پر فائز ہوئے۔ میکالے کی کوشش تھی کہ ہندوستانیوں کو انگریزی کے ذریعے تعلیم دی جائے۔ٹریولیان میکالے کے ہم خیال تھے۔ اُنھوں نے تعلیم کے مسائل پر بہت کچھ لکھا۔ ۳۸۔۱۸۳۶ء تک ریونیو بورڈ میں سکریٹری رہے۔ ریٹائرمنٹ کے وقت وہ ٹریژری کے سکریٹری تھے۔

۱۹/جون ۱۸۸۶ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔

ملاحظہ ہو:

D.I.B.p.428

✕✕✕✕✕✕✕✕✕✕

WELLESLEY, RICHARD COLLEY, MARQUESS(1760-1842)

گورنر جنرل تھے۔ ویلز لے ۲۰/جون ۱۷۶۰ء کو پیدا ہوئے۔ فرسٹ اول آف مارننگٹن کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ ایٹن، کرائسٹ چرچ، ٹرم ہیرو، آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۷۸۱ء میں مارننگٹن کے اوّل بنے۔ ۹۶۔۱۷۸۶ء کے دوران ایم۔پی رہے۔ ۱۷۸۳ء میں نائٹ آف سینٹ پیٹرک بنے۔ ۱۷۸۶ء میں لارڈ آف ٹریژری، ۱۷۹۳ء میں بورڈ آف کنٹرول کے رُکن، ۱۷۹۳ء میں پریوی کونسلر بنے۔ ۱۷۹۷ء میں مدراس کے گورنر بنے۔ ۱۸/مئی ۱۷۹۸ء سے ۳۰/جولائی ۱۸۰۵ء تک ہندوستان کے گورنر جنرل رہے۔ ٹیپو سلطان شہید کے خلاف اعلانِ جنگ کیا۔ ٹیپو کو شکست ہوئی اور ٹیپو ۴/مئی ۱۷۹۹ء کو سرنگا پٹم میں شہید ہوئے۔ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے قدم جمانے میں ویلز لے کی کوششوں کو بہت دخل تھا۔ ۲۶/ستمبر ۱۸۴۲ء کو ان کی وفات ہوئی۔

ملاحظہ ہو:

D.I.B. p.445

※※※※※※※※※

WILLIAM FRASER (1784-1835)

آئی۔سی۔ایس تھے۔۱۷۹۹ء میں بنگال پہنچے۔ جب Mount Sturat Elphinstone اپنے مشن پر کابل گئے تو یہ سکریٹری کی حیثیت سے ان کے ساتھ تھے۔ ۱۸۰۵ء میں سر آکٹرلونی کے سکریٹری تھے۔ ۱۸۲۶ء میں بورڈ آف ریونیو کے ممبر بنے۔ فریزر ایک دفعہ ۱۸۰۳ء میں تھوڑی سی مدت کے لیے دلّی کے ریذیڈنٹ بنے۔ اس کے بعد ریذیڈنسی ایجنسی میں تبدیل کر دی گئی۔ ۱۸۳۲ء سے لے کر قتل ہونے تک فریزر ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ غالب کی ان سے پہلی ملاقات کلکتے میں ہوئی تھی۔

غالبؔ نے ان کے بارے میں باندے کے نواب محمد علی خاں کے نام کلکتے سے ایک فارسی خط میں لکھا ہے کہ فریزر ایک ایسے سرکاری افسر ہیں کہ وہ دادخواہوں اور منصفوں کے درمیان بلکہ سارے اہلِ حاجات و کونسل کے درمیان ایک واسطہ ہیں۔ ہر قسم کی درخواستیں پہلے ان کے پاس آتی ہیں۔ وہ ان درخواستوں کا انگریزی میں ترجمہ کر کے صاحبانِ کونسل کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ غالبؔ بھی اپنی درخواست لے کر کلکتے میں ان کے پاس پہنچ گئے۔ فریزر نے غالبؔ سے پوچھا کہ نواب گورنر کے لیے کوئی درخواست لے کر آئے ہو؟ غالبؔ نے اپنی قبا کے گریبان سے درخواست نکال کر انھیں پیش کی۔ قاعدہ یہ تھا کہ اگر کوئی درخواست قابلِ قبول نہ ہوتی تو فریزر اُسے رَد کرتے اور کونسل تک نہ پہنچاتے۔ غالبؔ کی درخواست اُنھوں نے منظور کر لی جس سے غالبؔ بہت خوش ہوئے۔ جب غالبؔ رخصت ہونے لگے تو فریزر نے ملازم سے عطردان اور پاندان منگوا کر غالبؔ کی عطر اور پان سے تواضع کی۔ نیز سروقد کھڑے ہو کر غالبؔ کا سلام قبول کیا۔ غالبؔ فریزر کے اس رویّے سے نہ صرف بہت خوش ہوئے بلکہ اپنے مقدمے کے سلسلے میں بہت پُر امید بھی ہو گئے۔

۱۸۳۲ء میں ولیم فریزر دہلی کے ایجنٹ مقرر ہوئے۔ ان کے نواب احمد بخش خاں سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ نواب احمد بخش خاں نے زندگی ہی میں اپنی جائیداد تقسیم کر دی تھی اور اس

تقسیم کے مطابق لوہارو نواب امین الدین احمد خاں اور ضیاالدین احمد خاں کو ملنا چاہیے تھا۔ جائیداد پر جھگڑا بڑھا۔ احمد بخش خاں کے انتقال کے بعد ان کے صاحب زادے شمس الدین احمد خاں جانشیں ہوئے۔ فریزر نے اس سلسلے میں کچھ اس طرح کی حکومت سے سفارشیں کیں کہ نواب شمس الدین کو بہت ناگوار گزرا۔ انھوں نے حکومتِ عالیہ سے ۱۸۲۸ء میں لوہارو کا قبضہ دونوں چھوٹے بھائیوں امین الدین احمد خاں اور ضیاء احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کو دینے کی سفارش کی تھی۔ اس سفارش سے نواب شمس الدین احمد خاں کو لوہارو سے بالکل دست بردار ہونا پڑا۔ نوبت یہاں تک آگئی کہ ایک رات کو گھوڑے پر سوار فریزر جا رہے تھے۔ خاصا اندھیرا ہو گیا تھا کہ نواب شمس الدین خاں کے ایک ملازم کریم خاں نے گولی مار کر فریزر کو قتل کر دیا۔ اس وقت کریم خاں کے ساتھ اینا نامی ایک میواتی ملازم بھی تھا۔ قصہ بہت لمبا ہے مختصر یہ کہ فریزر کے قتل کا واقعہ ۲۲/مارچ ۱۸۳۵ء کی رات کو تقریباً گیارہ بجے کا ہے۔

نواب شمس الدین کو گرفتار کر کے اُن پر مقدمہ دائر کیا گیا۔ یہ مقدمہ انگریز جج رسل کالون کی عدالت میں تھا۔ اس نے نواب شمس الدین اور کریم خاں دونوں کو پھانسی کی سزا دے دی۔

فریزر کو کشمیری گیٹ کے باہر سینٹ جیمز چرچ میں مدفون کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ فریزر کے مزار پر فریزر کے ایک دوست کرنل اسکنر نے سنگ مرمر کا ایک خوشنما مقبرہ بنوا دیا تھا لیکن ۱۸۵۷ء میں انقلابیوں نے اس مقبرے کو اس طرح ڈھایا کہ اس کی مرمت ممکن نہیں رہی۔ صرف قبر باقی ہے۔

ملاحظہ ہوں:

غالب، غلام رسول مہر، ص ص ۴۴-۵۴ D.I.B pp. 155-156 - ناصر الدین احمد خاں، المعروف خسرو مرزا، قتل ولیم فریزر، دہلی سنہِ طباعت ندارد

ابوالقاسم خاں، سید

کلکتے میں جو حضرات غالب کے بہت اچھے دوست بن گئے تھے، اُن میں مولوی سراج الدین احمد، ابوالقاسم خاں، مرزا احمد بیگ طپاں خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

سید ابوالقاسم خاں کا پورا نام مع خطابات مصلح الدولہ سید ابوالقاسم خاں تھا۔ دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ 'دیوانِ جہاں' میں بینی نرائن جہاں نے لکھا ہے کہ ابوالقاسم خاں شاعر تھے اور ان کا تخلص قاسم تھا۔ اُنھوں نے یہ بھی بتایا کہ قاسم خاندانِ بادشاہی سے بہت قربت رکھتے تھے۔ بینی نرائن جہاں کو قاسم سے قربت حاصل تھی۔ جب وہ اپنا تذکرہ لکھ رہے تھے تو قاسم کلکتے میں مقیم تھے۔ عبدالقادر خاں رامپوری نے اپنے روزنامچے میں لکھا ہے کہ:

''قاسم عالی خاندان سے تھے۔ شاہ جہاں آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ کچھ ہی دن لکھنؤ میں رہے اور پھر تلاشِ معاش میں کلکتے چلے گئے۔''

(روزنامچۂ عبدالقادر خاں رام پوری، ص ص ۴۰۔۴۱)

'نسخۂ دل کشا' میں بھی انھیں خاندانِ بادشاہی کا ایک فرد بتایا گیا ہے۔ ناسخ نے انھیں شہزادہ لکھا ہے۔ قاضی عبدالودود، ناسخ کا یہ بیان تسلیم نہیں کرتے۔ اُن کا کہنا ہے کہ ناسخ کے علاوہ کسی اور نے اُنھیں شہزادہ نہیں لکھا۔

ایک دفعہ جب غالب کلکتے میں مقیم تھے تو قاسم کی طبیعت خراب ہوگئی اور غالب نے اُنھیں مسہل لینے کا مشورہ دیا جس سے قاسم کو فائدہ ہوا۔ قاسم نے شکریے کے طور پر پانچ اشعار کا ایک فارسی قطعہ لکھ کر اُنھیں بھیجا جو 'متفرقاتِ غالب' میں نقل ہوا ہے پھر غالب نے اسی زمین اور اسی بحر میں اٹھارہ اشعار کا فارسی قطعہ لکھ کر قاسم کو بھیجا۔ یہ بھی 'متفرقاتِ غالب' میں شامل ہے۔ مرزا غالب کی ایک غزل ہے جس کا عنوان ہے 'غزل اسداللہ خاں غالب۔۔۔ توصیف مرزا احمد بیگ طپاں و مرزا ابوالقاسم خاں قاسم'۔ گیارہ اشعار کی یہ غزل اردو میں ہے۔ اس غزل کا دوسرا شعر ہے:

ہم سخن اور ہم زباں ، حضرتِ قاسم و طپاں
ایک طپش کا جانشیں ، درد کا جانشین ایک

طپش......... قاسم کے استاد تھے۔ غالب نے قاسم کو درد کی یادگار بتایا ہے۔ قاسم کا

درد خاندان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ ممکن ہے کہ وہ درد کے کسی شاگرد کے شاگرد ہوں۔ بنی نرائن جہاں نے قاسم کی ایک اردو غزل نقل کی ہے۔ یہ غزل ۱۸۱۲ء میں کلکتے کے ایک طرحی مشاعرے میں پڑھی تھی۔ بارہ اشعار کی غزل کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

جی اسی کے دھیان میں اپنا لگایا چاہیے
دل سے اسبابِ تعلق سب اٹھایا چاہیے

خانقاہِ قیس پر اور مرقدِ فرہاد پر
شمع اور گل عاشقو جاکر چڑھایا چاہیے

آگ بھڑکی ہے جگر میں بے طرح اے چشمِ تر
دے کے چھینٹا اشک کا اس کو بجھایا چاہیے

چاہتے ہو گر شفا اس عاشقِ رنجور کی
خاک تھوڑی مرقدِ مجنوں سے لایا چاہیے

ہو کے پامالِ خرامِ ناز جوں نقشِ قدم
آپ کو کوچے میں اس کے بس مٹایا چاہیے

عبدالرؤف عروج کا بیان ہے کہ بہادر شاہ ظفر کے 'روز نامچہ' سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالقاسم خاں کلکتے سے دہلی آکر وقائع نگار سلطانی ہوگئے تھے اور ہیضے کی وبا میں ۱۲ر دسمبر ۱۸۳۵ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔ اس کے برعکس نادر علی خاں نے 'اردو صحافت کی تاریخ' میں لکھا ہے کہ "(سراج الاخبار) مطبعِ سلطانی میں مصلح الدولہ بہ اہتمام سید ابوالقاسم وقائع نگار و امداد علی بیگ خاں چھپ کر شائع ہوتا تھا۔"

عتیق صدیقی صاحب نے اس کا اڈیٹر سید اولاد علی کو بتایا ہے۔ نادر علی خاں صاحب کا بیان ہے کہ "سید اولاد علی کبھی کبھی سید ابوالقاسم خاں کی شان میں کچھ نازیبا باتیں بھی لکھ دیا کرتے تھے۔ بقول نادر علی خاں صاحب 'سراج الاخبار' روزِ اول سے سید ابوالقاسم خاں بہادر خاں کی ادارت میں شائع ہوتا تھا اور پرنٹ لائن میں یہ عبارت ہوتی تھی درمطبعِ سلطانی بہ عبارتِ مصلح الدولہ سید ابوالقاسم خاں بہادر طبع شد۔

عبدالرؤف عروج نے لکھا ہے کہ ۱۲ر دسمبر ۱۸۳۵ء کو اُن کا انتقال ہو گیا لیکن ڈاکٹر نادر علی خاں کا بیان ہے کہ جب ۳۰ر جولائی ۱۸۴۱ء کو دہلی سے فارسی کا پہلا اخبار 'سراج الاخبار' جاری ہوا تو ابوالقاسم خاں زندہ تھے۔

قاضی عبدالودود کے مطابق ۱۲ر دسمبر ۱۸۴۵ء کو بہ مرضِ وبا انتقال ہوا۔

ملاحظہ ہوں:

جہانِ غالب، ص ۳۴۷۔۔ متفرقاتِ غالب، ص ۵۰۔۱۰۷۔۔ علم و عمل، ص ۱۴۴۔۔ سخنِ شعرا، ص ۳۰۸۔۔ بزمِ غالب، ص ص ۱۔۳۔۔ اردو صحافت کی تاریخ، ص ص ۱۳۴۔۱۳۹

احمد بخش خاں، نواب

احمد بخش خاں کے مورثِ اعلیٰ اس وقت بلخ سے ہندوستان آئے تھے جب پنجاب میں محمد شاہ بادشاہ کے وزیر نواب قمرالدین خاں کے لڑکے معین الملک عرف میر منو حاکم تھے۔ تین بھائی عارف خان بیگ، قاسم جان اور عالم جان تلاشِ روزگار میں پنجاب پہنچے اور غالباً میر منو کے ملازم ہو گئے۔ میر منو کی وفات کے بعد تینوں دہلی آ گئے۔ اس وقت شاہ عالم میرن کے مقابلے میں فوج کشی کر رہے تھے۔ یہ بھی وہیں پہنچے اور فوج کشی میں شاہ عالم کے ساتھ ہو گئے۔ بڑے بھائی قاسم خان نے ایسی بہادری اور دلیری دکھائی کہ بادشاہ نے انھیں نواب شرف الدولہ، سہراب جنگ کے خطاب سے نوازا اور ہفت ہزاری منصب سے سرفراز کیا۔ یہ تینوں بھائی بادشاہ کے ساتھ دہلی آ گئے۔

قاسم جان اکثر مغلوں کی مہمات پر رہتے تھے۔ عارف جان جاگیر کا انتظام کرتے تھے۔ ان کے چار لڑکے تھے۔ احمد بخش خاں، نبی بخش خاں، الٰہی بخش خاں اور محمد علی خاں۔ اُنھوں نے برطانوی حکومت کی بہت خدمت کی تھی جس کے صلے میں حکومت نے فیروز پور جھرکہ، پونا ہانا، نگینہ سانکرس اور بعض دوسرے اضلاع بقول مالک رام پچیس ہزار روپے سالانہ پر اور بقول غالب بیس یا تیس ہزار روپے سالانہ پر احمد بخش خاں کو دے دیا اور چوں کہ وہ ریاست الور کے وکیل تھے، اس لیے مہاراجا بختاور سنگھ والیٔ الور نے انھیں لوہارو کا پرگنہ بھی دے دیا۔ نصراللہ بیگ کی وفات کے بعد سونک اور سونسا کے پرگنے حکومت نے واپس لے لیے اور رسالہ بھی توڑ

دیا۔ان میں سے پچاس سواروں کا دستہ رہنے دیا اور طے پایا کہ نواب احمد بخش خاں اس دستے کو برقرار رکھیں گے۔حکومت کو جب ضرورت پڑے گی۔وہ یہ رسالہ طلب کرلے گی۔۴رمئی ۱۸۰۶ء کو حکمت نے حکم صادر کیا کہ نواب احمد بخش خاں اپنی جاگیر کے لیے پچیس ہزار کی جو رقم حکومت کو ادا کرتے ہیں وہ معاف کی جاتی ہے۔شرط یہ ہے کہ اس رقم میں پندرہ ہزار روپے احمد بخش خاں رسالے پر خرچ کریں گے اور دس ہزار روپے سالانہ مرزا نصراللہ بیگ کے پسماندگان کو بطورِ وظیفہ ادا کریں گے۔

یہ حکم ۴رمئی ۱۸۰۶ء کو صادر ہوا تھا۔بقول غالبؔ ۷رجون ۱۸۰۶ء کو یعنی تقریباً ایک مہینے بعد نواب احمد بخش خاں نے لارڈ لیک سے ایک خط حاصل کرلیا جس کی رُو سے مرزا نصراللہ بیگ کے متعلقین کو پانچ ہزار روپے سالانہ ادا کیا جانا تھا۔غالب کی پنشن کے مقدمے کی بنیاد یہی خط تھا۔غالب کا اصرار تھا کہ یہ خط اصلی نہیں ہے،نواب احمد بخش خاں نے یہ جعلی خط تیار کیا تھا۔

احمد بخش خاں کی دو بیویاں تھیں۔ایک میواتی اور دوسری اُن کی ہم قوم۔نواب شمس الدین اور ابراہیم خاں پہلی بیوی کے بطن سے تھے اور دوسری بیوی کے بطن سے نواب امین الدین خاں اور نواب ضیاالدین احمد خاں تھے۔

ملاحظہ ہوں:

۱-حمیدہ ، خاندان لوہارو کے شعرا، نئی دہلی، ۱۹۸۱، ص ص ۱۰۳-۱۰۴۔-۲- غالب کی خاندانی پنشن، ۲۸۱-۲۸۲۔-۳- ذکرِ غالب، ص ص ۱۰-۱۲۔-۴-بزمِ غالب، ص ص ۱۰-۱۲۔-۵-عبدالرؤف عروج نے ان کتابوں کے بھی حوالے دیے ہیں۔تاریخِ راجگانِ ہند، ص ص ۳۶۸-۳۶۰، کارنامۂ راجپوتاں، ص ۳۵۲-۳۵۳، دیباچۂ صحیفہ زریں

افضل بیگ،مرزا

جیسا کہ تفصیل کے ساتھ بتایا جاچکا ہے کہ پنشن کے سلسلے میں نواب احمد بخش خاں نے غالب کے ساتھ ناانصافی کی تھی۔غالب کا خیال تھا کہ اگر وہ اپنا معاملہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذمہ داران کے سامنے پیش کریں تو اُن کے ساتھ انصاف ہوگا۔یہ امید لیے غالب دہلی سے کلکتے تک کی مسافت کی صعوبتیں اُٹھاتے ہوئے بالآخر کلکتے پہنچ گئے لیکن اس شہر میں بھی قسمت نے

اُن کا ساتھ نہیں دیا۔ مرزا افضل بیگ اکبر شاہ ثانی کے وکیل کی حیثیت سے ۱۸۲۷ء میں کلکتے پہنچ گئے تھے۔

'پنشن کا قضیہ' کے عنوان سے اس کتاب میں جو باب شامل ہے، اُس میں بتایا جاچکا ہے کہ حکومت نے نصر اللہ خاں کے پسماندگان کو پنشن دینے کی ذمے داری سونپی تھی، اُس کی تقسیم میں نواب احمد بخش خاں نے بقول غالب دس ہزار روپے سالانہ کی رقم کے بجائے پانچ ہزار روپے سالانہ کردیا۔ اس کے علاوہ پنشن پانے والوں میں اپنے ایک ملازم خواجہ حاجی کو بھی شامل کر کے پانچ ہزار سے دو ہزار اس کے نام اور باقی تین ہزار میں چھ افراد یعنی مرزا غالب، مرزا یوسف، مرزا نصر اللہ بیگ خاں کی والدہ اور تین بہنیں پنشن کے مقدمے میں غالب کی ناکامی کے ذمہ دار ایک شخص مرزا افضل بیگ بھی تھے۔ یہ غالب کے بہنوئی مرزا اکبر بیگ کے چھوٹے بھائی تھے۔ مرزا افضل بیگ، ایک رئیس اشرف بیگ خاں کے بطور داروغہ عمارات ملازم تھے۔ تیس روپے ماہوار اُن کی تنخواہ تھی۔ ان کی مکاری اور ریشہ دوانی کی وجہ سے اشرف بیگ خاں نے انھیں ملازمت سے برطرف کردیا تھا۔

اکبر شاہ ثانی کے گیارہ بیٹے تھے۔ بہادر شاہ ظفر سب سے بڑے بیٹے تھے۔ اکبر شاہ ثانی ظفر کے سخت مخالف تھے۔ وہ ظفر کے بجائے اپنے تیسرے بیٹے مرزا جہانگیر کو ولی عہد بنانا چاہتے تھے مگر ۳۱ سال کی عمر میں ۱۸۲۱ء میں مرزا جہانگیر کا انتقال ہوگیا۔ اب بادشاہ نے چوتھے بیٹے مرزا سلیم کو ولی عہد بنانے کی کوششیں شروع کردیں۔ بہادر شاہ ظفر کو یقین تھا کہ اس سازش میں مرزا افضل بیگ، راجا سوہن لال اور مرزا سلیم تینوں شامل ہیں۔ اس لیے ظفر نے ۶/ اپریل ۱۸۳۰ء سے کچھ قبل گورنر جنرل کو ایک خط لکھا جس میں ان واقعات کی تفصیلات بیان کیں۔ کالی داس گپتا رضا نے اس خط کے کچھ ضروری حصّوں کا ترجمہ اپنی کتاب 'متعلقاتِ غالب' میں شامل کیا ہے جو درجِ ذیل ہے:

> "......اس شاہی گھرانے کی تاریخ اور حالات زمانۂ تیمور سے...... تا دمِ تحریر آپ کو اچھی طرح معلوم ہیں۔ اب کچھ ایسے حالات درپیش ہیں کہ جن کی وجہ سے صبر وقناعت کا دامن ہاتھ سے چھوٹ چھوٹ گیا ہے۔ مختصر تفصیل آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں کیوں کہ جناب والا کے سوا چار دانگِ عالم میں اب میرا کوئی دوست اور محافظ نہیں ہے...... بادشاہ سلامت سہل انگاری، کوتاہ نظری اور عمر رسیدہ ہونے کی

وجہ سے اپنے ماتحت عہدے داروں، دفتری نظام اور دیگر امور کی طرف توجہ نہیں دیتے ہیں۔ان ہی حالات کے زیرِ اثر سوہن لال جو محض ایک متعدّی تھا اور جس کا باپ بھی مدت تک باورچی خانے میں ملازم رہا تھا اور جس کی خاندانی رذالت ہر کہ ومہ پر اظہر من الشمس ہے اب بادشاہ کا مختار بن بیٹھا ہے اور یہ افضل بیگ نامی ایک شخص کے ساتھ ملا ہوا ہے جو دلّی دربار میں میرے خلاف سازش میں شریک ہے(سوہن لال نے)مرزا سلیم کی وساطت سے بادشاہ کو راضی کر کے افضل بیگ کو پریذیڈنسی (کلکتہ)میں سرکار انگلشیہ کا وکیل مقرر کروادیا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ افضل بیگ کسی بھی طرح اس مرتبے کا آدمی نہیں کہ وہ ایسے اہم عہدے پر مقرر کیا جاسکے کیوں کہ اس کے آباؤاجداد ایک رذیل خاندان سے تھے اور ان کا شمار شاہی خاندان کے نمک خواروں میں کبھی نہیں رہا ہے۔افضل بیگ خود وکالت کا عہدہ پانے سے پہلے بطور داروغۂ عمارات اشرف بیگ خان کا تیس روپے ماہوار کا ملازم تھا۔مزید برآں اسے اشرف بیگ خاں کی ملازمت سے مکاری اور ریشہ دوانی کے متعدد الزامات کی بنا پر برطرف کردیا گیا تھا۔گورنر جنرل کے دربار میں ایسے انسان کی بطور وکیل اچانک سربلندی شاہی دربار کے قواعد کے قطعاً خلاف ہے۔اس کے علاوہ ایسے رذیل شخص کو عہدے دار بنانا اور اسے کلکتے میں انگریزی سرکار کے افسروں کی سطح پر لا بٹھانا خود انگریزی دربار کی شان کم کرنے کے مترادف ہے اور میری سمجھ بوجھ کے مطابق قطعاً نامناسب ہے۔

کلکتے پہنچتے ہی افضل بیگ نے اپنی ضرر رساں فطرت کا اظہار ایک بنگالی رام موہن رائے سے تعلق بڑھا کر کیا اور دبیر الدولہ خواجہ فرید خاں کا دوست ثابت کر کے بادشاہ سلامت کے روبرو پیش کیا......دراصل دبیر الدولہ اور رام موہن رائے کی دوستی ایک جعل ہے......افضل بیگ نے وکالت کے عہدے پر مستقل حیثیت سے قائم رہنے کی توقع میں مرزا سلیم کے دماغ میں ولی عہدی کی امیدیں روشن کررکھی ہیں اور میرے متعلق ایسے کلمات استعمال کیے ہیں جو کوئی استعمال کرنے کی

> جرأت نہیں کرسکتا۔ یہ چرچا ادنیٰ و اعلیٰ سب کی زبان پر ہے...... مجھے یقین ہے کہ افضل بیگ جو میرے خلاف ایسی ہتک آمیز اور ضرررساں باتیں پھیلا رہا ہے اور ہر طرح سے میری ذلت و رسوائی پر اُدھار کھائے بیٹھا ہے۔ آپ کے دربار سے مناسب سزا پائے گا۔

اس خط کا اصل مقصد صرف یہ تھا کہ شہزادہ بہادر شاہ ظفر کو انگریز باقاعدہ ولی عہدِ سلطنت مغلیہ تسلیم کیے رہیں۔ چناں چہ ۱۶ر جولائی ۱۸۳۰ء کے خط میں گورنر جنرل نے نہ صرف یہ کہ شہزادہ ابوظفر (بہادر شاہ ظفر) کو بدستور ولی عہد کے القاب سے مخاطب کیا ہے بلکہ یقین دلایا ہے کہ شہزادے کے حقوق کی حفاظت کی جائے گی اور یہ کہ انھیں قطعاً کوئی اندیشہ دل میں نہ لانا چاہیے۔

بعض لوگوں کا خیال کہ "۱۸۳۴ء یا اس کے بعد انگریزوں نے بہادر شاہ کو ولی عہد مقرر کیا" درست نہیں۔

مرزا افضل بیگ کا وکیل کی حیثیت سے تقرر ۲۴ر اگست ۱۸۲۷ء سے قبل ہو چکا تھا۔ اوپر جو خط نقل کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی بادشاہ کی طرف سے ایک شُقّہ تھا۔ کالی داس گپتا نے اس شُقّے کا درج ذیل اقتباس پیش کیا ہے:

> "ہمارا فرماں بردار خادم افضل بیگ جو جناب والا کی حاضری بجا لاتا ہے ہمارے دلی مقاصد اور التجاؤں کو آپ کے گوش گزار کرے گا۔"

مرزا افضل بیگ ۱۵ر نومبر ۱۸۳۰ء کے بعد دہلی واپس آگئے۔ مرزا افضل بیگ کی شادی حکیم مومن خاں مومنؔ کی بھانجی سے ہوئی تھی۔

فرحت اللہ بیگ نے خواجہ بدرالدین خاں عرف خواجہ امان مرحوم کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا تھا۔ جو سہ ماہی اردو اپریل ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مقالے میں جو شجرہ نسب دیا گیا ہے۔ اس کے مطابق مرزا جیون بیگ نامی ایک صاحب، غالب کے دادا کے ساتھ بدخشاں سے ہندوستان آئے تھے۔ مرزا جیون بیگ کے دو لڑکے، مرزا اکبر بیگ، مرزا افضل بیگ اور ایک لڑکی امیر النسا بیگم تھی۔

مرزا اکبر بیگ کی شادی غالبؔ کی بڑی بہن چھوٹی خانم سے ہوئی تھی۔ مرزا افضل بیگ، مرزا اکبر بیگ کے چھوٹے بھائی تھے۔ مرزا اکبر بیگ اور مرزا افضل بیگ کی ایک ہی بہن تھیں جن کا

نام تھا امیر النسا بیگم۔ ان کی شادی خواجہ حاجی خاں سے ہوئی تھی۔ غالبؔ کا دعویٰ تھا کہ خواجہ حاجی کا اس خاندان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انھیں پینشن غلط مل رہی ہے۔ خواجہ حاجی کا ۱۸۲۳ء میں انتقال ہوگیا تو یہ پینشن اُن کے دولڑکوں شمس الدین خاں عرف خواجہ جان اور بدرالدین خاں عرف خواجہ امان کو ملنے لگی۔

کلکتے میں اکبرشاہ ثانی کے وکیل کی حیثیت سے ایسٹ انڈیا کمپنی میں مرزا افضل بیگ کا بہت اچھا رسوخ تھا۔ کمپنی کے عہدے داروں میں وہ بہت معزز تھے۔ اسی لیے غالبؔ کے قیامِ کلکتہ کے دوران ۱۶رفروری ۱۸۲۹ء کو دربار ہوا تو مرزا افضل بیگ کی نشست تیسرے نمبر پر تھی۔ غالبؔ کو بھی دربار میں شرکت کی دعوت دی گئی اور اُن کی نشست دسویں نمبر پر تھی۔ یہ فطری بات تھی کہ مرزا افضل بیگ نے اپنی بہن کے یتیم بچوں کے حق کے لیے جدو جہد کی۔

غالبؔ اور مرزا افضل بیگ کے اختلاف بلکہ دشمنی کی بنیاد یہی معاملہ تھا۔ مرزا افضل بیگ نے کلکتے میں برطانوی افسروں کی نظر میں غالبؔ کو ذلیل کرنے کی کوشش میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔

زیرنظر کتاب کے 'ادبی معرکے کے تین مشاعرے' کے تحت ایک باب میں کلکتے میں غالبؔ اور مرزا افضل بیگ کے مناقشے کے بارے میں تفصیلات بیان کردی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں غالبؔ کے خطوط کے کچھ اقتباس پیش کیے گئے ہیں۔ مشاعروں میں کم علم دشمنوں کے ہاتھوں غالبؔ کی بہت رُسوائی ہوئی۔ اس کے باوجود افضل بیگ سے اُن کے رسمی تعلقات تھے۔ غالبؔ نے اپنے دوست سراج الدین احمد کے نام ایک فارسی خط میں لکھا ہے:

> ''والیِ من و مولاے من۔ رمضان کی ۷ تاریخ کو برادرِ ریاپیشہ، کج اندیشہ افضل بیگ نے میرے گھر کو رونق بخشی۔ بزرگوں کا احترام اور عاجز نوازی اُن کی عادت ہے۔ جس روز دہلی پہنچے، اسی دن مجھ سے ملاقات کے لیے آئے .... آپ کو خوش خبری دیتا ہوں کہ مرزا افضل بیگ کو مقرب الدولہ اور خان بہادر کے خطابات سے نوازا گیا ہے۔ اب اُن کی انگوٹھی کے نگینے پر 'مقرب الدولہ افضل بیگ بہادر' کندہ ہے لیکن جس دن سے دہلی آئے ہیں بخار، کھانسی اور زکام کے مرض میں مبتلا ہیں۔''

مرزا افضل بیگ کا ۳راگست ۱۸۳۱ء کو انتقال ہوا۔ مرزا افضل بیگ کے ایک ہی بیٹے تھے، جن

کا نام مرزا عبداللہ بیگ عرف مرزا دولا تھا۔ ان کا مکان دہلی میں چوڑی والان کی میگزین والی گلی میں تھا۔ ممکن ہے کہ اسی مکان میں مرزا افضل بیگ کا انتقال ہوا ہو۔

ملاحظہ ہوں:

(۱) ذکر غالب، ص ص ۲۷۔۲۸ (۲) سہ ماہی اردو، اپریل ۱۹۳۱ء، ص ص ۲۴۱۔۲۳۵ (۳) رسالہ تحقیق نامہ، لاہور، شمارہ: ۶۔۷۔ ص ص ۱۷۔۵۰ (۴) متعلقاتِ غالب، ص ص ۸۹۔۹۸۔۔ کارنامہ سروری، ص ۱۹، ۳۶، بزمِ غالب، ص ص ۴۲۔۴۳۔ سہ ماہی غالب نامہ، جنوری ۱۹۹۷ء، ص ۳۷

***

اکبر بیگ، مرزا

غالبؔ کی بہن چھوٹی خانم کے صاحب زادے اور خواجہ حاجی کے سالے تھے۔ اکبر بیگ مرزا فرحت اللہ بیگ کے پردادا اور مرزا افضل بیگ کے بھائی تھے۔ غالبؔ نے کلکتے سے جو خطوط لکھے تھے ان میں سے طپاں کے نام ایک خط میں غالبؔ نے لکھا ہے کہ شادی کا دعوت نامہ مرزا اکبر بیگ کے نام بھی بھیجا جائے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس وقت مرزا اکبر بیگ کلکتے میں تھے۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ کلکتے کیوں گئے تھے، کب گئے تھے اور اس شہر میں کب تک رہے۔ اس کے بعد کسی اور خط میں ان کا نام نہیں آیا۔ عبدالرؤف عروج نے 'بزمِ غالب' میں لکھا ہے کہ یہ عربی اور فارسی کے ماہر تھے۔ یہی نہیں بلکہ ان کو ریاضی، ہیئت اور دوسرے علوم کے ساتھ ساتھ رمل اور نجوم پر بھی مکمل دسترس تھی۔ مرزا اکبر بیگ حج کے لیے گئے تو مصر کے راستے اطالیہ پہنچ گئے اور وہاں ریاضیات کا علم حاصل کرتے رہے۔ پھر مغربِ اقصیٰ کے شہروں کی سیر کرتے ہوئے حیدرآباد دکن آگئے جہاں مہاراجا چندو لال شاداں نے نہ صرف اپنا مہمان رکھا بلکہ مناسب پذیرائی بھی کی۔ کچھ دن بعد مرزا اکبر بیگ دہلی واپس آگئے۔ یہاں ان کے مکان کا نام شیش محل تھا۔ اُنھوں نے دہلی میں ایک گھنٹہ گھر تعمیر کیا تھا جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کا پہلا گھنٹہ گھر تھا۔ ان کے تین صاحب زادے اور ایک صاحب زادی تھی۔ (۱) مرزا عاشور بیگ (۲) مرزا جواد علی بیگ عرف مرزا مغل بیگ (۳) اور مرزا عباس بیگ، صاحب زادی کا نام تھا امانی بیگم۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ ان کا انتقال کب ہوا۔

ملاحظہ ہوں:

بزمِ غالب۔ کارنامۂ سروری، ۱۹۔۲۰۔۔ذکرِ غالب۔۲۳۔۲۵ ،رسالہ اردو اپریل ۱۹۳۱۔ مآثر غالب،ص۱۱۲

ﮨﮨﮨﮨﮨﮨﮨﮨﮨﮨ

التفات حسین خاں، منشی

ان کا ذکر 'نامہ ہائے غالب' میں آیا ہے۔ یہ دہلی کے ریذیڈنٹ کول بروک کے منشی تھے۔ 'پنج آہنگ' میں ان کے نام غالب کا ایک خط ہے۔

ملاحظہ ہو:

پنج آہنگ،ص ۳۶۹

ﮨﮨﮨﮨﮨﮨﮨﮨﮨﮨ

الٰہی بخش خاں معروفؔ ،نواب

معروفؔ، عارف جان کے صاحب زادے تھے۔بقول قاضی عبدالودود ''قرینہ ہے کہ ۱۱۷۵ھ (۶۱-۱۷۶۲ء) کے لگ بھگ ان کی ولادت ہوئی۔''

مولانا سیدضیاء الدین کے ہاتھ پر چشتیہ سلسلے میں بیعت کرلی تھی۔ سید ضیاء الدین ،مولانا فخر الدین دہلوی کے خلیفہ تھے۔معروف کا شمار اردو کے اچھے شاعروں میں ہوتا ہے۔شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔محمد حسین آزادؔ نے انھیں ذوقؔ کا شاگرد بتایا ہے، جو غلط ہے۔بقول قاضی عبدالودود۔۔پہلی بیوی سے دولڑکیاں اور ایک لڑکا تھا۔غالبؔ کی بیوی امراؤ بیگم کو زین العابدین خاں کی والدہ بنیادی بیگم اور علی بخش خاں ان کی بیاہتا بیوی سے تھے۔اُن کی ایک حرم بھی تھیں جو صاحب اولاد تھیں۔معروف کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔محمد حسین آزاد نے اُن کا سنہِ وفات ۱۲۴۲ھ (۲۷-۱۸۲۶ء) بتایا ہے۔نساخ نے تاریخِ وفات کہی۔

گفت تاریخِ فوتِ او ہاتف ساکن جنّتِ بریں معروفؔ

۱۲۴۲ھ

معروفؔ اپنے خاندانی قبرستان حضرت نظام الدین اولیا میں مدفون ہیں۔اسی احاطے میں غالبؔ، غالبؔ کی بیوی امراؤ بیگم اور زین العابدین خاں عارف بھی مدفون ہیں۔

ملاحظہ ہوں:

۱۔ تذکرہ ماہ و سال، ص ۳۶۱۔ خاندانِ لوہارو کے شعرا، ص ص ۱۰۳۔۱۰۶، بزمِ غالب، ص ص ۳۵۳۔۳۵۶

جہانِ غالب، ص ص ۱۴۱۔۱۴۳

امراؤ بیگم

غالبؔ تیرہ سال کے تھے جب اُن کی شادی نواب احمد بخش خاں کے چھوٹے بھائی اور اردو کے مشہور شاعر نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ کی صاحب زادی امراؤ بیگم سے ہوئی۔اس وقت امراؤ بیگم کی عمر گیارہ سال تھی اور یہ خاندان دہلی میں آباد تھا۔نواب علاء الدین خاں علائی کے نام ایک خط میں غالبؔ نے اپنی شادی کی تاریخ ۷؍رجب ۱۲۲۵ھ مطابق ۹؍اگست ۱۸۱۰ء بتائی ہے۔شادی کے دو تین سال بعد غالبؔ نے دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔امراؤ بیگم سے غالبؔ کے سات بچے ہوئے لیکن ان میں سے کوئی بھی زندہ نہ رہا۔امراؤ بیگم نے اپنے حقیقی بھانجے نواب زین العابدین خاں عارف کو گود لے لیا اور جب عارفؔ کا بھی انتقال ہوگیا تو اُنھوں نے عارفؔ کے دو کم سن بچوں باقر علی خاں اور حسین علی خاں شاداں کو متبنیٰ کرلیا۔ غالبؔ کی وفات کے بعد امراؤ بیگم پر بقول مالک رام غم و الم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔وہ زبردست مالی پریشانیوں کا شکار ہوگئیں۔غالبؔ آٹھ سو روپے کا قرض چھوڑ کر مرے تھے۔قرض خواہوں نے امراؤ بیگم کو تنگ کر رکھا تھا۔پنشن بند ہوگئی تھی۔رام پور سے جو سو روپے ماہوار ملتا تھا وہ سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔غالبؔ نے اپنے آخری دنوں میں نواب صاحب کو لکھا تھا کہ ان پر آٹھ سو روپے کا قرض ہے اگر نواب صاحب اس قرض کی ادائیگی کے لیے یہ رقم دے دیں تو انھیں اس

قرض سے چھٹکارا مل جائے گا مگر نواب صاحب نے غالبؔ کی اس درخواست کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ غالبؔ کی وفات کے بعد یکم اگست ۱۸۶۹ء کو امراؤ بیگم نے رام پور کے نواب کلب علی خاں کو خط لکھ کر اس رقم کی درخواست کی۔ ایک مہینے تک نواب صاحب کا کوئی جواب نہیں آیا تو ۲ر ستمبر ۱۸۶۹ء کو امراؤ بیگم نے دوبارہ خط لکھ کر درخواست کی کہ یہ رقم دے کر اُن کا قرض چکا دیا جائے۔ ۹ر ستمبر کو نواب صاحب نے داغؔ کو حکم دیا کہ وہ اس معاملے میں تحقیق کر کے رپورٹ پیش کریں۔ ۳۰ر اکتوبر ۱۸۶۹ء کو نواب صاحب نے امراؤ بیگم کو چھ سو روپے کی ہنڈی بھیجنے کا حکم صادر کیا۔ غلام رسول مہرؔ نے اپنی تصنیف 'غالب' میں لکھا ہے:

> ''نواب سر امیر الدین احمد خاں مرحوم فرماتے تھے کہ نواب ضیا الدین خاں نے قرض خواہوں سے کچھ رقم معاف کرا کے باقی رقم اپنے پاس سے ادا کر دی تھی اور امراؤ بیگم کے لیے ۲۵ یا ۵۰ روپے ماہوار لوہارو سے مقرر ہو گئے جو تادمِ وفات انھیں باقاعدہ ملتے رہے۔''

مالک رام صاحب کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ یہ بیان ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ نواب رام پور نے جب چھ سو روپے کی رقم دے دی تھی تو اس صورت میں یہ کہنا مناسب نہیں ہے کہ کچھ رقم معاف کرا کے باقی رقم اپنے پاس سے دے دی تھی۔ یہ خیال رہے کہ ۱۸۵۷ء میں نواب ضیا الدین احمد خاں نے امراؤ بیگم کا ۵۰ روپے ماہوار مقرر کر دیا تھا پھر یہ دوبارہ وظیفہ مقرر کرنے کا کیا مطلب ہے۔

امراؤ بیگم نے حکومت کو درخواست دی تھی کہ جو پنشن غالبؔ کو ملتی تھی وہ مرزا حسین علی کے نام منتقل کر دی جائے۔ بقول مالک رام دہلی کے ڈپٹی کمشنر نے تو رپورٹ امراؤ بیگم کے حق میں دی مگر کمشنر نے اس درخواست پر حکم دیا کہ مرزا حسین علی خاں غالبؔ کے متبنّیٰ ہیں اور پنشن متبنّیٰ اولاد کو منتقل نہیں ہو سکتی۔ کمشنر نے یہ حکم بھی دیا کہ امراؤ بیگم کو مبلغ دس روپے ماہوار دیے جا سکتے ہیں بشرطیکہ وہ عدالت میں حاضر ہو کر یہ رقم وصول کیا کریں۔ امراؤ بیگم کو یہ شرط منظور نہیں تھی اس لیے ان کے نام یہ وظیفہ جاری نہیں ہو سکا۔ ۲ر ذی قعدہ ۱۲۸۶ھ مطابق ۴ر فروری ۱۸۷۰ء کو صبح دس گیارہ بجے کے قریب ان کا انتقال ہو گیا اور انھیں غالبؔ کی قبر کے برابر مدفون کر دیا گیا اور جب غالب کا مقبرہ تیار ہو گیا تو امراؤ بیگم کی قبر کو غالب کے مقبرے سے باہر رکھا گیا۔

ملاحظہ ہوں:

بزمِ غالب، ص ص ۵۹۔۶۰۔۔غالب کی خاندانی پنشن، ص ص ۳۰۳۔۳۰۴۔۔ذکرِ غالب، ص ص ۴۳۔۴۴۔۱۴۱۔۱۴۲۔۔مکاتیبِ غالب، ص ص ۵۔۷۔۔غالب، ص ۲۷۔۔غالب کے خطوط:۱:۲:۳۷۲

امیر النسا بیگم

غالبؔ کے دادا اور مرزا جیون بیگ بدخشاں سے ایک ساتھ ہندوستان آئے تھے۔مرزا جیون بیگ کے دو صاحب زادے مرزا اکبر بیگ (غالبؔ کے بہنوئی) اور مرزا افضل بیگ تھے۔ان دونوں کا غالبؔ سے بہت گہرا تعلق تھا، جس کی تفصیل زیرِ نظر کتاب میں بیان کی گئی ہے۔مرزا جیون بیگ کی اولاد میں ایک صاحب زادی بھی تھیں جن کا نام امیر النسا تھا۔ان کی شادی حاجی خاں سے ہوئی تھی۔خواجہ حاجی کے دو صاحب زادے تھے۔شمس الدین خاں عرف خواجہ جان اور بدرالدین عرف خواجہ امان۔۔خواجہ قمرالدین خاں راقمؔ سے منسوب ایک مضمون میں، امیر النسا خانم کو مرزا جیون بیگ کی بیوی بتایا ہے جو درست نہیں۔امیر النسا مرزا جیون بیگ کی بیوی نہیں بیٹی تھیں۔

ملاحظہ ہوں:

سہ ماہی اردو، اورنگ آباد، اپریل ۱۹۳۱ء۔سہ ماہی اردو، اورنگ آباد، جنوری ۱۹۲۲ء، ص ۳۷۳

امی کرن

باندے میں نواب ذوالفقار علی خاں نے غالبؔ کو جس مہاجن سے دو ہزار روپے قرض دلائے تھے،ان کا اصل نام سیٹھ امی کرن تھا۔یہ نواب ذوالفقار علی خاں کے بینکر تھے۔ان کے جدامجد کا نام سیٹھ عزت کرن تھا۔بقول صالحہ بیگم قریشی آج بھی یہ خاندان باندے میں محلّہ علی گنج میں سیٹھ کے باڑے کے نام سے اپنی حویلی نما مکان میں قیام پذیر ہے۔ان ہی سیٹھ امی کرن کی

اولاد میں سیٹھ اودے کرن بھی تھے جو ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی میں نواب علی کے ذریعے ترتیب دی گئی، وار کونسل کے ایک اہم رکن تھے اور نواب صاحب کے دستِ راست تھے۔ ان ہی امی کرن سیٹھ کے خاندان کی ایک شاخ سے سیٹھ لکشمی کرن اڈوکیٹ تھے جو آبائی حویلی میں گوشہ نشیں کی زندگی گزار رہے تھے اور اب انتقال کر چکے ہیں۔

ملاحظہ ہو:

صالحہ بیگم قریشی، ص ص ۸۱-۸۲

اوزبک جان

ان کے بارے میں ہماری معلومات بہت محدود ہیں۔ ہمیں صرف اتنا ہی معلوم ہے جتنا اُن کے بارے میں غالب نے بتایا ہے۔ یہ غالب کے ماموں کے بیٹے تھے۔ غالب کی والدہ یعنی اوزبک جان کی پھوپھی نے انھیں اپنا دودھ پلایا تھا۔ اوزبک جان باندہ کے نواب ذوالفقار بہادر کی حقیقی خالہ کے بیٹے تھے۔ نواب علی بہادر کے زمانے میں یہ باندہ میں تھے اور اسی زمانے میں اُنھوں نے غالب کو باندہ بلایا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بہادر شاہ ظفر بیمار تھے، اس لیے غالب باندے نہیں جا سکے۔ اردوے معلیٰ کی پہلی اشاعت میں غالب نے ان کا نام اوزبک خاں اور ایک اور خط میں اورنگ خاں لکھا ہے۔

ملاحظہ ہو:

جہانِ غالب، ص ص ۹۶-۹۷

جانو

یہ مرزا احمد بیگ خاں طپاں کے ملازم تھے۔ غالب نے طپاں سے فرمائش کی تھی کہ وہ اپنے ملازم جانو کو بھیج کر نیچوں کی مرمت کرادیں۔ جانو نے مرمت نہیں کروائی تو غالب نے مرزا احمد بیگ طپاں کو شکایتاً لکھا:

''سرکار کے خادموں کی بے پروائی تحریر میں نہیں سماسکتی۔مجبوراً نچہ بند کو جانو کے اور جانو کو خدا کے سپرد کرتا ہوں اور بس۔''

ملاحظہ ہو:

تحقیق نامہ، ص ۲۳

ــــــــ

خواجہ حاجی

غالبؔ نے اپنی پنشن کے سلسلے میں کلکتے میں حکومت کو ۲۸/اپریل ۱۸۲۸ء کو جو عرض داشت پیش کی تھی اس میں خواجہ حاجی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''نصراللہ بیگ خاں (غالبؔ کے چچا) کے والدِ محترم کے زمانے میں، جن کا نام قوقان بیگ خاں تھا، ایک نوجوان ہوا کرتا تھا جس کا نام خواجہ مرزا تھا اور جو پانچ روپے ماہانہ تنخواہ پر اسپ سواروں کے دستے میں بطور بارگیر ملازم تھا۔

قوقان بیگ کی اہلیہ یعنی نصراللہ بیگ خاں کی والدہ کی ایک بیوہ بہن تھی جن کی ایک غیر شادی شدہ بیٹی تھی.....قوقان بیگ خاں نے اپنی بیوی کی بہن کی بیٹی کا عقد خواجہ مرزا سے کردیا اور یہ خواجہ حاجی ان ہی کا بیٹا ہے۔

سوائے اس کے کہ خواجہ حاجی کی والدہ نصراللہ بیگ خاں کی ماں کی بہن کی بیٹی تھی، خواجہ حاجی اور نصراللہ بیگ خاں کے والدین کے درمیان نہ کبھی کوئی قرابت داری یا تعلق تھا اور نہ ہے۔''

ملاحظہ ہو:

(غالب کی خاندانی پنشن، ص ۳۱)

نصراللہ بیگ کے پسماندگان کے لیے برطانوی حکومت نے دس ہزار روپے سالانہ کی پنشن مقرر کی تھی اور نواب احمد بخش خاں کو پینشن کی تقسیم کی ذمہ داری سونپی تھی۔ان پسماندگان

میں غالبؔ، مرزا یوسف، غالبؔ کی دادی اور نصراللہ بیگ خاں کی تین بہنیں یعنی چھ افراد تھے۔ احمد بخش خاں نے ایک تو دس ہزار کی رقم گھٹا کر پانچ ہزار کردی اور دوسرے نصراللہ بیگ کے پسماندگان میں خواجہ حاجی کو شامل کر کے دو ہزار روپے خواجہ حاجی کے نام اور باقی چھ افراد کے نام کل تین ہزار روپے کر دیے۔

خواجہ حاجی کی شادی جیون بیگ کی صاحب زادی امیر النسا بیگم سے ہوئی۔ ان کے دو صاحب زادے تھے۔۔ شمس الدین خاں عرف خواجہ جان اور بدرالدین عرف خواجہ اماں۔

ملاحظہ ہو:

غالب کی خاندانی پینشن، ص ۳۱

خواجہ حاجی کے پوتے خواجہ قمرالدین خاں راقم سے منسوب ایک مقالہ 'مرزا غالبؔ کے نسب نامہ' کے عنوان سے سہ ماہی اردو ۱۹۲۲ء (ص ص ۳۶۷۔۳۷۲) میں مرزا رفیق بیگ نبیرہ خواجہ قمرالدین خاں راقمؔ شائع کرایا ہے جس میں بے شمار غلط بیانیاں کر کے غالبؔ سے بدلہ چکانے کی کوشش کی گئی ہے۔

راقم کی چند غلط بیانیاں ملاحظہ ہوں:

۱۔ راقم نے اپنے اس مضمون میں لکھا ہے کہ:

نصراللہ بیگ خواجہ حاجی خاں کے چچا تھے۔ غالبؔ کے قول کے مطابق یہ صریحاً غلط ہے۔ ان دونوں کا اصل رشتہ کیا تھا۔ غالب کی زبانی اس کی تفصیل بیان جا چکی ہے۔

۲۔ خواجہ راقم نے لکھا ہے کہ:

> ''مرزا خواجہ حاجی خاں نے نصراللہ بیگ کی جاگیر کا استغاثہ کیا۔ احمد بخش خاں نے بھی سفارش کی۔ سرکار نے وہ جاگیر بدستور خواجہ حاجی خاں کے نام نسلاً در نسلٍ مقرر کردی اور عہدنامے میں لکھ دیا کہ یہ جاگیر نصراللہ خاں کی سرکار سے تم کو عطا ہوئی ہے۔ تم متعلقان نصراللہ کی بھی پرورش اور دستگیری کرتے رہو۔ چناں چہ حاجی خاں بطور اپنے فرزندوں کے ان بچوں کی بھی پرورش کرتے رہے۔''

خواجہ راقم کا یہ پورا بیان صریحاً غلط اور بے بنیاد ہے۔ اگر سرکار نے نصراللہ بیگ کی جاگیر خواجہ

حاجی کو دے دی تھی تو غالبؔ کی پنشن کے مقدمے میں فریقین میں سے کسی کی طرف سے مقدمے میں اس کا ذکر ضرور ہوتا۔ خواجہ راقم نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

> ''خواجہ حاجی کی یہ جاگیر خود اُن کی خواہش پر نواب احمد بخش خاں کی جاگیر فیروز پور کی ریاست میں شامل کر دیا گیا تھا''۔

یہ بیان بھی سو فی صدی غلط ہے۔ کیوں کہ پنشن کے اس پورے مقدمے میں کہیں اس کا ذکر نہیں ملتا۔

خواجہ راقم کا بیان ہے کہ:

> ''خواجہ حاجی خاں غالبؔ کے دادا ترسم خاں (یہ نام غلط ہے) کے چھوٹے بھائی رستم خاں کے لڑکے قطب الدین خاں کے صاحب زادے تھے اور خواجہ حاجی خاں، غالب کے بزرگوں کے ساتھ ہندوستان آئے تھے۔ یہ بیان بھی غلط ہے کیوں کہ خواجہ حاجی کی ولادت ہندوستان ہی میں ہوئی تھی۔

۱-راقم کا قول ہے کہ خواجہ حاجی خاں غالبؔ اور اُن کے چھوٹے بھائی یوسف مرزا کی بطور اپنے فرزندوں کے پرورش کرتے رہے۔

یہ صریحاً غلط ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو غالبؔ یا اُن کا کوئی ہم عصر اس کا ذکر ضرور کرتا۔

۲-راقمؔ نے لکھا ہے کہ خاندانی شجرہ راقمؔ کے دادا خواجہ مرزا حاجی خاں کے پاس تھا، جو رشتے میں غالب کے بھائی ہوتے تھے اور غالب کی پرورش وہی کرتے تھے۔

راقم کا یہ بیان بھی قطعاً غلط ہے۔

۳-راقم کا بیان ہے کہ مرزا جیون بیگ خاں بھی نصر اللہ بیگ خاں اور عبداللہ بیگ خاں کے ساتھ ہندوستان آئے۔ یہ صریحاً غلط ہے۔

عبدالرؤف عروجؔ نے 'بزمِ غالب' میں لکھا ہے کہ خواجہ حاجی کا ۱۸۲۵ء میں جذام میں مبتلا ہو کر انتقال ہوا۔ خواجہ کے مرض الموت کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اُن کی وفات کے بارے میں میرا قیاس ہے کہ وہ ۱۸۲۳ء میں فوت ہوئے تھے۔

ملاحظہ ہوں:

(۱) سہ ماہی اردو،۱۹۲۲ء، ۳۶۸۔۳۷۲ (۲) اظہار الحق ملک، غالب کے خود نوشت حالات، احوالِ غالب، ص ۳۳ (۳) غالب، پنج آہنگ، دہلی ۱۸۵۳ء، ص ۳۲۷ (۴) پنج آہنگ، ص:۳۲۶ (۵) پنج آہنگ، ص ص ۴۰۴۔۴۰۵ (۶) غالب کے خطوط (چہارم) ص۔۱۵۳۳ (۷) غالب کے خطوط، چہارم، ص ۱۵۳۳ (۸) بزمِ غالب، ص ص ۱۳۴۔۱۳۶ (۹) احوالِ غالب، طبع دوم، ص ص ۱۲۳۔۱۳۴۔

(۱۰) آجکل (فروری) ۱۹۶۳ء۔ احوالِ غالب، ص ۲۸ (۱۱) متفرقاتِ غالب، ص ۶

ذوالفقار علی بہادر، نواب

ان کے خاندان کی تفصیل مالک رام نے اپنی کتاب 'تلامذۂ غالب' میں بیان کی ہے۔ بقول مالک رام نواب علی بہادر شاعر تھے اور علی تخلص کرتے تھے اور غالب کے شاگرد تھے۔ نواب علی بہادر، شمشیر بہادر کے صاحب زادے تھے۔ شمشیر بہادر مستانی نام کی ایک خاتون کے بطن سے باجی راؤ کے صاحب زادے تھے۔ باجی راؤ نے اپنی بندیل کھنڈ کی جاگیر میں سے باندہ بطور تحفہ شمشیر بہادر کو دے دیا۔ شمشیر بہادر پانی پت کی تیسری لڑائی (۱۷۶۱ء) میں مارے گئے تو ان کے صاحب زادے علی بہادر اُن کے جانشین بنے۔ علی بہادر کی دو بیویاں تھیں۔ ایک بیوی سے شمشیر بہادر اور دوسری سے ذوالفقار علی بہادر تھے۔ علی بہادر کی وفات (۲۸/اگست ۱۸۰۲ء) کے بعد شمشیر بہادر، علی بہادر کے جانشین بنے۔ علی بہادر کی وفات کے بعد انگریزوں نے باندہ ریاست پر قبضہ کرلیا اور شمشیر بہادر اور ان کے خاندان کے گزارے کے لیے چار لاکھ روپے سالانہ وظیفہ مقرر کردیا۔ کچھ عرصے کے بعد حکومت نے شمشیر بہادر کو باندے کے قریب بڑی جائداد دے دی۔ شمشیر بہادر ۳۱/اگست ۱۸۲۳ء کو لاولد انتقال کر گئے۔ اس لیے حکومت نے ان کے سوتیلے چھوٹے بھائی ذوالفقار بہادر کو اس خاندان کا سربراہ تسلیم کرلیا۔ ذوالفقار بہادر سے غالب کی رشتہ داری بھی۔ غالب نے ایک خط میں لکھا ہے:

> ''میرا ایک بھائی ماموں کا بیٹا کہ وہ نواب ذوالفقار بہادر کی حقیقی خالہ کا بیٹا ہوتا تھا اور مسند نشینِ حال کا چچا تھا اور وہ میرا ہمشیر بھی تھا یعنی میں

نے اپنی ممانی اور اس نے اپنی پھوپھی کا دودھ پیا تھا، وہ باعث ہوا تھا۔ میرے باندہ بندیل کھنڈ آنے کا۔ میں نے سب سامانِ سفر کرلیا، ڈاک میں روپیہ ڈاک کا دے دیا۔ قصد یہ تھا کہ فتحپور تک ڈاک میں جاؤں گا۔ وہاں سے نواب علی بہادر کے ہاں کی سواری میں باندے جا کر، ہفتہ بھر رہ کر کالپی ہوتا ہوا، آپ کے قدم دیکھتا ہوا، بسبیلِ ڈاک دتی چلا آؤں گا۔ ناگاہ حضور والا (یعنی بہادر شاہ ظفر) بیمار ہوگئے اور مرض نے طول کھینچا۔ وہ ارادہ قوت سے مغل میں نہ آیا اور پھر مرزا اورنگ خاں (؟ اوزبک خاں) میرا بھائی مرگیا۔" اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔"

غالب کے اس خط سے معلوم ہوا کہ غالب کی ممانی ذوالفقار بہادر کی سگی خالہ تھیں۔ ذوالفقار بہادر کے اپنے بیٹے علی بہادر ثانی ہوئے اور ان کی خالہ کے بیٹے اورنگ خاں (یا اوزبک خاں) ان کے بھائی تھے۔ جب غالب نے کلکتے جاتے ہوئے لکھنؤ سے واپسی پر باندے میں قیام کیا تو اس وقت ذوالفقار بہادر باندہ کے نواب تھے۔ غالب نے ایک خط میں لکھا ہے "میرے بزرگوں اور نواب ذوالفقار علی بہادر کے باہمی بہت پرانے تعلقات تھے۔ خود میرے دل میں بھی نواب کے لیے حد درجہ محبت اور لگاؤ تھا۔ اس لیے جوں توں گرتا پڑتا باندہ پہنچ گیا۔"

بقول رنگا چاری رنگا الہ آبادی اس وقت ذوالفقار علی بہادر کی عمر ۲۷ (ستائیس) سال تھی۔ (ان کی پیدائش ۱۸۰۰ء میں ہوئی تھی)

غالب بیماری کی حالت میں باندہ پہنچے تھے اور چھ مہینے تک اُنھوں نے باندہ میں قیام کیا تھا۔ ہمارے خیال سے ان کی تیمارداری نواب ذوالفقار علی خاں اور مولوی محمد علی خاں دونوں نے کی۔ اگر ذوالفقار علی خاں اور محمد علی خاں نہ ہوتے تو میرا خیال ہے کہ غالب کو لکھنؤ یا کچھ دن باندہ رہنے کے بعد ہی دہلی واپس آنا پڑتا۔ ذوالفقار علی خاں نے امی کرن نامی ایک مہاجن سے غالب کو دو ہزار قرض دلوائے تھے۔ میرا قیاس ہے کہ یہ رقم خود امی کرن کے نام سے نواب ذوالفقار علی بہادر نے اپنی جیب سے دی تھی۔ براہِ راست خود یہ رقم اس لیے نہیں دی کہ شاید غالب اسے واپس نہ کریں۔ اس رقم میں سے باندہ سے کلکتے تک کے سفر پر غالب نے چودہ سو روپے صَرف کیے اور جب وہ کلکتے پہنچے ہیں تو ان کے پاس صرف چھ سو روپے تھے۔ ۱۸۴۹ء میں نواب ذوالفقار بہادر کا انتقال ہوا۔ منیر شکوہ آبادی نے تاریخ وفات کہی:

موزوں نمود سالِ مسیحی چنیں منیرؔ
شد آہ ذوالفقارِ علی در نیام ، آہ

ملاحظہ ہوں:

باندہ اور غالب، ص ص ۱۱۔۱۲، ۶۰۔۶۱ وغیرہ۔۔تلامذۂ غالب،ص ۳۲۹ اور ص ص ۴۲۶۔۴۳۵۔۔غالب کے خطوط:۳:۹۸۱۔۔غالب اور بندیل کھنڈ از محمد مشتاق شارق مشمولہ سہ ماہی تحریر، اپریل۔جون ۱۹۷۷ء ص ص ۱۴۔۱۵

XXXXXXXXXX

راؤ شیورام

کلکتے میں غالبؔ راؤ شیورام سے مرزا احمد بیگ طپاںؔ کے گھر یا خود راؤ شیورام کے گھر جا کر ملاقات کرنا چاہتے تھے لیکن انھیں خیال آیا کہ ان دونوں جگہوں پر ''جیسی خلوت چاہیے، نہیں مل سکے گی'' اس لیے طپاں کے نام ایک خط میں غالب نے خواہش ظاہر کی کہ طپاں راؤ شیورام کو لے کر غالب کے گھر آجائیں۔غالب نے اس سلسلے میں طپاںؔ کو سخت تاکید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''اس ضمن میں کسی قسم کی غفلت درمیان نہیں آنی چاہیے۔'' کسی بھی ذریعے سے یہ نہیں معلوم ہوا کہ راؤ شیورام کون تھے۔میرا قیاس ہے کہ یہ کوئی مہاجن تھے اور غالب اُن سے قرض لینا چاہتے تھے۔

ملاحظہ ہو:

تحقیق نامہ، ص ۳۰

XXXXXXXXXX

سراج الدین احمد خاں

سراج الدین احمد خاں غالبؔ کے بہت ہی عزیز دوستوں میں سے تھے۔ غالبؔ کی ان سے دوستی کلکتے میں ہوئی تھی۔ کلکتے سے واپس آنے کے تقریباً ۳۵ سال بعد بھی غالب کے دل میں سراج الدین احمد کی محبت اور احترام قائم تھا۔ غالب نے ۱۸۶۴ء میں منشی غلام غوث خاں

بے خبر کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

"ستر برس کی عمر ہے۔ بے مبالغہ کہتا ہوں ستر ہزار آدمی نظر سے گزرے ہوں گے زمرۂ خواص میں سے، عوام کا شمار نہیں۔ دو مخلص الولا دیکھے ایک مولوی سراج الدین رَحْمۃُ اللہ علیہ دوسرا منشی غلام غوث مُسلّمہٗ اللہ العلی العظیم۔۔لیکن وہ مرحوم (سراج الدین احمد) حسنِ صورت نہیں رکھتا تھا اور خلوص اخلاص اس کا میرے ساتھ تھا......" (فارسی سے ترجمہ)

ان کا اصل وطن لکھنؤ تھا۔ کچھ دن کانپور میں بھی رہے تھے۔ بقول سید مسعود حسن رضوی ادیب مولوی سراج الدین احمد حکام رس آدمی تھے۔ غالب کے سب سے زیادہ فارسی خط انھیں کے نام ملتے ہیں۔ "پنج آہنگ" میں ان کے نام ۲۸ اور 'متفرقاتِ غالب' میں ۲۱ خط ہیں اور بقول قاضی عبدالودود ان میں سے گیارہ خط ایسے ہیں جو ان دونوں میں مشترک ہیں لیکن ڈاکٹر حنیف نقوی کا بیان ہے کہ گیارہ نہیں چودہ خطوط مشترک ہیں۔ کلکتہ چھوڑ کر لکھنؤ آگئے تھے۔ غالب نے منشی شیونرائن آرام کی معرفت انھیں 'دستنبو' کا ایک نسخہ بھیجا تھا اور لکھنؤ میں ان کا یہ پتا لکھا تھا۔۔۔۔ در لکھنؤ بہ احاطۂ خان ساماں، متصل تکیہ شیر علی شاہ با امکانات مولوی عبدالکریم مرحوم بخدمت مولوی سراج الدین احمد۔

یہ اعیانِ دفترِ کونسل میں سے تھے۔ فارسی کا بہت اچھا مذاق رکھتے تھے۔ ان ہی کی فرمائش پر غالب نے اپنے اردو اور فارسی کلام کا انتخاب 'گل رعنا' کے نام سے کیا تھا۔ سراج الدین احمد کلکتے سے ایک اخبار 'آئینۂ سکندر' کے نام سے نکالتے تھے۔ غالب کے کئی خطوں میں اس کا ذکر ہے۔ گربچن چندن نے 'جامِ جہاں نما' میں لکھا ہے کہ 'آئینۂ سکندر' ۱۸۳۱ء کو جاری ہوا تھا اور مولوی سراج الدین احمد اس کے اڈیٹر تھے۔ 'گل رعنا' میں غالب کی ایک فارسی غزل شامل ہے جس کا مقطع ہے

با سراج الدین احمد چارہ جز تسلیم نیست
ورنہ غالب نیست آہنگِ غزل خوانی مرا

ملاحظہ ہوں:

غالب کے خطوط: ۲: ۶۶۔ غالب کے خطوط: ۳: ۱۰۶۸۔ جام جہاں نما

سراج الدین علی خاں، قاضی

سراج الدین خاں ضلع اناؤ کے قصبہ موہان کے رہنے والے تھے۔ غالب کے باندے کے دوست مولوی محمد علی صدر امین باندہ کے بھائی تھے۔ غالب نے اُن کی وفات کا جو قطعۂ تاریخ کہا تھا اس سے ان کا سالِ وفات ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۸۲۸ء۔۱۸۲۹ء نکلتا ہے۔

سراج الدین علی خاں شاعر تھے اور موجد تخلص کرتے تھے۔ جب کہ سید اکبر علی ترمذی بتاتے ہیں کہ ان کی وفات ۱۲۳۸ھ مطابق ۱۸۲۲۔۱۸۲۳ء میں ہوئی۔ غالب جب باندہ ہوتے ہوئے کلکتے آ رہے تھے تو مولوی محمد علی خاں نے انھیں سراج الدین علی خاں مرحوم کی بیگم کے نام ایک خط دیا تھا۔ یہ بیگم کلکتے کے اس علاقے میں رہتی تھیں جس کا نام انتالی تھا۔ غالب نے مولوی محمد علی خاں کو لکھا ہے کہ 'میں ایک دوست کے ساتھ انتالی پہنچا۔ سب سے پہلے سراج الدین علی خاں کے مزار پر گیا، فاتحہ پڑھی اور پھر محمد علی خاں کا خط حرم سرا میں بھیج دیا۔' بیگم صاحبہ سے جو گفتگو ہوئی غالب نے اسے بھی اپنے خط میں نقل کر دیا ہے۔

جب غالب سراج الدین علی خاں مرحوم کے گھر پہنچے ہیں تو اس وقت مزار کے قریب ایک امام باڑے اور ایک مسجد کی تعمیر ہو رہی تھی۔ غالب نے امام باڑے کی بنیاد رکھنے پر پانچ اشعار کا فارسی قطعہ کہا تھا اور مسجد کی تاریخ کا چار اشعار کا فارسی قطعہ کہا تھا۔ یہ دونوں قطعے نامہ ہاے فارسی غالب، مترجمہ پرتو روہیلہ (ص ص ۱۳۳۔۱۳۴) میں شامل ہیں۔

ملاحظہ ہوں:

نامہ ہاے فارسی غالب، مترجمہ پرتو روہیلہ، ص ص ۱۳۳۔۱۳۴۔ جہانِ غالب، ص ص ۳۹۔۴۰۔۔ بزمِ غالب، ص ۱۹۸

سید کرم حسین بلگرامی، مولوی

ان کے خاندان کا تعلق بلگرامی سادات سے تھا۔ اُن کے والد کا نام سید حسین رضا تھا۔ بقول مالک رام مولوی سید کرم حسین کو عربی اور فارسی میں عالمانہ دستگاہ حاصل تھی۔ جس زمانے میں غالب کلکتے میں تھے، سید کرم حسین کلکتے میں گورنر جنرل کے دربار میں شاہِ اودھ کے سفیر تھے

اودھ سرکار نے خدمات کے اعتراف میں انھیں خطاب خان بہادر مع اسپ و فیل و پالکی و نالکی کے اعزاز سے نوازا تھا۔ زمانۂ سفارت میں انھیں سترہ سو روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔

سید کرم حسین کلکتے کے مدرسۂ عالیہ میں غالباً عربی بھی پڑھاتے تھے۔ کلکتے میں اُنھوں نے انگریزی سیکھ لی تھی۔ جب گورنر جنرل نے سفیر اودھ کا عہدہ موقوف کر دیا تو سید کرم حسین کو بھی برطرف کر دیا گیا۔ یہ لکھنؤ واپس نہیں آئے بلکہ کلکتے ہی میں مقیم رہے۔

حیدر آباد کے نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی، سید کرم حسین بلگرامی کے پوتے تھے۔ مالک رام نے 'گل رعنا' میں اس خاندان کا جو شجرۂ نسب نقل کیا ہے، اس کے مطابق اُن کی پوتی مریم تھیں، جن سے سید نقی بلگرامی کی شادی ہوئی تھی۔ مالک رام کو غالب کی 'گلِ رعنا' کا بیش بہا مخطوطہ سید نقی بلگرامی نے دیا تھا۔ یہ مخطوطہ اُن کے خاندان میں محفوظ تھا۔ ممکن ہے کہ قیامِ کلکتہ کے دوران غالبؔ نے 'گل رعنا' کا مخطوطہ مولوی سید کرم حسین بلگرامی کو پیش کیا ہے۔ کرم حسین نے اس کی نقل کرالی ہے۔ بقول مالک رام 'یہ نسخہ مولوی سید کرم حسین کے خاندان میں رہا اور نسلاً بعد نسلٍ سید مہدی حسین (مہدی یار جنگ) کو ملا۔ اُنھوں نے اپنے بھتیجے جناب سید نقی بلگرامی کو عطا کیا اور اُنھوں نے مجھے عنایت فرمایا۔''

سید کرم حسین سے غالبؔ کے تعلقات کی ابتدا کلکتے میں ہوئی تھی۔ ناسخؔ کے بھی سید کرم حسین سے تعلقات تھے۔ ناسخ نے اپنے تذکرہ 'سخن شعرا' میں لکھا ہے کہ سید کرم حسین اپنے گھر پر مشاعرے منعقد کرتے تھے جن میں مقامی ایرانی بھی مدعو کیے جاتے تھے۔ ایسے ہی ایک مشاعرے میں غالبؔ نے وہ غزل سنائی تھی جس کا مطلع ہے:

تا فصلے از حقیقتِ اشیا نوشتہ ایم
آفاق را مرادفِ عنقا نوشتہ ایم

بقول مالک رام ''اگر یہ غزل کلکتے میں کہی گئی تھی تو تعجب ہے کہ اُنھوں (غالبؔ) نے اس کا کوئی شعر 'گل رعنا' میں نہیں لیا۔'' غالبؔ کا تیرہ اشعار کا ایک مشہور قطعہ ہے جس کا پہلا شعر ہے:

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے، اسے جس قدر اچھا کہیے

حالیؔ نے اس قطعے کی تفصیل ان الفاظ میں بیان کی ہے:۔

''۱۸۷۱ء میں جب کہ نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم کلکتے گئے ہوئے تھے۔ مولوی محمد عالم مرحوم نے جو کلکتے کے ایک دیرینہ سال فاضل تھے۔ نواب صاحب سے بیان کیا کہ جس زمانے میں مرزا صاحب یہاں آئے ہوئے تھے۔ ایک مجلس میں جہاں مرزا بھی موجود تھے اور میں بھی حاضر تھا۔ شعرا کا ذکر ہو رہا تھا۔

اثنائے گفتگو میں ایک صاحب نے فیضی کی بہت تعریف کی۔ مرزا نے کہا ''فیضی کو جیسا لوگ سمجھتے ہیں ویسا نہیں ہے۔'' اس پر بات بڑھی۔ اُس شخص نے کہا فیضی جب پہلی ہی بار اکبر کے روبرو گیا تھا، اُس نے ڈھائی سو شعر کا قصیدہ اُسی وقت ارتجالاً کہہ کر پڑھا تھا۔ مرزا بولے ''اب بھی اللہ کے بندے ایسے موجود ہیں کہ دو چار سو نہیں تو دو چار شعر ہر موقع پر بداہتہً کہہ سکتے ہیں۔'' مخاطب نے جیب میں سے ایک چکنی ڈلی نکال کر ہتھیلی پر رکھی اور مرزا سے درخواست کی کہ اس ڈلی پر کچھ ارشاد ہو۔ مرزا نے گیارہ شعر کا قطعہ اُسی وقت موزوں کر کے پڑھ دیا جو کہ اُن کے دیوانِ ریختہ میں موجود ہے اور جس کا پہلا شعر یہ ہے:

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے

۱۲۵۷ھ مطابق ۱۸۴۱ء۔ ۱۸۴۲ء میں ان کا انتقال ہوا۔

ملاحظہ ہوں: ۱- گل رعنا، مقدمہ ۲- یادگار غالب، ص ص ۳۵-۳۶

شائق، فیض الدین عرف حیدر جان

رحمٰن علی طپش نے 'تواریخ ڈھاکہ' میں ایک جگہ اُن کا عرف خواجہ حیدر جہاں اور دوسری جگہ خواجہ حیدر جان لکھا ہے۔ صحیح عرف خواجہ حیدر جان ہی تھا۔ تذکرہ ناسخ میں ہے کہ شائق کے والد کا نام خواجہ خلیل اللہ ہے۔ 'نسخۂ دلکشا' میں یہ نام خواجہ علیم اللہ ہے جو درست نہیں ہے۔

طپش نے اطلاع دی ہے کہ شائق شہر کے معزز لوگوں میں اور سر عبدالغنی کے قرابت داروں میں تھے۔ غالب سے خط و کتابت کے ذریعے اصلاح لیتے تھے۔ بقول طپش، شائق کا ایک مختصر سا دیوان تھا۔ اب یہ دیوان موجود نہیں ہے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے

تھے۔ 'نسخۂ دلکشا' میں انھیں باشندۂ جہانگیر نگر بتایا ہے۔ جب کہ محسن لکھنوی نے 'سراپا سخن' میں انھیں ڈھاکے کا باشندہ بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ 'وارد دہلی ہیں'۔ بقول ڈاکٹر حنیف نقوی مولف 'سراپا سخن' ۱۲۵۹ھ۔۱۲۶۹ھ کے دوران کسی وقت دہلی میں تھے۔ قاضی عبدالودود کا بیان ہے کہ شائق کا دہلی جانا غالباً صحیح نہیں۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے لکھا ہے کہ غالب کے قیامِ کلکتہ کے دوران شعبان ۱۲۴۴ھ (فروری ۱۸۲۹ء) میں شائق بھی وہاں موجود تھے۔ وہ ڈھاکہ واپس جاتے وقت غالب سے ملاقات نہیں کر سکے اس کا انھیں افسوس تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سے پہلے کم از کم ایک بار دونوں کی ملاقات ضرور ہو چکی تھی۔ قاضی عبدالودود کا خیال ہے کہ 'سالِ وفات کا تعین مشکل ہے مگر یہ یقین ہے کہ تیرھویں صدی کے آٹھویں عشرے میں ان کا انتقال ہوا۔

ملاحظہ ہوں:

قاضی عبدالودود، آثر غالب، تصحیح، ترتیب جدید، ڈاکٹر حنیف نقوی، کراچی ۲۰۰۰ء۔ ص ۱۰۹۔ تلامذۂ غالب، ص ص ۲۱۳۔۲۱۴۔۔ نگارستانِ سخن، ص ۴۵۔۔ سراپا سخن ص ۱۹۷، مشرقی بنگال میں اردو، ص ص ۳۰۔۳۵۔۔ تواریخ ڈھاکہ، ص ۲۳۷۔۔ نسخۂ دلکشا، ص ۱۴۱

※※※※※※※※※※

شمس الدین خاں، نواب

یہ نواب احمد بخش خاں کی میواتی بیوی کے بطن سے تھے۔ شمس الدین خاں کے دوسرے صاحب زادے ابراہیم علی خاں تھے۔ دوسری بیوی سے دو لڑکے تھے، نواب امین الدین خاں اور نواب ضیاء الدین احمد خاں۔۔۔۔ احمد بخش خاں نے اپنی زندگی ہی میں نواب شمس الدین خاں کو ولی عہد بنا دیا اور فیروز پور جھرکہ کا حکمراں بنا دیا۔ تگینہ ابراہیم علی کو دیا تھا۔ ۱۸۲۵ء میں نواب شمس الدین نے لوہارو نواب امین احمد خاں اور نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر کے حوالے کر دیا۔ جب اکتوبر ۱۸۲۷ء میں احمد بخش خاں کا انتقال ہوا تو تینوں بھائیوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ دونوں چھوٹے بھائیوں نے نواب شمس الدین خاں کے خلاف دعویٰ کیا کہ وہ ریاست میں برابر کے حق دار ہیں۔ معاملہ ریذیڈنٹ دہلی کے پاس پہنچا۔ حکومت نے فیصلہ کیا کہ لوہارو کا قبضہ دونوں چھوٹے بھائیوں کے پاس رہے گا اور چوں کہ امین الدین احمد خاں جو دونوں چھوٹے بھائیوں میں بڑے ہیں جب تک ضیا الدین احمد خاں سنِ بلوغت کو نہیں پہنچتے،

-/5210 روپے سالانہ ضیاء الدین احمد کے لیے خزانے میں جمع کرتے رہیں گے اور جب ضیاء الدین احمد خاں سنِ بلوغت کو پہنچ جائیں گے تو لوہارو دونوں میں برابر تقسیم ہو جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نواب شمس الدین خاں لوہارو کے نظم و نسق سے محروم کر دیے گئے۔ نواب شمس الدین احمد حکومت پر زور دیتے رہے کہ لوہارو کا نظم و نسق اُن کو سونپا جائے۔ حکومت نے نواب شمس الدین خاں کو اس شرط پر لوہارو واپس کر دیا کہ وہ دونوں بھائیوں کو نقد رقم ادا کرتے رہیں۔ اس زمانے میں ولیم فریزر گورنر جنرل کا ایجنٹ تھا۔ یہ معاملہ اس کے سپرد کر دیا گیا۔ ناصر الدین احمد خاں المعروف خسرو مرزا نے 'قتلِ ولیم فریزر' میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ نواب شمس الدین ولیم فریزر سے ملاقات کے لیے دہلی آئے تو فریزر نے ملاقات سے انکار کر دیا۔ یہ بات شمس الدین کو اتنی ناگوار گزری کہ انھوں نے ۲۲/مارچ ۱۸۳۴ء کو اپنے ایک ملازم کریم خاں سے ولیم فریزر کو قتل کرا دیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس قتل کی وجہ یہ تھی کہ ولیم فریزر نے حکومت سے سفارش کی تھی کہ لوہارو نواب شمس الدین کے چھوٹے بھائیوں نواب امین الدین احمد خاں اور نواب ضیا الدین کو دے دیا جائے، اس لیے نواب شمس الدین خاں نے ولیم فریزر کو قتل کرا دیا تھا۔ نواب شمس الدین کے چھوٹے بھائیوں اس قتل کے الزام میں نواب شمس الدین خاں کو ۹/اکتوبر ۱۸۳۵ء کی صبح پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ غالبؔ نے شیخ امام ناسخ کے نام ایک فارسی خط میں لکھا ہے کہ شہر کے لوگ سمجھتے ہیں کہ نواب شمس الدین خاں بے گناہ تھے۔ دہلی کے لوگ مجھ پر لعن طعن کر رہے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ میں نے مخبری کر کے شمس الدین خاں کو گرفتار کرایا ہے۔

غالبؔ فریزر کے بہت اچھے دوست تھے۔ اس لیے آگے چل کر غالبؔ نے لکھا ہے کہ شروع میں تو مجھے ولیم فریزر کے قتل کا غم تھا۔ اب قاتل پکڑا گیا تو شہر کے بدگمانوں نے مجھے عاجز کر رکھا ہے۔

چوں کہ قرض خواہوں کے خوف سے غالبؔ صرف رات کو گھر سے نکل سکتے تھے۔ ان دنوں میں مقروض اگر گھر سے باہر نکلتا تو اسے گرفتار کر لیتے تھے۔

شہر کے میجسٹریٹ غالبؔ کے پرانے دوست تھے۔ اس لیے غالبؔ میجسٹریٹ سے ملنے رات کو جاتے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ غالبؔ رات کو نواب شمس الدین خاں کے خلاف مخبری کے لیے رات کو مجسٹریٹ سے ملنے جاتے تھے۔

ملاحظہ ہوں:

دیباچہ دیوان معروف۔ آج کل فروری ۱۹۵۶ء۔ غالب کی خاندانی پینشن، ص ص ۲۸۹۔۲۹۰
ناصرالدین احمد خاں المعروف خسرو مرزا، قتل ولیم فریزر، سنہ طباعت ندارد، دہلی۔ پنج آہنگ،
ص ص ۳۳۶۔۳۳۷

XXXXXXXXXXXX

صادق علی خاں، حکیم

ہندوستان کے مشہور و ممتاز حکیم جناب شریف خاں کے چار صاحب زادے تھے۔ حکیم محمد خاں، حکیم غلام محمود خاں، حکیم صادق علی خاں اور حکیم مرتضیٰ خاں۔ حکیم صادق علی خاں، ۱۱۸۴ھ مطابق ۱۷۷۰۔۱۷۷۱ء میں دلّی میں پیدا ہوئے۔ عربی، فارسی اور طب کی تعلیم والد سے حاصل کی۔ حکیم صادق علی خاں، اکبر شاہ ثانی کے دربار سے وابستہ تھے۔ انگریزوں نے ان کی جائداد ضبط کر کے ان کے صاحبزادوں کی کچھ تنخواہیں مقرر کر دی تھیں۔ حکیم صاحب مطب بھی کرتے تھے اور درس و تدریس کا کام بھی کرتے تھے۔ طب پر اُنھوں نے کئی کتابیں لکھی تھیں۔ حکیم اجمل خاں کے والد حکیم محمد خاں ان ہی کے صاحب زادے تھے۔ ۲۹/صفر ۱۲۶۴ھ مطابق ۵/فروری ۱۸۴۸ء کو انتقال ہوا۔ مرزا سہراب جنگ نے اس مصرع سے تاریخِ وفات نکالی ؎

طبیب صادق و عالم حکیم صادق بود

۱۲۶۴ھ

ملاحظہ ہوں: اطبائے عہد مغلیہ، ص ۱۱۶۔ واقعاتِ دار الحکومت، جلد ۲: دہلی ۲: ۴۰۶۔۴۰۷

حیاتِ اجمل، ص ص ۱۰۔۱۱۔ غدر کا نتیجہ، ص ۵۹۔ آثار الصنادید، ۳: ۲۶۰

XXXXXXXXXXXX

طپاں، احمد بیگ خاں، مرزا

یہ لوہارو کے نواب احمد بخش خاں کے برادرِ بزرگ نبی بخش خاں کے سالے تھے (پنج آہنگ،

ص ۵۲) طپش کے شاگرد تھے۔ صدر دیوانی کلکتے کے مختار تھے۔ بہت اچھے انداز سے زندگی گزارتے تھے۔ بقول قاضی عبدالودود، یہ بتانا مشکل ہے کہ غالب کی طپاں سے ملاقات دہلی سے تھی یا کلکتے میں ہوئی۔ عبدالغفور نساخ (سخن شعرا، ص ۳۰۲) اور محسن علی موسوی نے ان کے والد کا نام نواب عطا اللہ خاں بتایا ہے جو درست نہیں ہے محسن علی موسوی، تذکرہ سراپا سخن، تلخیص سید سلیمان حسین، سنہ طباعت ندارد، ص ص ۱۲۴۔۱۲۵) 'علم و عمل' کے مصنف عبدالقادر رام پوری جب ڈھاکے سے کلکتے گئے تو انھوں نے طپاں سے بھی ملاقات کی۔ انھوں نے طپاں کے والد کا نام ''مرزا ہادی خاں' بتایا ہے۔

غالب نے بھی اُن کے بارے میں لکھا ہے 'مرزا احمد بیگ طپاں ابنِ مرزا ہادی بیگ خاں برادرِ زنِ مہین برادر نواب احمد بخش خاں دوم) غالب کے اس بیان سے بیان چلتا ہے کہ طپاں کی خاندان لوہارو سے رشتہ داری تھی۔ غالب نے شیفتہ کے نام ایک خط میں بھی طپاں کے والد کا نام مرزا ہادی بیگ لکھا ہے۔ طپاں اور ان کے استاد دونوں اپنا تخلص 'ط' سے لکھتے تھے لیکن قاضی صاحب نے ہر جگہ ان کا نام 'ت' سے لکھا ہے جو متنی تنقید کے اصولوں کے خلاف ہے، جو شخص اپنا نام اور تخلص جس طرح املا کرتا ہے ہمیں اسے ہی تسلیم کرنا ہوگا۔ مولوی عبدالقادر رام پوری نے لکھا ہے کہ:

> ''وہ (طپاں) اچھے شاعر ہیں، اپنا سلسلہ تغمتش خاں سے ملاتے ہیں۔ میری ان سے بے تکلفانہ دوستی ہے۔ وہ ریختہ گوئی میں پرانے شعرا کا نمونہ ہیں۔ کلکتے کے اکثر لوگ اس فن میں اُن سے استفادہ کرتے ہیں۔''[۱]

[۱] معاصرِ غالب، ص ۱۹۳، ص ص ۱۱۳۔۱۱۴

طپاں کلکتے میں صدر دیوانی میں مختار تھے۔ وہ مقدمے کے سلسلے میں غالب کو ان سے بہت مدد مل سکتی تھی لیکن چوں کہ ان کے تعلقات غالب کے مخالف گروپ سے بھی تھے۔ اس لیے غالب نے ان کے نام جتنے بھی خطوط لکھے ہیں ان میں اپنے مقدمے کے بارے میں ایک لفظ نہیں لکھا۔ اگرچہ غالب اور طپاں کے تعلقات اتنے اچھے ہوگئے تھے کہ طپاں چاہتے تھے کہ غالب کلکتے میں ان کے ساتھ قیام کریں لیکن غالب راضی نہیں ہوئے۔ غالب جب دہلی پہنچے ہیں تو تقریباً اس کے ساڑھے تین مہینے بعد انھیں طپاں کی وفات کی خبر ملی۔

غالب نے کلکتے کے اپنے ایک دوست سراج الدین علی خاں کو طپاں کی وفات پر جو خط لکھا ہے

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں طپاں کی وفات سے کتنا صدمہ ہوا تھا اور انھیں طپاں کی اولاد کی کتنی فکر تھی۔ چوں کہ اس خط سے غالب کے جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے اس لیے پورا خط نقل کیا جارہا ہے:

''قبلہ و کعبہ۔ والا نامہ پہنچا اور مرزا احمد بیگ کے فراقِ دائمی کی خبر ملی۔ میں بھی کس قدر سنگ دل و سخت جان ہوں کہ ایک دوست کی وفات پر ماتم پرسی کے لیے خط لکھ رہا ہوں اور میرا وجود اپنے اجزا کے ساتھ ذرّہ ذرّہ ہوکر بکھر نہیں جاتا۔

میرا یہ دوست کہتا تھا کہ میں دہلی آرہا ہوں مگر اس وعدہ فراموش و بے مروّت نے اثنائے راہ میں اپنی منزلِ سفر کو بدل دیا اور سواریِ ناقہ کا رُخ راہِ عدم کی طرف موڑ دیا، میں نے مانا کہ اُسے دوستوں کی خاطر داشت منظور نہ تھی۔ اپنے خُرد سال بچّوں کا بھی خیال نہ کیا اور ان کے سر سے اپنا سایہ سمیٹ لیا افسوس ہے ان دوستوں پر جو اپنے ایک ایسے دوست کی دوستی سے محروم ہوگئے۔ دل تڑپ اُٹھتا ہے اُن یتیم بچّوں پر جن کے سر سے باپ کا سایہ اُٹھ گیا۔

ہر چند موت پر رویا نہیں جاسکتا اور ہستی کے تار و پود کے بکھر جانے پر کوئی چارہ سازی ممکن نہیں لیکن انصاف بالائے طاعت ہے۔ یہ مرزا احمد کے مرنے کا وقت نہیں تھا اس نے اتنا بھی صبر نہ کیا کہ میں کلکتہ پہنچ جاتا اور اس کے روئے نظارہ فروز کو ایک بار اور دیکھ لیتا اس نے اتنا بھی توقف نہ کیا کہ (اس کا بیٹا) حامد علی جوان ہوجاتا اور اپنے اندازۂ دانش کے مطابق معاملات سے عہدہ برآ ہوسکتا۔

افسوس کہ اس کا بڑا بیٹا بھی بہت چھوٹا ہے اور عین ممکن ہے کہ اپنے باپ کا اثاثہ (سرمایہ) سے بھی واقف نہ ہو اور اس لائق نہ ہو کہ جہاں جہاں اس کا روپیہ پڑا ہے اسے دوبارہ حاصل کرے اور یہ خطرہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ بعد وصول یابی کے جو سرمایہ فراہم ہو وہ اُسے بھی اپنی نادانی سے برباد کردے اور اپنے سے چھوٹے پر یہ ستم روا رکھے اور اس طرح اس کے چھوٹے بھائی کو اس کا کوئی حق نہ ملے۔

سچ یہ ہے کہ اس موقع پر کوئی امین اور حق شناس آدمی ہونا چاہیے کہ وہ زندگی کی اس راہ میں ان کی رہنمائی کرے اور جو بچے بے باپ کے رہ گئے ہیں ان کے سر پر ہاتھ رکھے۔ اللہ اس کو جزا دے جس نے یہ کہا تھا:

مرا باشد از دردِ طفلاں ، خبر
کہ در طفلی ، از سرَ برختم پدر

(میں یتیم بچوں کے درد کو سمجھتا ہوں کہ بچپن میں میرے باپ کا سایہ بھی میرے سر سے اُٹھ گیا تھا)

واللہ کہ ان بیچاروں کا خیال فرض بلکہ فرض عین ہے آپ اور مرزا ابواسحاق خاں کو ان یتیموں کے حال پر نظرِ شفقت رکھنی چاہیے اور ذرا بھی غافل نہ ہونا چاہیے۔ایزدتعالیٰ احسان کرنے والوں کے اجر کو کبھی ضائع نہیں کرتا۔والسّلام (فارسی سے ترجمہ)

ملاحظہ ہو:

معاصرِ غالب، ص ۱۹۳، ص ص ۱۱۳۔۱۱۴۔علم و عمل، ص ۱۴۴۔۔پنج آہنگ، ص ۵۲۔سخن شعرا، ص۳۰۲۔تذکرہ سراپا سخن، ص ص ۱۲۴۔۱۲۵

عاشق علی خاں، منشی

جس طرح مرزا افضل بیگ کلکتے میں دہلی حکومت کے سفیر تھے۔اسی طرح منشی عاشق علی خاں اودھ حکومت کے سفیر تھے۔خط کے ذریعے مولوی محمد علی خاں نے غالب سے اُن کا تعارف کرایا تھا۔ عاشق علی خاں نے اپنے ملازم کے ہاتھ غالب کو خط بھیج کر پوچھا کہ وہ کب ملنے آسکتے ہیں۔ غالب نے خط کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا اور دوسرے دن خود منشی عاشق علی خاں سے ملاقات کو چلے گئے۔ غالب کی اُن سے پہلے بھی ملاقات ہو چکی تھی بلکہ نواب علی اکبر خاں کے مکان پر اُن سے گلے ملنے کا بھی اتفاق ہو چکا تھا۔غالب ابھی کلکتے ہی میں تھے

کہ منشی عاشق علی خاں کو لکھنؤ واپس بلالیا گیا اور اس عہدۂ سفارت پر فیض آباد کے حکیم ظفر علی خاں کا تقرر رہوا۔

ملاحظہ ہو:

نامہ ہائے فارسی غالب، کئی خطوط میں ان کا ذکر ہے۔

عبدالکریم، مولوی

مولوی عبدالکریم غالبؔ کے کلکتے کے ایک عزیز دوست سراج الدین احمد کے چچا تھے۔ ان کا آبائی وطن لکھنؤ تھا۔ ملازمت کے سلسلے میں کلکتے آ گئے اور طویل عرصے تک اسی شہر میں مقیم رہے۔ جن دنوں غالبؔ پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں کلکتے میں مقیم تھے، عبدالکریم بھی وہیں تھے اور گورنر جنرل کے دفتر خانۂ فارسی میں میر منشی کی حیثیت سے ملازم تھے۔ فارسی، عربی اور انگریزی تینوں زبانوں میں اچھی استعداد رکھتے تھے۔ دفتر میں فارسی میں جو درخواستیں موصول ہوتی تھیں، اُن کا انگریزی میں ترجمہ کر کے اعلا افسران کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔ بقول ڈاکٹر حنیف نقوی جب عبدالکریم کلکتے میں مقیم تھے، وہ شیخ احمد یمنی کی شائع کردہ عربی الف لیلیٰ (مطبوعہ ۱۸۱۴، ۱۸۱۸ء) کا مطالعہ کرنا چاہتے تھے لیکن انھیں یہ داستان نہیں مل سکی۔ جب وہ ریٹائر ہو کر لکھنؤ واپس آ گئے تو اتفاق سے انھیں انگریزی میں اس کتاب کا وہ ترجمہ مل گیا جو ۱۸۰۲ء میں فاسٹر نے کیا تھا۔ اس ترجمے کے کئی اڈیشن شائع ہوئے تھے۔ جی موائر بُسی (Bussey,G.Moir) نے اس ترجمے پر نظر ثانی کر کے مفصل تعارفی مقدمے کے ساتھ اس کا ایک اڈیشن ۱۸۳۹ء میں شائع کیا۔ ڈاکٹر حنیف نقوی کا خیال ہے کہ عبدالکریم نے اس داستان کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا تھا جو ۱۸۸۶ء میں لکھنؤ سے مطبع نجم العلوم سے 'شبستانِ سرور' کے نام سے شائع ہوا۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے اپنے مقالے میں 'شبستانِ سرور' کا اردو میں پہلی بار تفصیلی تعارف کرایا ہے۔ یہ مقالہ ۲۶/، ۲۷/ اور ۲۸/ دسمبر ۲۰۰۳ء کو غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے سمینار میں پڑھا گیا تھا اور ازراہِ کرم حنیف صاحب نے میری فرمائش پر اس مقالے کی ایک نقل مجھے عنایت فرمائی تھی۔ یہ مقالہ بہت جلد غالب انسٹی ٹیوٹ سے شائع ہونے والے 'غالب نامہ' میں شائع ہو جائے گا۔

ملاحظہ ہو:

نامہ ہائے فارسی غالب،

عبداللہ بیگ خاں، مرزا

یہ غالبؔ کے والد تھے۔ غالبؔ کے دادا قوقان بیگ خاں اپنے والد سے ناراض ہوکر عہدِ محمد شاہ میں سمرقند سے ہندوستان آگئے تھے۔ وہ پہلے نواب معین الملک عرف میر منو کے ملازم ہوئے اور ان کی وفات کے بعد دہلی آکر نواب ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خاں کے سرکار سے وابستہ ہوگئے۔ بقول مالک رام نواب ذوالفقار الدولہ ہی کے توسل سے وہ شاہ عالم کی سرکار میں پچاس گھوڑے اور نقارہ و نشان سے ملازم ہوگئے۔ انھیں حکومت کی طرف سے ایک سیر حاصل پرگنہ ہانسو بھی ملا جوان کی ذات اور رسالے کی تنخواہ کے لیے مقرر تھا۔ بعد میں پرگنہ بیگم سمرو کو دے دیا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ عبداللہ بیگ خاں لکھنؤ جاکر آصف الدولہ کے ملازم ہوگئے۔ کچھ عرصے بعد حیدرآباد چلے گئے اور سرکارِ آصفی میں کئی برس تک تین سو سوار کی جمعیت کے ساتھ ملازم رہے۔ ایک خانہ جنگی میں یہ ملازمت چلی گئی اور عبداللہ بیگ آگرے واپس آگئے۔ عبداللہ بیگ ملازمت کی تلاش میں الور گئے جہاں ایک گڑھی کے زمیندار نے بغاوت کردی۔ زمیندار کی سرکوبی کے لیے جو فوج گئی تھی اس میں عبداللہ بیگ خاں بھی شامل تھے۔ میدانِ جنگ میں انھیں گولی لگی اور وہ خدا کو پیارے ہوگئے۔ عبداللہ بیگ کی تدفین راج گڑھ میں عمل میں آئی۔

غالبؔ نے والیِ الور کے راجا شیودھان سنگھ کی مدح میں چالیس اشعار کا قصیدہ کہا تھا جس میں یہ شعر بھی شامل تھا:

کافی بود مشاہدہ، شاہد ضرور نیست
در خاکِ راج گڑھ پدرم را بود مزار

عبداللہ بیگ خاں کی وفات کے وقت غالبؔ کی عمر پانچ سال تھی۔

عبداللہ بیگ کی شادی آگرے میں مقیم خواجہ مرزا غلام حسین خاں کمیدان کی صاحب زادی عزت النسا بیگم سے ہوئی تھی۔ عبداللہ بیگ خانہ داماد تھے۔ سسرال میں انھیں مرزا دولھا کہا جاتا تھا۔ یہ سسرال میں رہتے تھے۔ ان کی بیوی ہمیشہ میکے میں رہیں۔

ملاحظہ ہوں:

ذکرِ غالب: ص ص ۲۱۔۲۲

عزت النسا بیگم

غالبؔ کے والد مرزا عبداللہ بیگ کی شادی آگرے میں مقیم خواجہ مرزا غلام حسین کمیدان کی صاحب زادی عزت النسا بیگم سے ہوئی تھی۔ چوں کہ عبداللہ بیگ خانہ داماد تھے اس لیے ان کی بیوی ہمیشہ میکے ہی میں رہیں۔ مالک رام صاحب نے لکھا ہے کہ

''میرے خیال میں عزت النساء بیگم ۱۸۴۰ء تک زندہ رہیں۔'' مالک رام نے یہ بھی بتایا ہے کہ عزت النساء بیگم لکھنا پڑھنا جانتی تھیں اور خانگی معاملات میں بذاتِ خود خاصی دل چسپی لیتی تھیں۔

ملاحظہ ہو: ذکرِ غالب، ص ۲۴

علی اکبر خاں، سید

علی اکبر خاں نواب طباطبائی، سید علی خاں طباطبائی 'سیر المتاخرین' کے مصنف تھے۔ سید اکبر علی خاں ان کے بھتیجے تھے۔ 'بزمِ غالب' میں عبدالرؤف عروج نے ان کا نام سہواً اکبر علی خاں لکھا ہے جب کہ ان کا صحیح نام علی اکبر خاں ہے۔ علی اکبر خاں 'سیر المتاخرین' کے مصنف غلام حسین طباطبائی کے بھتیجے اور سید علی تقی کے صاحب زادے تھے۔ یہ تقریباً ۱۱۴۲ھ (۱۷۲۹ تا ۱۷۳۰ء) میں دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ غالبؔ جب باندے سے کلکتے کے لیے روانہ ہوئے تو مولوی محمد

علی صدرِ امین باندہ نے انھیں علی اکبر خاں کے نام ایک تعارفی خط دیا تھا۔ غالبؔ جب کلکتے پہنچے تو دو دن آرام کر کے وہ سب سے پہلے جن صاحب سے ملنے کے لیے گئے وہ علی اکبر خاں ہی تھے۔ غالبؔ علی اکبر خاں کے گھر پہنچ کر پہلے اس مقام پر گئے جہاں سید الشہدا علیہ التحیہ و الثنا کی ضریح رکھی ہوئی تھی غالبؔ زیارت کے بعد وہاں پہنچے جہاں نواب صاحب بیٹھے تھے۔ غالبؔ کو دیکھتے ہی نواب صاحب کھڑے ہو گئے اور فرمانے لگے کئی دن سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ معلوم ہوا کہ لوگ غالبؔ کا نواب صاحب سے پہلے ہی تعارف کرا چکے تھے۔ دو تین گھنٹے بیٹھ کر غالب واپس آ گئے اور دو روز کے بعد پھر گئے اور اس دفعہ دو دن اور ایک رات نواب صاحب کے ساتھ قیام کیا۔ غالبؔ نے اپنے کلکتے آنے کا مقصد بتایا۔ نواب صاحب نے غالبؔ کی مدد کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ اُنھوں نے بتایا کہ جو زمین امام باڑے کے لیے وقف ہے اس پر کلکٹر کے ساتھ جھگڑا ہو رہا ہے اور یہ جھگڑا کافی بڑھ گیا ہے۔ غالب کے قیامِ کلکتہ کے دوران نواب صاحب ان کی کوئی مدد نہیں کر سکے۔

غلام حسین طباطبائی کی تصنیف 'سیر المتاخرین' سے پتا چلتا ہے کہ علی اکبر خاں کے آبا و اجداد کا اصل وطن مدینہ طیبہ تھا جہاں سے اُنھوں نے مشہدِ مقدس کی طرف ہجرت کی۔ چند سال وہاں رہنے کے بعد دہلی آ گئے۔ علی اکبر خاں کے والد کا نام علی تقی تھا اور 'سیر المتاخرین' کے مصنف غلام حسین طباطبائی کے بھائی تھے۔

غالبؔ نے محمد علی خاں کے نام ایک خط میں علی اکبر خاں کے بارے میں لکھا تھا' کافر ہوں جو میں نے لطافتِ طبع نزاکتِ ادا ،حسنِ بیان ،فہمِ درست اور مشرب صافی والا کوئی ایسا بزرگ امیر دہلی سے لے کر کلکتے تک میں کبھی دیکھا ہو۔ نواب صالح بھی ہیں اور مصلح بھی۔'' محمد علی خاں کے نام اور خط میں غالبؔ نے علی اکبر خاں کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''جناب نواب سیّد علی اکبر خاں طباطبائی کے اخلاق کی توصیف کیا کی جائے۔ خدا اُن کے سائے کو دوام بخشے اور اُن کا اقبال ہمیشہ قائم رہے۔ اس خدا کی قسم ، جس نے عقل کو پیدا کیا اور خرد کو انتخاب کیا اس ارزش مندی اور صاحب دلی کے رتبے پر بنگال میں کوئی اور نہیں۔ میں جب کبھی اس پسندیدہ آفریدگار کے ظاہر اور باطن پر غور کرتا ہوں تو حیرت میں ڈوب جاتا ہوں کہ یہ قیمتی موتی کس کان کا ہے اور یہ اعلا نسب کس خاندان سے ہے یہ ایسی شفقت کا اظہار کرتے ہیں جس کی شرح زبان سے ممکن نہیں۔

ملاحظہ ہوں:

نامہ ہائے فارسی غالب، ص ۸۹۔۹۱ اور ص ۱۱۲۔۔ بزمِ غالب، ص ص ۴۶۔۴۷۔۔
سیر المتاخرین ص ص ۱۰۵۔۱۰۶۔۔ آثارِ غالب، ص ص ۱۹۰۔۱۹۱۔۔۔

غازی الدین حیدر

اودھ کے نواب سعادت علی خاں کے ۹ صاحب زادے تھے۔ان میں سب سے بڑے نواب غازی الدین حیدر خاں عرف بڑے مرزا تھے۔ غازی الدین حیدر کا پورا نام رفیع الدولہ، رفیع الملک غازی الدین حیدر خاں شہامت جنگ تھا۔ یہ ۲۴ر اگست ۱۷۷۴ء کو اتر پردیش کے بسولی مقام پر پیدا ہوئے۔ ۱۱ر جولائی ۱۸۱۴ء کو نواب سعادت علی خاں کی وفات کے بعد ان کے دو صاحب زادوں میں نے اودھ کی نوابی کا دعویٰ کیا۔ایک تو سب سے بڑے صاحب زادے ہونے کی وجہ سے نواب غازی الدین حیدر خاں اور دوسرے نواب سعادت علی خاں کے بیٹے نواب احمد علی خاں المخاطب بہ شمس الدولہ نجم الملک صولت جنگ۔ انھیں نواب سعادت علی خاں نے اپنی زندگی ہی میں اپنا نائب اور ولی عہد مقرر کر دیا تھا لیکن نواب احمد علی خاں کی کوششوں کے باوجود اودھ کے ریذیڈنٹ کرنل جان بیلی نے غازی الدین حیدر ہی کو اودھ کے نواب کے عہدے پر فائز کیا۔ ۹ر اکتوبر ۱۸۱۹ء کو غازی الدین حیدر نے خود کو دہلی کی حکومت سے آزاد کر کے اور اودھ کی نوابی کو سلطنت میں بدلنے کا اعلان کر دیا اور نواب کے بجائے بادشاہ بن گئے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ غازی الدین کی جانشینی کا یہ فیصلہ نواب سعادت علی خاں کی لاش کے پاس ہوا۔ سعادت علی خاں کی وفات ۱۱ر جولائی ۱۸۱۴ء کو ہوئی۔

غازی الدین حیدر کی مسند نشینی ۲۴ر جون ۱۸۱۴ء کو عمل میں آئی۔ غازی الدین حیدر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بہت فیاض اور فضول خرچ تھے۔ ناچ رنگ، تماشوں اور عیاشیوں پر روپیہ پانی کی طرح بہاتے تھے۔ لیکن ان کی فیاضی اور فضول خرچ سے غالب کو کوئی فیض حاصل نہیں ہوا۔ معتمد الدولہ نے غالب سے ان کی ملاقات بھی نہیں ہونے دی۔ ۱۹ر اکتوبر ۱۸۲۷ء کو غازی الدین حیدر کا انتقال ہو گیا۔ وہ لکھنؤ میں اپنے تعمیر کیے ہوئے امام باڑے میں مدفون ہوئے۔

ملاحظہ ہوں:

تاریخِ اودھ جلد چہارم، ص ص ۱۰۵۔۲۰۶

***

غلام حسین کمیدان، خواجہ

غالبؔ کے نانا تھے۔ سہارنپور میں فوجی ملازمت کے سلسلے میں مقیم تھے۔ آگرے میں اُن کی جائداد تھی اور یہیں اُن کی مستقل سکونت تھی۔ پروفیسر مسعود حسین خاں نے خواجہ غلام حسین کمیدان کے بارے میں لکھا ہے کہ اگر خواجہ غلام حسین کمانڈنٹ تھے تو فرانسیسی فوج کا یہ عہدہ برطانوی فوج کے کمانڈنگ آفیسر یا میجر کے برابر تھا۔ اس اعتبار سے خواجہ غلام حسین صرف میجر تھے اور اُن کے ساتھ تموّل اور ثروت کو منسوب کرنا زیادہ صحیح نہیں۔ بقول مسعود صاحب اگر خواجہ غلام حسین کا منصب صرف کمودان نہیں بلکہ Commandant De Place تھا تو اُن کی حیثیت یقیناً گورنر کی تھی۔ ممکن ہے ان کا عہدہ کمیدان قلعہ ہو تو وہ صاحبِ ثروت و دولت تھے۔

ملاحظہ ہوں:

مشمولہ علی گڑھ میگزین، غالب نمبر، ص ۱۴

***

فضل حق خیرآبادی

علامہ فضل حق خیرآبادی ۱۲۱۲ھ (مطابق ۹۷-۱۷۹۸ء) میں اپنے آبائی وطن خیرآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباؤ اجداد میں دو بھائی بہاء الدین اور شمس الدین بھی عالم تھے۔ یہ دونوں ایران سے ہندوستان آئے تھے۔ شمس الدین مسندِ افتاءِ رہتک پر فائز ہوئے۔ شاہ ولی اللہ ان ہی کے خاندان سے تھے۔ بہاء الدین بدایوں کے مفتی بنائے گئے۔ ان کے والد مولانا فضل امام خیرآبادی کا شمار اپنے عہد کے ممتاز علما میں ہوتا تھا۔ مولانا فضل امام دہلی میں صدر الصدور کے عہدے پر فائز تھے۔ مولانا فضل حق خیرآبادی نے شاہ عبدالقادر محدث اور شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی سے منقولات کی تحصیل کی۔ مفتی صدر الدین آزردہ مولانا فضل حق خیرآبادی کے

ہم سبق تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اتنے ذہین تھے کہ اُنھوں نے تیرہ سال کی عمر میں مرّوجہ علومِ عقلیہ ونقلیہ کی تکمیل کرلی تھی۔ حافظے کا یہ حال تھا کہ چار مہینے اور کچھ دن میں قرآن شریف حفظ کرلیا۔ ۱۸۱۵ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم ہوگئے۔ ۱۸۳۱ء تک اس ملازمت کا سلسلہ برقرار رہا۔

کچھ دن بعد ریاست جھجھر میں ملازمت کرلی۔ کچھ عرصے بعد مہاراجہ الور نے بلالیا۔ مولانا فضل حق خیرآبادی کسی ایک جگہ ٹک کرنہیں بیٹھ سکتے تھے۔ اس لیے کچھ ہی عرصے بعد سہارن پور چلے گئے۔ دو سال تک اس شہر میں کسی بڑے عہدے پر فائز رہے۔ پھرٹونک چلے گئے اور وہاں سے رام پور آگئے۔ نواب یوسف علی خاں نے مولانا فضلِ حق خیرآبادی کا تلمذ اختیار کرلیا۔ نواب کلب علی خاں بھی ان کے شاگرد رہے۔ رام پور کے محکمۂ نظامت اور مرافعۂ عدالتیں سے منسلک رہے۔ آٹھ برس بعد رام پور سے صدرالصدور کی حیثیت سے لکھنؤ چلے گئے۔ حکومت کے اہم عہدوں پر فائز رہے۔ علامہ فضل حق خیرآبای اور مرزا غالب میں بہت گہری دوستی تھی۔

مولانا فضل حق ۱۸۵۷ء میں بغاوت کے الزام میں گرفتار ہوئے۔ مقدمہ چلا۔ کالے پانی کی سزا ہوگئی اور جزیرہ انڈمان بھیج دیے گئے۔ وہیں ۱۲۷۸ھ (مطابق ۱۸۶۱۔۱۸۶۲ء) میں انتقال ہوا۔

ملاحظہ ہو۔ باغی ہندوستان، ص ص ۱۲۱۔۱۵۷

فضل مولیٰ خاں، میر

یہ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ نسّاخ نے 'سخن شعرا' میں لکھا ہے کہ اُنھوں نے دہلی کا سفر بھی کیا۔ جب غالب کلکتے کے سفر کے دوران مرشدآباد پہنچے تو یہ وہیں میر فضل مولیٰ خاں سے ملاقات ہوئی۔ اُنھوں نے ہی غالب کو احمد بخش خاں کی وفات کی خبر دی تھی۔

مولوی عبدالقادر رام پوری کا بیان ہے کہ میر فضل مولیٰ خاں نواب مرشدآباد کے مصاحبوں میں شامل ہوگئے تھے۔ عین جوانی میں انتقال ہوگیا۔ شعرگوئی کا ذوق تھا۔ نسّاخ کا بیان ہے کہ وہ دوسروں کے شعر اپنے نام سے پڑھ دیتے تھے۔

سخن شعرا۔ص ۳۶۸۔بزم غالب، ص ص ۳۰۸۔۳۰۹، ریاض الوفاق، ص ۷۰

غالبؔ کا خط بنام مرزا علی بخش، اوراقِ معانی

※※※※※※※※

کرم علی، میر

غالبؔ کے باندے کے دوستوں میں تھے۔ اُن سے غالبؔ کی پہلی ملاقات باندے ہی میں ہوئی۔محمد علی خاں کے نام غالبؔ کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر کرم علی نواب باندے دربار سے منسلک تھے یا نواب کے دوستوں میں تھے۔غالب نواب باندہ کے توسط سے باندے سے امی کرن، سے دو ہزار روپے قرض لے کر آئے تھے۔ کلکتے میں جب مالی دشواری کا شکار ہوئے تو اُنھوں نے چاہا کہ نواب صاحب سے ایک ہزار روپے مزید قرض مانگیں۔غالبؔ نے نواب صاحب کو لگا تار پانچ خط لکھے مگر کسی ایک کا بھی جواب نہیں آیا۔اس لیے غالبؔ کو قرض مانگنے کی ہمت نہیں پڑی۔اُنھوں نے محمد علی خاں کو خط لکھا کہ وہ میر کرم علی کو بلا کر اُن سے تنہائی میں معلوم کریں کہ نواب صاحب اور اُن کے اقربا کا غالبؔ کے بارے میں کیا خیال ہے یعنی اگر غالبؔ نواب صاحب سے ایک ہزار روپے قرض مانگیں تو وہ انکار تو نہیں کر دیں گے۔اسی بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر کرم علی نواب باندہ کے قریبی لوگوں میں تھے۔

ملاحظہ ہو:

نامہ ہاے فارسی غالب

※※※※※※※※

محمد علی

محمد علی متخلص علی۔ یہ مرزا احمد علی طپاںؔ کے دوسرے بیٹے تھے اور شاعر تھے۔'سراپا سخن' میں سید محسن علی موسوی نے لکھا ہے کہ محمد علی کلکتے میں پیدا ہوئے وہیں تربیت پائی۔اپنے والد احمد علی بیگ طپاںؔ سے کسبِ سخن کیا، لیکن لکھنؤ جا کر خواجہ محمد وزیر شاگردِ ناسخؔ سے دو چار غزلوں پر

اصلاح لی۔ صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ ۱۲۷۶ھ (۱۸۵۹ء۔۱۸۶۰ء) میں مدینہ منورہ ہجرت کر گئے۔ جب غالبؔ کلکتے میں تھے تو محمد علی کی بسم اللہ کی تقریب ۸رشعبان ۱۲۴۳ھ کو کلکتے میں منعقد ہوئی تھی، جس کے بارے میں غالب نے طپاںؔ کو ایک خط لکھا تھا جو'متفرقاتِ غالب' میں شامل ہے۔

ملاحظہ ہو:

مآثرِ غالب، ص ص ۱۱۳۔۱۱۴، سراپا سخن، ص ۴۔۱۱، متفرقاتِ غالب

مرزا مغل

غالبؔ نے محمد علی خاں کے نام چلّہ تارا سے جو خط بھیجا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ باندہ میں مرزا مغل نے فرمایا تھا کہ چلّہ تارا سے محمد علی خاں کے نام کا خط چلّہ تارا کے تھانہ دار کو دے دیجیے۔ وہ مولوی محمد علی خاں کو پہنچادیں گے۔ سید اکبر علی ترمذی نے 'نامہ ہائے فارسی غالب' میں لکھا ہے کہ مرزا جواد علی بیگ المعروف مرزا مغل غالبؔ کے بھانجے یعنی چھوٹی خانم کے صاحب زادے تھے۔ نامہ ہائے فارسی میں مرزا مغل کا نام دوبار آیا ہے۔ مرزا مغل اور دوسری بار مرزا مغل ہے۔ قاضی صاحب کا خیال ہے کہ اگر مرزا مغل اور مرزا مغل بیگ ایک ہی ہیں تو مغل بیگ غالبؔ کے بھانجے نہیں ہو سکتے، اس لیے کہ مرزا مغل بیگ مرزا غالب کے ماموں کے بیٹے کے برادرِ بزرگ تھے۔

ملاحظہ ہوں:

نامہ ہائے فارسی غالب، ص xxii۔۔ جہاں غالب، ص ۱۹۵

مرزا یوسف

غالبؔ نے ان کا ذکر میر مہدی مجروحؔ، نواب یوسف علی خاں، محمد علی خاں اور بعض دوسرے مکتوب الیہم کے نام خطوط میں کیا ہے۔ یہ غالب کے چھوٹے بھائی تھے۔ ۱۷۹۹ء کے اواخر یا

۱۸۰۰ء کے اوائل میں آگرے میں پیدا ہوئے۔ سپاہی پیشہ تھے۔ بقولِ نواب آغا مرزا بیگ 'افواجِ قاہرہ دولتِ آصفیہ میں نہایت مقتدر عہدے پر سرفراز تھے۔ کسی دشمن نے ایسا جادو کیا یا ایسی دوا کھلا دی کہ مجنونِ محض ہو گئے۔ تا وقتِ انتقال مجنوں رہے۔"

نواب آغا مرزا بیگ خاں بہادر نے لکھا ہے کہ

"میری خوشدامن مرزا یوسف کی صاحب زادی اور غالبؔ کی بھتیجی تھیں۔"

آغا صاحب نے اپنی خوشدامن کا نام عزیز النساء بیگم بتایا ہے۔

کلکتے سے غالبؔ نے محمد علی خاں کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ:

"میرے چھوٹے بھائی مرزا یوسف کو اپنے جسم و جان کا ہوش نہیں ہے۔ مادر زاد ننگے رہتے ہیں۔ چوں کہ اُن پر جنون سوار ہے، اس لیے ایک جگہ نہیں بیٹھ سکتے۔ نہ ماں کو ماں سمجھتے ہیں نہ بہن کو بہن۔"

غالبؔ نے 'نامہ ہائے فارسی غالب' کے ایک خط میں لکھا ہے کہ:

"ستائیسویں رمضان کو اُنھیں دہلی سے ایک خط ملا۔ جب اُنھوں نے لفافہ کھولا تو اس میں سے اُن کے چھوٹے بھائی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر نکلی۔ اس تحریر میں اُنھوں نے باقاعدہ القاب و آداب لکھے تھے اور پوری ہوشمندی سے یہ تحریر لکھی گئی تھی۔ غالبؔ کا کہنا ہے کہ وہ خوشی سے اُچھل پڑے اور ناچنے لگے اور فرطِ مسرت سے زار و قطار رونے لگے۔ اُنھیں کچھ ہوش آیا تو اُنھوں نے اس لفافے میں رکھا ہوا دوسرا خط پڑھا۔ یہ اُن کی بیوی کا تھا۔ اُنھوں نے اطلاع دی تھی کہ 'غالب کے دہلی سے جانے کے بعد مرزا یوسف دن رات چیخ پکار اور مار پیٹ کرتے تھے۔ اُن ہی دنوں میں بادشاہ کے فیل بانوں میں سے ایک فیل بان محل کی ایک خادمہ کے ذریعے اُن تک پہنچا۔ اس نے مرزا یوسف کا علاج شروع کیا اور بتایا کہ ان پر کسی نے جادو کر رکھا ہے اور اس کی کچھ نشانیاں یہ بتائیں کہ شہر پناہ کے باہر ایک درخت ہے۔ اُس کی جڑ کھودو اور وہاں ایک کنواں ہے اُسے تلاش کرو۔ وہاں کھدائی کی

> گئی تو جو نشانیاں بتائی تھیں وہ سب برآمد ہوئیں۔ پانچ مہینے علاج ہوا اور مرزا یوسف کی دو حصّے بیماری دفع ہوگئی۔ اب اتنا ہوش ہے کہ کپڑے پہنتے ہیں، ستر پوشی کا خیال رکھتے ہیں۔ بیوی، بیٹی اور ماں سے وہی رشتہ قائم رکھتے ہیں جو ہے۔'' (فارسی سے ترجمہ)

غالبؔ ، مرزا یوسف کے متعلق اس خبر سے بے انتہا خوش تھے لیکن جب وہ دہلی آئے تو معلوم ہوا کہ اُن کی حالت بدستور خراب ہے بلکہ پہلے سے بھی زیادہ خراب ہے۔

مرزا یوسف سرس کی گلی میں رہتے تھے۔ اُن کی بیوی اور خاندان کے دوسرے افراد اُن کے پاس ایک بوڑھے ملازم اور ایک بوڑھی ملازمہ کی نگرانی میں مرزا یوسف کو چھوڑ کر جے پور چلے گئے۔ ۳۰ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو کچھ انگریزی فوجی مرزا یوسف کے گھر میں گھس گئے اور سارا سازوسامان لوٹ کر لے گئے۔ مرزا یوسف اور اُن کے ملازموں کو کچھ نہ کہا۔ غالبؔ نے اپنے روزنامچہ 'دستنبو' میں لکھا ہے کہ

مرزا یوسف پانچ دن بخار میں مبتلا رہ کر ۱۹ر اکتوبر ۱۸۵۷ء کو انتقال کر گئے لیکن معین الدین حسن خاں مصنف 'خدنگِ غدر' نے لکھا ہے کہ

> ''مرزا یوسف جنون کی حالت میں گھر سے باہر نکل آئے تھے کہ کسی نے اُنھیں گولی ماردی۔'' (فارسی سے ترجمہ)

یہ ۲۹ر صفر ۱۲۷۴ھ کا واقعہ ہے۔ جب مرزا یوسف کے انتقال کی غالبؔ کو خبر ملی تو ایک طرف سگے بھائی کے انتقال کا غم اور دوسری طرف یہ پریشانی کہ اُنھیں کہاں اور کیسے دفن کیا جائے۔ غدر کی وجہ سے شہر میں سناٹا تھا۔ کفن، غسّال اور گورکن کہیں مہیّا نہیں تھے۔ چند پڑوسیوں نے غالبؔ کی مدد کی اور دو تین پرانی سفید چادروں میں مرزا یوسف کی لاش کو لپیٹ کر پٹیالہ کے ایک سپاہی کو آگے کر کے مکان کی قریب مسجد تہوّر خاں میں دفن کر دیا۔ اب اُن کی قبر کا کہیں نشان نہیں ملتا۔

غالبؔ سے کسی نے مرزا یوسف کی تاریخِ وفات پوچھی تو بقول غالبؔ 'میں نے ایک آنکھ میچی اور کہا ''دریغ دیوانہ''۔ ''دریغ دیوانہ'' سے ۱۲۹۰ھ کا عدد حاصل ہوتا ہے۔ اس میں سے اگر آ 'ہے' کے ۱۶ عدد نکال دیے جائیں تو مطلوبہ تاریخ یعنی ۱۲۷۴ھ برآمد ہوتی ہے۔

غالبؔ کی طرح مرزا یوسف کو بھی ساڑھے باسٹھ روپے ماہانہ پینشن ملتی تھی۔ اُن کی وفات کے

بعد اُن کی بیگم لاڈو بیگم کو یکم اکتوبر ۱۸۶۲ء سے بیس روپے ماہوار پینشن ملنے لگی۔ مرزا یوسف کی ایک ہی بیٹی عزیز النسا بیگم تھیں۔ اُن کی شادی غلام فخر الدین سے ہوئی۔ فخر الدین مرزا علی بخش کے بیٹے اور نواب الٰہی بخش خاں معروف کے بیٹے (یا پوتے) تھے۔

ملاحظہ ہو:

فسانۂ غالب، ص ص ۴۸۔۵۱۔۔ دستنبو (صد سالہ یادگار اڈیشن) ص ۲۳ اور ص ۲۷۔۔ خدنگِ غدر، ص ۸۴۔۔ کارنامۂ سروری، ص ۱۹۔۔ غالب اور شاہانِ تیموریہ، ص ص ۱۰۱۔۱۰۲۔۔ بزمِ غالب، ص ص ۴۱۲۔۴۱۴۔۔ کارنامۂ سروری، ص ۱۹۔۔ احوالِ غالب، ص ۸۷۔۔ غدر کے صبح و شام، ص ۸۸۔۔ غدر کا نتیجہ، ص ۶۵

معتمد الدولہ، نواب سید محمد خان بہادر عرف آغا میر

سید محمد تقی کے صاحب زادے اور فیض آباد کے رہنے والے تھے۔ ڈاکٹر انصار اللہ کا خیال ہے کہ معتمد الدولہ ۱۱۸۵ھ مطابق (۱۷۷۱ء۔۱۷۷۲ء) کے آس پاس پیدا ہوئے تھے۔ جب لکھنؤ آباد ہونا شروع ہوا تو یہ خاندان بھی لکھنؤ آ گیا۔ سید محمد خاں آغا میر نواب سعادت علی خاں کے بڑے صاحب زادے غازی الدین حیدر کے پیش خدمتوں کے زُمرے میں ملازم تھے۔ کچھ عرصے میں ترقی کر کے آغا میر (معتمد الدولہ) خانساماں کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ نواب سعادت علی خاں نے جب غازی الدین حیدر کو اپنا ولی عہد مقرر کیا تو آغا میر کا عہدہ بھی بڑھ گیا۔ نواب سعادت علی خاں کی وفات کے بعد غازی الدین حیدر مدارالمہام کے عہدے پر فائز ہوئے۔ غازی الدین حیدر نے آغا میر کو مدارالمہام، نواب، خاں بہادر کے خطابات سے نوازا۔ کچھ عرصے بعد آغا میر کو عہدہ نیابت ملا اور بائیس پارچے کا خلعت ملا اور معتمد الدولہ کا خطاب عطا ہوا۔ اودھ کا دربار سازشوں کا گڑھ بنا ہوا تھا اور معتمد الدولہ فرخ آباد گئے ہوئے تھے۔ اُن کے بھائی میر روش علی غریب لوگوں پر طرح طرح کے ظلم کرتے تھے۔ اُنھوں نے معتمد الدولہ کے غریبوں کے کئی محلے کھدوا کر شہر کے بالکل بیچوں بیچ معتمد الدولہ کی عالی شان عمارتیں تعمیر کیں۔ فرخ آباد کے سفر میں بھی معتمد الدولہ نے بعض قابلِ اعتراض حرکتیں کیں۔ جب معتمد الدولہ فرخ آباد سے واپس آئے تو نواب غازی الدین حیدر نے انھیں گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ سبحان علی خاں کی کوششوں سے صلح صفائی ہوئی اور معتمد الدولہ

۱۸۱۶ء میں بحال ہوگئے۔ معتمد الدولہ نے پوری کوشش کر کے غازی الدین حیدر کے مزاج میں بہت دخل حاصل کرلیا۔ حکیم نجم الغنی خاں نے لکھا ہے کہ "بادشاہ ہر وقت غیظ و غضب کی حالت میں مکّوں اور لاتوں سے ان (آغا میر) کی خبر لیتے رہتے تھے اور معتمد الدولہ کی وفاداری کا یہ عالم تھا کہ ہرگز برا نہ مانتے۔ ان کی ستم شعاریوں اور ذلتوں کو ہنس ہنس کر برداشت کرتے تھے۔ انھیں انگریزی حکّام میں بھی بہت رسوخ تھا۔ غازی الدین حیدر کو دہلی کی حکومت سے آزاد کر کے بادشاہ بنانے کی تجویز لارڈ ہیسٹنگز کی تھی مگر اس تجویز کو عملی جامعہ معتمد الدولہ ہی نے پہنایا۔ غازی الدین حیدر کے بادشاہ بننے کے بعد معتمد الدولہ وزیر اعظم کے عہدے پر فائز ہوئے۔ روز بروز ان کے مراتب اور خطابات میں اضافے ہوتے رہے۔ ان کا پہلا خطاب تھا۔ 'عمدۃ الامرا۔ مدار المہام، نواب معتمد الدولہ، مختار الملک، سید محمد خاں بہادر، ضیغم جنگ فدوی خاصِ بادشاہِ غازی۔ دوبارہ جو خطاب ملا وہ تھا "نواب معتمد الدولہ، مختار الملک، سید محمد خاں بہادر، ضیغم جنگ وزیر اعظم، یار وفادار، سپہ سالار فدوی جاں نثارِ شاہ زمن، بادشاہِ غازی خلد اللہ ملکہٗ۔ تیسری بار پھر ان خطابات میں اضافہ کیا گیا۔ اس دفعہ خطاب تھا۔ "عمدۃ الامرا، مدار المہام، وزیر الممالک، نواب معتمد الدولہ، مختار الملک، سید محمد خاں بہادر ضیغم جنگ وزیر اعظم، فرزند ارجمند، یارِ وفادار، سپہ سالار، فدویِ جاں نثارِ شاہ زمن بادشاہِ غازی خلد اللہ ملکہ۔

۱۹/اکتوبر ۱۸۲۷ء کو غازی الدین حیدر کا انتقال ہوا اور نصیر الدین حیدر تخت نشین ہوئے۔ معتمد الدولہ نے غازی الدین حیدر کے زمانے میں غریبوں پر بہت ظلم کیے تھے۔ ایک صاحب تھے۔ میر فضل علی یہ غازی الدین حیدر کی بیوی بادشاہ بیگم کی جاگیر کے منتظم اور بہن بی مغلانی کی وجہ سے سرکار میں پورا تسلط رکھتے تھے اور معتمد الدولہ اُن کے دشمن تھے اور اُنھوں نے میر فضل علی کو لکھنؤ سے نکلوا کر کانپور بھجوا دیا تھا۔ یہ بات نصیر الدین حیدر کو سخت ناگوار گزری تھی۔ ایک دن موقع پا کر بادشاہ نے انگریزوں کی مدد سے معتمد الدولہ کو گرفتار کرا دیا۔ اس واقعے کی پوری تفصیل ڈاکٹر انصار اللہ نے، معتمد الدولہ، آغا میر 'اسلاف و اخلاف' میں بیان کی ہے۔ میر فضل علی کو خلعتِ نیابت بائیس پارچے کا ملا اور اعتماد الدولہ کے خطاب سے نوازے گئے۔ میر فضل علی نے اعتماد الدولہ سے بدلہ لینے کی پوری کوشش کی۔ آغا میر دو ڈھائی برس تک انگریز رسالوں کی نگرانی میں لکھنؤ میں اپنے ذاتی مکان میں قید رہے۔ معتمد الدولہ کو نصیر الدین حیدر نے قید سے آزاد کر دیا۔ ریذیڈنٹ نے معتمد الدولہ سے بیس لاکھ روپے بادشاہ کو دلا کر اس بات پر راضی کرلیا کہ وہ اپنے تمام نقد و جنس کے ساتھ کانپور چلے جائیں گے۔ چالیس چھکڑوں پر اپنا سامان لدوا کر معتمد الدولہ ۷/اکتوبر ۱۸۲۹ء کو کانپور چلے گئے۔

۷رمئی ۱۸۳۲ء کو معتمد الدولہ کا کانپور میں انتقال ہو گیا۔

غالبؔ جب کلکتے جا رہے تھے تو کانپور کے قیام کے دوران بیمار پڑ گئے۔ اس شہر میں کوئی معالج نہ ملنے پر وہ لکھنؤ چلے گئے جہاں لگ بھگ چھ مہینے قیام کیا۔ غالب نے بادشاہِ اودھ کے دربار میں حاضر ہونے کی کوشش کی۔ اس کا ذریعہ صرف معتمد الدولہ تھے۔ غالبؔ بھیک بھی مانگتے تھے تو اپنی شرط پر۔ معتمد الدولہ سے اُن کی ملاقات طے ہو گئی تھی لیکن غالب نے یہ شرط رکھی کہ معتمد الدولہ کھڑے ہو کر اُن کا استقبال کریں گے اور غالب نذر پیش نہیں کریں گے۔ معتمد الدولہ کو یہ شرائط منظور نہیں تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غالبؔ کی اُن سے ملاقات نہیں ہو سکی اور غالبؔ بے نیل و مرام لکھنؤ سے واپس آ گئے۔ معتمد الدولہ شاعروں کی سرپرستی میں کسی سے کم نہیں تھے۔ اگر غالب ملاقات کی یہ شرائط نہ رکھتے تو یہ صورتِ حال نہ پیش آتی۔

غالبؔ نے لکھنؤ میں معتمد الدولہ کی مدح میں ایک سو دس اشعار کا ایک قصیدہ بھی کہا تھا ، جب معتمد الدولہ سے بگڑ گئی تو کچھ عرصے بعد غالب نے شاہِ اودھ نصیر الدین حیدر کو اس کا ممدوح قرار دے دیا۔ جب غالبؔ لکھنؤ میں تھے تو اپنے دو دوستوں سبحان علی خاں اور میر نیاز حسین خاں کی ایما پر اُنھوں نے ۵راگست ۱۸۲۶ء کو صنعتِ تعطیل میں ایک عرض داشت لکھی جو غالباً معتمد الدولہ کو پیش نہیں کی جا سکی۔ غالبؔ نے لکھنؤ میں گیارہ اشعار کی ایک اردو غزل کہی تھی جس کے آخری تین شعر تھے:

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا، یعنی
ہوسِ سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو
مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے، یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو
لائی ہے معتمد الدولہ بہادر کی اُمید
جادۂ رہ ، کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

جب غالب معتمد والدولہ سے ناراض ہو گئے تو آخری شعر کے پہلے مصرعے سے معتمد الدولہ کا نام نکال کر مقطع کر دیا۔ 'دیوانِ متداول' اب میں یہ شعر اس طرح ملتا ہے:

لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ
جادۂ رہ، کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

ملاحظہ ہوں:

معتمد الدولہ، اسلاف و اخلاف۔ بزمِ غالب، ص ص ۴۰۔۴۲۔۔ تاریخِ اودھ (سوم)، ص ۱۱۸۔۱۱۹۔۱۳۷۔۱۳۹۔۔ کلیاتِ نثرِ غالب: ۶۵۔۱۵۷۔۔ غالب کے خطوط: ۱:۱۸۶۱ء۔۔ کلیاتِ نظمِ فارسی (غالب) مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل: ۱۱۲:۲۔۔ نامہ ہائے فارسی غالب، ص ص ۶۵۔۶۶ اور ۲۰۸۔۲۰۹

※※※※※※※※※※

نصیر الدین حیدر

یہ غازی الدین حیدر کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ بادشاہ بیگم کے بطن سے ۲۲؍ جمادی الاول ۱۲۱۸ھ کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ غازی الدین حیدر کی وفات کے بعد نصیر الدین حیدر ۲۰؍ اکتوبر ۱۸۲۷ء کو پچیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوئے۔ اپنے باپ کی طرح ان کی بھی پوری زندگی محل اور دربار کی سازشوں کا مقابلہ کرتے ہوئے گزری۔ کہا جاتا ہے کہ غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر دونوں سمجھ دار تھے اور دونوں میں حکومت کرنے کی بھرپور صلاحیت تھی لیکن درباری سازشوں کے آگے مجبور تھے۔ حکیم محمد نجم الغنی خاں نے 'تذکرۂ خم خانۂ جاوید' کے حوالے سے لکھا ہے کہ نصیر الدین حیدر شاعر تھے، پادشاہ تخلص کرتے تھے اور اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کبھی کبھی شعر کہتے تھے۔ نصیر الدین حیدر کے چند اشعار ہیں:

یہ کس مست کے آنے کی آرزو ہے
کہ ساقی لیے ساغر مشک بو ہے
نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے
یہی دل کی حسرت، یہی آرزو ہے
گلستاں میں جاکر ہر اِک گل کو دیکھا
نہ تیری سی رنگت، نہ تیری سی بو ہے

نصیرالدین حیدر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اپنے باپ کی طرح بہت فیاض تھے اور فضول خرچ بھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انھیں بہت زیادہ غصہ آتا تھا۔ اُنھوں نے غصّے میں بعض لوگوں کو زندہ دفن کرادیا تھا اور بعض عورتوں کو دیواروں میں زندہ چنوادیا تھا۔ محل کے کچھ لوگوں نے انھیں زہر دے دیا تھا۔ ۸ر جولائی ۱۸۳۷ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔

ملاحظہ ہوں:

تاریخِ اودھ، جلد ۴، ص ص ۲۰۶۔۶۲۷۔۔ بزمِ غالب، ص ص ۸۱۔۸۲۔۔ خم خانۂ جاوید

مرزا نصراللہ بیگ خاں

یہ مرزا عبداللہ بیگ خاں کے چھوٹے بھائی اور غالبؔ کے چچا تھے۔ آگرے کے کماندار جنرل پیرون تھے اور صوبے کا انتظام نصراللہ بیگ خاں کے ذمے تھا۔ ان کی شادی والیِ فیروز پور جھرکہ جاگیردار لوہارو کی بہن سے ہوئی تھی۔ نصراللہ بیگ خاں مرہٹوں کی طرف سے آگرے کے قلعے دار تھے۔ لارڈ لیک نے آگرے کی طرف پیش قدمی کی تو نصراللہ بیگ نے ہتھیار ڈال دیے اور آگرہ لارڈ لیک کے حوالے کردیا۔ اس کے بدلے میں لارڈ لیک نے نصراللہ بیگ خاں کو آگرے کا قلعے دار مقرر کردیا۔

۲۱ر ستمبر ۱۸۰۵ء کو لارڈ لیک نے سونک اور سونسا نام کے دو پرگنے نصراللہ بیگ کو تاحینِ حیات مرحمت کیے۔ اس کے دس گیارہ مہینے بعد یعنی ۱۸۰۶ء میں نصراللہ بیگ ہاتھی سے گر پڑے ایک ٹانگ ٹوٹ گئی۔ اُن کے بہت زخم آئے۔ کچھ ہی دن میں اُن کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت غالب کی عمر تقریباً نو سال تھی۔ انگریزوں نے سونک اور سونسا کے پرگنے واپس لے لیے اور پسماندگان کے لیے پانچ ہزار روپے سالانہ اور بقول غالبؔ دس ہزار روپے سالانہ مقرر کردیے۔

ملاحظہ ہوں:

بزمِ غالبؔ، ص ص ۳۸۷۔۳۸۸۔ ذکرِ غالب، ص ۲۸۔ آج کل فروری ۱۹۶۳ء۔ احوالِ غالب، ص ۲۸

مولوی ولایت حسن

ان کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہے کہ یہاں کلکتے کے قاضی سراج الدین کی بیگم کے بھانجے تھے۔ غالبؔ نواب محمد علی خاں کا خط لے کر بیگم صاحبہ کے پاس گئے تھے۔ بیگم صاحبہ نے خط پڑھ کر غالبؔ کو بتایا کہ مولوی ولایت حسن میرا بھانجا ہے۔ وہ اس وقت کلکتے میں موجود نہیں ہے۔ جب وہ واپس آئے گا تو آپ کے قیام کے لیے اسی گھر میں انتظام کردے گا لیکن غالبؔ نے جو مکان کرائے پر لیا تھا اسی میں مقیم رہے۔

کلکتے میں غالبؔ کی ان سے کئی بار ملاقات ہوئی۔ یہ اکثر دورے پر رہتے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً سرکاری ملازم تھے۔

اشاریہ

اشخاص

مقامات

کتابیں اور رسالے

☆☆☆

کتابیات

۱- احوالِ غالب، مرتبہ مختار الدین احمد، دہلی، ۱۹۸۶ء
۲- اخبار الصنادید (جلد دوم)، حکیم نجم الغنی نجمی رام پوری، رام پور، ۱۹۹۷ء
۳- اردو صحافت کی تاریخ، نادر علی خاں، علی گڑھ، ۱۹۸۷ء
۴- جام، جہاں نما، اردو صحافت کی ابتدا، گربچن سنگھ، نئی دہلی ۱۹۹۲ء
۵- اردوے معلیٰ، غالب، جلد اوّل، حصہ اوّل، مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل، لاہور، ۱۹۶۹ء
۶- اردوے معلیٰ، غالب، حصہ اوّل، جلد دوم، سید مرتضیٰ حسین فاضل، لاہور، ۱۹۶۹ء
۷- اردوے معلیٰ، غالب، حصہ دوم، سید مرتضیٰ حسین فاضل، لاہور، ۱۹۶۹ء
۸- افاداتِ غالب، غالب، مرتبہ وزیر الحسن عابدی، لاہور، ۱۹۶۹ء
۹- انتخابِ یادگار، امیر مینائی، رام پور، ۱۲۹۷ھ
۱۰- اوراقِ معنی، غالب، ترجمہ پنج آہنگ، مترجم ڈاکٹر تنویر احمد علوی، دہلی ۱۹۹۲ء
۱۱- باغِ دو در مرتبہ و مترجمہ وزیر الحسن عابدی، لاہور، ۱۹۶۱ء اردو ترجمہ
۱۲- باندہ اور غالب، صالحہ بیگم قریشی، باندہ ۱۹۹۴ء
۱۳- بزم داغ، رفیق مارہروی، لکھنؤ، ۱۹۵۶ء
۱۴- بزمِ غالب، عبدالرؤف عروج، کراچی، ۱۹۶۹ء
۱۵- بیدل، شاعرِ زمانہ ہا، دکتر اسداللہ حبیب، کابل، ۱۳۶۳ھ
۱۶- پنج آہنگ، غالب، دہلی، ۱۸۵۳ء
۱۷- پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ بروسی ڈنگر، نمبر ۴۶، ۲ رمئی ۱۸۲۸ء۔ بحوالہ، ماہانہ افکار، کراچی، مالک رام
۱۸- تذکرہ خم خانہ جاوید، لالہ سری رام، دہلی، ۱۹۱۱ء
۱۹- تذکرہ خوش معرکہ زیبا، سعادت خاں ناصر، مرتبہ مشفق خواجہ، لاہور، ۱۹۷۰ء
۲۰- تذکرہ سراپا سخن، محسن علی موسوی، (تلخیص) سید سلیمان حسین، لکھنؤ، سنہ طباعت ندارد
۲۱- تذکرہ شعراے اردو، میر حسن، مرتبہ محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی
۲۲- تذکرۂ کاملانِ رام پور، احمد علی خاں شوق، پٹنہ، ۱۹۸۶ء

۲۳-تذکرہ ماہ و سال، مالک رام، دہلی ۱۹۹۱ء
۲۴-تذکرہ مسرت افزا، ابوالحسن امیر الدین (امر اللہ الٰہ آبادی)، مترجمہ ڈاکٹر مجیب قریشی، دہلی ۱۹۶۸ء
۲۵-تذکرہ نصر آبادی، طہران، مہر ماہ ہزار و سی صد و ہندہ
۲۶-تیغ تیز مشمولہ افاداتِ غالب، مرتبہ سید وزیر الحسن عابدی، لاہور، سنہ اشاعت ندارد
۲۷-جام جہاں نما، اردو صحافت کی ابتدا، گربچن سنگھ، نئی دہلی ۱۹۹۲ء
۲۸-جہانِ غالب، قاضی عبدالودود، پٹنہ، ۱۹۹۵ء
۲۹-خزانہ عامرہ، میر غلام علی آزاد بلگرامی، کانپور، ۱۸۷۱ء
۳۰-دریاے لطافت، انشاء اللہ خاں انشا، مترجمہ پنڈت دتاتریہ کیفی، اورنگ آباد، دکن، ۱۹۳۵ء
۳۱-دیوانِ غالب، غالب، نسخۂ حمیدیہ، لاہور ۱۹۸۳ء
۳۲-ذکر غالب، مالک رام، دہلی، ۱۹۷۶ء
۳۳-رسالہ عبدالواسع ہانسوی، عبدالواسع ہانسوی، کانپور، ۱۲۸۰ھ
۳۴-سخن شعرا، عبدالغفور نساخ، لکھنؤ، ۱۲۹۱ھ
۳۵-سیر المتاخرین، غلام حسین طباطبائی، جلد اوّل، لکھنؤ، ۱۸۹۷ء
۳۶-شام غریباں، لچھمی نرائن شفیق، مرتبہ اکبر الدین صدیقی، کراچی، ۱۹۷۷ء
۳۷-شمع انجمن، صدیق حسن خاں، بھوپال، ۱۲۹۳ھ
۳۸-صبح گلشن، محمد صدیق حسن خاں، بھوپال، ۱۲۹۵ھ
۳۹-عقد ثریا، غلام ہمدانی مصحفی، مرتبہ مولوی عبدالحق، اورنگ آباد ۱۹۳۴ء
۴۰-علم و عمل، عبدالقادر رام پوری، کراچی، ص ۱۴۴
۴۱-عمدۂ منتخبہ (تذکرہ سرور)، میر محمد خاں بہادر سرور، دہلی ۱۹۶۱ء
۴۲-غالب، غلام رسول مہر، لاہور، ۱۹۴۶ء
۴۳-غالب اور اُن کے معترضین، سید لطف الرحمٰن، کلکتہ، ۱۹۷۰ء
۴۴-غالب اور شاہانِ تیموریہ، خلیق انجم، دہلی ۱۹۷۴ء
۴۵-غالب اور عصر غالب، محمد ایوب قادری، کراچی ۱۹۸۲ء
۴۶-غالب بہ حیثیت محقق، قاضی عبدالودود، پٹنہ، ۱۹۹۵ء

رسالے

۴۷-غالب بہ حیثیتِ محقق، قاضی عبدالودود، مشمولہ نقدِ غالب مرتبہ ڈاکٹر مختارالدین احمد، علی گڑھ، ۱۹۵۶ء

۴۸-غالب، غلام رسول مہر، لاہور، ۱۹۴۶ء

۴۹-غالب کے بارے میں، قاضی عبدالودود، حصہ ۲، پٹنہ، ۱۹۹۵ء

۵۰-غالب، کلیاتِ فارسی غالب، مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، جلد دوم لاہور ۱۹۶۷ء

۵۱-غالب کے خطوط (جلد اوّل) غالب مرتبہ خلیق انجم، دہلی ۱۹۸۳ء

۵۲-غالب کے خطوط (جلد دوم) غالب، مرتبہ خلیق انجم، دہلی ۱۹۸۵ء

۵۳-غالب کے خطوط (جلد سوم) غالب مرتبہ خلیق انجم، دہلی ۱۹۸۷ء

۵۴-غالب کے خطوط (جلد چہارم) غالب دہلی، ۱۹۹۳ء

۵۵-غدر کے صبح وشام، خواجہ حسن نظامی، دہلی، ۱۹۲۶ء

۵۶-غیاث اللغات، مرتبہ منصور ثروت، ایران

۵۷-غیاث اللغات و منتخب اللغات، غیاث الدین عزت، لکھنؤ ۱۹۴۰ء

۵۸-غیاث اللغات و منتخب اللغات، غیاث الدین عزت، لکھنؤ ۱۹۳۷ء

۵۹-فسانۂ غالب، مالک رام، نئی دہلی، ۱۹۷۱ء

۶۰-فیضِ بیدل، ڈاکٹر عبدالمغنی، لاہور ۱۹۸۲ء

۶۱-قاطع برہان (غالب) مشمولہ قاطعِ برہان ورسائلِ متعلقہ، مرتبہ قاضی عبدالودود، پٹنہ ۱۹۶۷ء

۶۲-قتیل اور غالب، حکیم ابوالعلا ناطق، مشمولہ زمانے کی غالبیات، پٹنہ، ۱۹۹۴ء

۶۳-قتیل کا وطن، سید اسد علی انوری، مشمولہ ماہنامہ نگار لکھنؤ، مئی ۱۹۴۲ء

۶۴-قتیل کا وطن، سید ہاشمی فرید آبادی، مشمولہ، سہ ماہی اردو، دہلی ۱۹۴۵ء

۶۵-کچھ غالب کے بارے میں، قاضی عبدالودود، پٹنہ، ۱۹۹۵ء

۶۶-کلماتِ الشعرا، محمد افضل سرخوش، لاہور، ۱۹۴۲ء

۶۷-گل رعنا، غالب، مرتبہ سید قدرت نقوی، کراچی

۶۸-گل رعنا، غالب، مرتبہ مالک رام، دہلی، ۱۹۷۰ء

۶۹-گلزارِ ابراہیم، علی ابراہیم خاں، مرتبہ علامہ شبلی، لاہور، ۱۹۰۶ء

۷۰-لطائفِ غیبی، مشمولہ افاداتِ غالب، مرتبہ سید وزیر الحسن عابدی، لاہور، ۱۹۶۹ء
۷۱-مآثرِ غالب، قاضی عبدالودود، ترتیب ڈاکٹر حنیف نقوی، پٹنہ، ۱۹۹۵ء
۷۲-متفرقاتِ غالب، مسعود حسن رضوی ادیب، طبع اوّل، رام پور، ۱۹۴۷ء
۷۳-متفرقاتِ غالب، پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب، طبع دوم، لکھنؤ ۱۹۶۹ء
۷۴-مجمع النفائس، خان آرزو، مشمولہ خدا بخش لائبریری جرنل، تیسرا شمارہ، ۱۹۷۷ء
۷۵-مکاتیبِ غالب، غالب، مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی، رام پور، ۱۹۴۹ء
۷۶-مکاتیبِ غالب، اسد اللہ غالب، مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی، رام پور، ۱۹۴۹ء
۷۷-نسخۂ عرشی زادہ، غالب، مرتبہ اکبر علی خاں، رام پور
۷۸-نقشِ آزاد، مولانا ابوالکلام آزاد، مرتبہ مولانا غلام رسول مہر، لاہور، سنہ اشاعت ندارد
۷۹-نوادر الالفاظ، خان آرزو، مرتبہ ڈاکٹر سید عبداللہ، کراچی ۱۹۵۱ء
۸۰-نہج الادب، نجم الغنی، بحوالہ غالب اور عصر غالب
۸۱-واقعاتِ دارالحکومت، بشیر الدین احمد، جلد: ۲، آگرہ، ۱۹۱۹ء
۸۲-یادگارِ غالب، حالی، نئی دہلی، ۱۹۶۶ء

82- Handbook of Calcutta:Historical and DESCRIPTIVE, Calcutta,1892

۸۳-ریاض العارفین، رضا قلی خاں ہدایت، (مطبع زہرہ ۱۳۴۴-۱۹۶۶ء میلادی) بحوالہ بیدل-شاعرِ زمانہ ہا

رسالے

۸۴-سہ ماہی غالب نامہ، متفرقاتِ غالب، ڈاکٹر حنیف نقوی، مشمولہ سہ ماہی غالب نامہ، جنوری ۱۹۹۷ء
۸۵-ماہانہ افکار کراچی، غالب نمبر
۸۶-ماہانہ نگار، (مصحفی نمبر) جنوری ۱۹۳۹ء
۸۷-ماہانہ افکار کراچی، غالب نمبر
۸۸-سہ ماہی اردو، اورنگ آباد، ۱۹۲۲ء
۸۹-سہ ماہی تحریر، سفیرِ ہرات، سید اکبر علی ترمذی، مشمولہ سہ ماہی تحریر (دہلی، جلد ۶) شمارہ ۱-۲-۱۹۷۲ء
۹۰-سہ ماہی اردو اورنگ آباد، اپریل ۱۹۳۱ء

۹۱- سہ ماہی اردو ادب، غالب کا ایک غیر مطبوعہ فارسی مکتوب، از ڈاکٹر مختار الدین احمد (علی گڑھ۔ جولائی تا دسمبر ۱۹۵۲ء)
۹۲- سہ ماہی اردو مجموعہ دہلی اور غالب مشمولہ سہ ماہی اردو (غالب نمبر) کراچی ۱۹۶۱ء
۹۳- سہ ماہی اردو اورنگ آباد، اپریل ۱۹۳۱ء
۹۴- سہ ماہی اردو، اورنگ آباد، ۱۹۲۲ء
۹۵- سہ ماہی تحریر، غالب اور بندیل کھنڈ محمد مشتاق شارق، مشمولہ سہ ماہی تحریر، (دہلی، اپریل، جون ۱۹۷۷ء
۹۶- غالب کا نسب نامہ، خواجہ قمر الدین خاں راقم، مشمولہ اردو سہ ماہی، اورنگ آباد، جنوری ۱۹۲۲ء ص ۳۷۳
۹۷- غالب کی راست گفتار، قاضی عبدالودود، مشمولہ علی گڑھ میگزین، (غالب نمبر) علی گڑھ میگزین، ۱۹۴۸ء
۹۸- غالب کے خود نوشت حالات، اظہار الحق ملک مشمولہ احوالِ غالب، مرتبہ پروفیسر مختار الدین احمد، دہلی، ۱۹۸۶ء
۹۹- تحقیق ۳۳ فارسی مکاتیب الخ (غالب) مرتبہ پرتو روہیلہ مشمولہ، تحقیق نامہ، لاہور ۱۹۹۷ء
۱۰۰- نقوش، غالب کی راست گفتاری، مالک رام، مشمولہ نقوش، لاہور، ۱۹۶۳ء
۱۰۱- قتیل دہلوی تھا یا فرید آبادی، مختار الدین احمد، مشمولہ نقوش، لاہور (ادب عالیہ نمبر) اپریل ۱۹۶۰ء
۱۰۲- نقوش، لاہور، غالب نمبر حصہ دوم

مَیں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہُوں